سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو)

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
مقالہ نگار: عادل سعید قریشی

رول نمبر: ۴۳۶۴۰

ڈگری پروگرام: پی ایچ ڈی اردو

نگران: ڈاکٹر نذر عابد

معاون نگران: ڈاکٹر الطاف یوسفزئی

شعبۂ اُردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

۲۰۲۰ء

شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

ڈاکٹر نذر عابد
صدر شعبۂ اردو
ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ
nazarabid 63@gmail.com

تاریخ:______________

حوالہ: ______________

تصدیق کی جاتی ہے کہ عادل سعید قریشی نے پی ایچ ڈی اردو کی سند کے حصول کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ مقالہ میری نگاہ میں ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کے مقرر کردہ قواعد ضوابط کے عین مطابق ہے۔ میں اس کام سے مطمئن ہوں اور حصولِ سند کے لیے اگلے مراحل میں پیش کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر نذر عابد
صدر شعبۂ اردو
ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Author's Declaration

I **Adil Saeed Qureshi** hereby state that my PhD thesis title

is my own work and has not "سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

been submitted previously by me for taking any degree from **Hazara University, Mansehra o**r anywhere else in the country/world.

At any time if my statement is found to be incorrect even after my Graduate the university has the right to withdraw my PhD degree.

Name : Adil Saeed Qureshi

Supervisor : Dr.Nazar Abid

Dated:

Plagiarism Undertaking

I solemnly declare that research work presented in the thesis titled

"سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" is solely my research work with no significant contribution from any other person. Small contribution/help wherever taken has been duly acknowledged and that complete thesis has been written by me.

In understand the zero tolerance policy of the HEC and Hazara University, Mansehra towards plagiarism. Therefore I as an Author of the above titled thesis declare that no portion of my thesis has been plagiarized and any material used as reference is properly referred/cited.

I undertake that if I am found guilty of any formal plagiarism in the above titled thesis even after award of PhD degree, the university reserves the rights to withdraw/revoke my PhD degree and that HEC and the University has the right to publish my name on the HEC/University Website on which names of students are placed who submitted plagiarized thesis.

Student/Author Signature: ____________

Name: Adil Saeed Qureshi

اجمالی فہرست

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی

فہرست

موضوع کا تعارف Introduction

سید عبد اللہ ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے۔ وہ اردو کے حوالے سے "بابائے اردو ثانی" کہلائے۔ سید عبد اللہ نے ساری زندگی درس و تدریس کے ساتھ اردو زبان کی ترویج اور اشاعت کے لیے وقف لیے رکھی۔ وہ علمی ادبی حلقوں کی مقبول ،معروف اور ایک غیر متنازعہ شخصیت تھے۔ علم و ادب کے ساتھ ان کے سماجی افکار و نظریات بھی ان کے نثری سرمائے میں ملتے ہیں جن میں انھوں نے اپنی قوم اور پاکستان کے لیے خاص طور پر سوچ و بچار کیا ہے اور اس نوزائیدہ مملکت کے مستقبل کے لیے کام کیا اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک مذہبی فکر رکھنے والے دانش ور کی حیثیت سے پاکستان کو اسلامی ریاست کے اس رنگ میں دیکھنے کے آرزومند تھے جیسے علامہ اور قائد اعظم نے دیکھا۔

سید عبد اللہ کی تصانیف اس بات پر شاہد ہیں کہ ان کا فکری رجحان اسلام اور پاکستان کی طرف ہے۔ اسی فرضیہ کے تحت اس مقالے میں ان کے فکری اثاثے کی جانچ اور پرکھ کی گئی۔ ان کے افکار اور تصورات کو معروضی انداز میں پرکھا گیا اور جدید تحقیقی و تنقیدی خطوط کی روشنی میں نتائج مرتب کیے گئے۔ سید صاحب کے ہاں اسلام اور پاکستان دو الگ حوالوں سے نہیں بلکہ یہ دو ایک ساتھ اور ایک ہی پس منظر میں سامنے آنے والے دو عناصر ہیں جو باہم ایک دوسرے میں پیوست ہیں، سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کو دو الگ ابواب میں مطالعہ میں لایا گیا۔ سید عبد اللہ کے ہاں اسلامی فکری عناصر اور پاکستانی عناصر کے حوالے سے ان کی یہ تصانیف مثلاً کلچر کا مسئلہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ادب و فن، مباحث، سید عبد اللہ کے تعلیمی خطبات، مطالعہ اقبال کے نئے رخ، مقامات اقبال اور مسائل اقبال زیر مطالعہ آئیں۔

باب اول میں سید عبد اللہ کے مختصر سوانح لکھی گئی، اس باب میں ان کا خاندانی پس منظر، پیدائش، تعلیم و تربیت، ملازمت، ازدواجی زندگی، علمی و ادبی سفر، غیر منصبی سرگرمیاں، عادات و خصائل، بحیثیت استاد، پروفیسر ایمریطس، علم و ادبی مجالس کی رکنیت اور سرپرستی، وفات اعزازات کو قلم بند کیا گیا۔ سید عبد اللہ نے لائبریری کی فہرست سازی سے کام شروع اور پھر وہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہوئے۔ ان مختلف سرخیوں میں ان کے شاگردوں اور ساتھی رفقا کی ان کے بارے میں آرا بھی شامل ہیں۔

باب دوم کو دو فصلں میں تقسیم کیا گیا اور اسلامی اور پاکستانی عناصر کی علیحدہ علیحدہ حدود کا تعین کیا گیا۔ ان ہی کی بنیاد پر آنے والے ابواب میں سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں پائے جانے والے اسلامی اور پاکستانی عناصر کو زیر بحث

لایا گیا۔ فصل اول میں اسلامی عناصر میں ان تمام عناصر کو شامل کیا گیا جن میں اسلامی تعلیمات سے سید عبداللہ نے براہ راست استفادہ کیا تھا اور ان سماجی موضوعات کو بھی کہ جن کا تعلق براہ راست اسلامی احکامات اور قوانین سے تھا۔ سید عبداللہ کے ہاں یہ نظریہ ملتا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے وہ ایک مسلمان کی زندگی کا انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام معاملات اور اختلاط و ارتباط انسانی کے ہر زاویہ پر روشنی ڈالتا ہے اور رہنمائی کے اصول بھی مہیا کرتا ہے ۔ اسلامی اصول اور قواعد کا مقصد حقیقی ایک پر امن، خوشحال دوستانہ و مربیانہ معاشرہ اور ایک عدل و انصاف اور مساوات سے مزین مملکت کا قیام ہے۔ اسی مقصد کے لیے وہ اسلام کے تصور زندگی، اسلامی اقدار و روایات کے فروغ، اتحاد عالم اسلام، اسلام میں تصور عورت، اسلامی نظام تعلیم اور اسلامی معاشی نظام کے علاوہ اسلامی تصوف اور اقبال کے انقلابی افکار سے استفادہ کرتے ہیں تفہیم کی نئی راہیں وا کرتے ہیں۔

فصل دوم میں پاکستانی عناصر کا تعین کیا گیا۔ پاکستانی عناصر سے مراد وہ نثری مراد ہے وہ عناصر ہیں جو پاکستان اور اہل پاکستان سے متعلق ہو پاکستان کی تاریخی، معاشرتی، سماجی اور معاشی حوالے سے سید عبداللہ نے اپنی کتب میں قلم بند کیا ہے۔ وہ دو قومی نظریہ کو پاکستان کی اساس قرار دیتے ہیں اور اسی نظریہ کی عملی صورت کو وہ پاکستان کہتے ہیں۔ سید عبداللہ نے پاکستان کو علامہ اقبال اور قائد اعظم کے ہی حوالے دیکھا اور سوچا ہے۔ وہ پاکستان کو ایک مضبوط اور طاقت ور مملکت کی صورت میں دیکھتے ہی اور ان کا ماننا یہ ہے کہ پاکستان ہی وہ ملک ہے جو تمام ملت اسلامیہ کا رہبر بن سکتا ہے۔ وہ پاکستان کے حوالے ایک بین الاقوامی اتحاد کی بھی تجویز یتے ہیں۔ سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے چند عناصر یہ ہیں دو قومی نظریہ، پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر، قومی زبان اردو، پاکستانیت، پاکستانی قومیت، افکار قائد، فنون لطیفہ، شامل ہیں۔ غرض اس باب میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کا ایک اجمالی تعارف اور جامع عناصر کی مبادیات طے کی گئیں۔

تیسرے باب میں پھر طے شدہ موضوعات کو مفصل انداز میں زیر مطالعہ لایا گیا اور سید عبداللہ کی نثری سرمائے سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام عنوانات کو تحقیق اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور مباحث کے نتائج حاصل کیے گئے۔ اس باب میں جن عنوانات کو چنا گیا ان میں عقائد اسلام، اسلام کا تصور زندگی، اسلامی اقدار و روایات کا فروغ، اسلامی تصوف، اتحاد عالم اسلام، فکر اقبال میں اسلامی عناصر، اسلام کا تصور عورت، اسلامی نظام تعلیم، اسلام کا معاشی نظام وغیرہ۔ ''سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی عناصر'' کے تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ سید عبداللہ ایک سچے اور باعلم مسلمان

ہیں۔ان کا مزاج اور مذاق دونوں کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات نے خاص کردار ادا کیا ہے۔وہ اسلام کو صرف مذہب نہیں، دین سمجھتے ہیں۔دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہوتا ہے سو سید عبد اللہ اپنی زندگی میں تو دین برحق سے اصلاح اور رہبری لیتے رہے ہیں اسی طرح انھوں نے معاشی، معاشرتی، سماجی اور عمرانی مسائل اور معاملات میں بھی قرآن و حدیث ہی کو اصل ماخذ علم جانا ہے۔ان کے تمام خیالات اور نظریات کی اساس خالص دینی ہے اور وہ ہر معاملے میں قرآن وحدیث سے رجوع کرتے ہیں۔ان تصورات اور افکار سے ان کی اسلامی فکر اور دین کی سنجیدہ فہم مترشح ہوتی ہے ۔وہ ہر خیال، فکر، سوچ، منصوبہ، مشورہ، تدبیر، عمل و فعل کے لیے اسلام سے فتویٰ یا حکم لیتے ہیں۔ان کے نزدیک فرد کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اسلام کے ضوابط پر عمل پیرا ہو۔

چوتھے باب میں سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں پائے جانے والے پاکستانی عناصر کو معروضی انداز میں جانچا گیا ہے۔ان عناصر میں دو قومی نظریہ کی توضیح و تشریح کو اولیت حاصل ہے اور اس نظریہ کے پس منظر اور پیش منظر کو تفصیل سے بحث میں لایا گیا اور ان تمام عوامل کا مطالعہ کیا گیا کہ جن کی وجہ سے اس دو قومی نظریے نے بھارت ماتا کو دو لخت ہوئی۔ دو قومی نظریے کی اہمیت و افادیت اور مشاہیر اسلام کی نظر میں کیا وقعت رہی ہے،اسی طرح کے ہمہ جہت مباحث کو برتا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کو زیر بحث لایا گیا،ان عناصر میں پہلے ثقافت کی اصطلاح کی تعریف کا تعین کیا گیا اور پھر ثقافت اور مذہب کا رشتہ،فلسفہ تطہیر زندگی،نظام اخلاقیات، مذہبی رواداری،رسوم و رواجات،اعتدال پسندی اور میانہ روی، مشاورت اور آزادی رائے، مجلسی زندگی،نظام سیاست،زبان، آداب معاشرت،فنون لطیفہ،ہندی اثرات جیسے چند عناصر کو موضوع بحث بنایا گیا۔اس کے علاوہ سید عبد اللہ کی نثر میں ملنے والے دیگر عناصر جن میں قومی زبان اردو کو چنا اور اس زبان کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ اس زبان کی پاکستانی حوالہ کو زیر بحث لایا گیا کہ اردو پاکستانی عناصر میں سب سے جاندار اور کلیدی عنصر ہے۔ایک طرف یہ اسلامی ثقافت کی دین ہے اور دوسرا سب سے بڑا حوالہ اس کا پاکستان کی قومی زبان کا ہے۔اس کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح سے سید عبد اللہ کا ایک فکری اور نظریاتی استفادہ ہے۔سید عبد اللہ کے ہاں حضرت قائد کے لیے صرف عقیدت اور احترام نہیں بلکہ سید عبد اللہ قائد اعظم کو ایک حقیقی رہنما جانتے ہیں اور ان کے فرامین اور ارشادات کو اپنے بیانیوں کے لیے دلیل بناتے ہیں اور ان کے ہاں قائد اعظم کا مقام ایک روحانی والد اور سے رہبر کا ہے اور وہ پاکستان کو قائد اعظم کی تقاریر کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔سید عبد اللہ کا نظریہ قومیت بھی پاکستانی عناصر میں خاص اہمیت رکھتا ہے جہاں سید عبد اللہ نے پاکستانیت قومیت سے وابستہ ابہامات کو دور کر کے ایک واضح قومیت کا تصور دیتے ہیں اور اس نظریہ کی سیاسی اور

ثقافتی ضرورت کو اجاگر کرتے ہیں۔اس طرح پاکستانیت کی ایک جدید اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔ان کے ہاں یہ اصطلاح ادب کے حوالے سے آتی ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس میں پاکستان کی پہچان اور شاخت کو ملحوظ رکھا جائے۔پاکستانیت سے مراد ایسا حوالہ ادب میں برتنا ہے کہ جس سے ادب ہر دوسرے حوالہ سے مستغنی ہو جائے اور وہ ادب یا زندگی کا ہر حوالہ پاکستانی ہو جائے۔ان کے نزدیک پاکستانیت کے سیدے سادھے معنی یہ کہ ادب میں وہ قومی روح منعکس کی جائے جو نظریہ پاکستان میں موجود ہے۔اس طرح نظریہ بازیافت میں وہ یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ گو مسلمانوں نے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے ہندوستان سے ہم ایک نفرت اور دشمنی والا رویہ رکھیں بلکہ ہمیں انسان دوستی،وسیع المشربی اور رواداری والا رویہ رکھا جائے جس کی مثال ہمیں اولیائے کرام کے ہاں ملتی ہے اور یوں سارے ہندوستان سے ایک حب اور لحاظ کا رویے برتا جائے اور ان کی عوام کے دل جیتنے کی سعی کی جائے۔سید عبداللہ کے نچر میں ان کا نظریہ آزادی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کو پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی وجہ تسلیم کرتے ہیں اور نظریہ پاکستان کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو ایک ایسا وطن چاہیے تھا جہاں وہ آزادانہ اسلام شعار کو اپنا کر اپنی زندگی گزاریں جہاں اقتدار اعلیٰ صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہو۔چودہ اگست کے بعد ان کا خیال ہے کہ اب اس آزادی کو ان خطوط پر استوار رکھا جائے جن کی نشان دہی حضرت قائد اور علامہ اقبال فرما گئے ہیں۔وہ اس پاکستانی کی آزادی میں چار عوامل کو لازمی قرار دیتے ہیں اول دو قومی نظریہ پر کامل ایمان،دوم اسلامی قومیت سوم پاکستانی ثقافت کی ترویج اور چہارم اردو زبان۔ان کے نزدیک یہی چار عناصر تخلیق پاکستان کے محرک تھے اور یہی تکمیل پاکستان یعنی آزادی پاکستان کی بقا کے ضامن ہیں۔سید عبداللہ کی نثر میں پاکستانی عناصر کے مطالعہ میں اس نتیجے پر پہنچے کہ سید عبداللہ ا ایک سچے محب وطن ہیں اور ان کے ہاں پائے جانے والے پاکستانی عناصر پاکستان کے روشن اور مضبوط مستقبل اور ایک ایک عظیم اور متحد پاکستانی قوم کا خواب کو سچ کیا جا سکتا ہے۔

مقالہ ہذا کا پانچواں باب حاصل تحقیق ہے جس میں سید عبداللہ کے ہاں پائے جانے والے اسلامی اور پاکستانی عناصر کو خلاصے کے طور پر درج کیا گیا ہے اور دریافت کردہ نظریات اور افکار سے یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ سید عبداللہ اسلام اور پاکستان کو ایک کل میں دیکھتے ہیں۔

اور یہ بھی ان عناصر کو خود سید صاحب نے کن مقاصر کے حصول کے لیے اپنی نثر میں برتا ہے اور وہ ان عناصر سے کون کون سے مقاصد کا حصول چاہتے تھے۔سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے یہ اسلامی اور پاکستانی عناصر باہم ایک

معنوی اور نامیاتی ترکیب سے ملتے ہیں جو اس معتبر معاشرت مصلح اور محب وطن کے افکار سے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے خواب کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

فرضیہ (Hypothesis)

سید عبداللہ کا نثری سرمایہ اسلامی طرزِ فکر اور پاکستانی عناصر کا حامل ہے اور یہ عناصر پاکستانی تشخص ،مثالی اور فلاحی معاشرے کے قیام میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔

تحقیقی سوالات (Research Questions)

۱۔ کیا سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی عناصر پائے جاتے ہیں؟

۲۔ کیا پاکستانی عناصر بھی سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں موجود ہیں؟

۳۔ کیا یہ اسلامی اور پاکستانی عناصر، پاکستانی تشخص میں فرد کے مددگار ہو سکتے ہیں؟

۴۔ کیا یہ اسلامی اور پاکستانی عناصر، پاکستان میں ایک مثالی اور فلاحی معاشرے کے قیام میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں؟

اہداف تحقیق (Objectives)

اس تحقیقی مقالے کے اہم اہداف درج ذیل ہیں:

۱۔ سید عبداللہ کے سوانح قلم بند کرنا۔

۲۔ سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے اسلامی اور پاکستانی عناصر کی حدودو کا تعین کرنا اور اصطلاحات کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی عناصر کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ کرنا۔

۴۔ سید عبداللہ کی نثر میں پاکستانی عناصر کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کرنا۔

۵۔ اسلامی اور پاکستانی عناصر کی عملی صورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستانی شناخت میں ان کے عمل دخل کا مطالعہ کرنا۔

۶۔ سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے اسلامی اور پاکستانی عناصر کی فکری قدر و منزلت کا تعین کرنا۔

طریق تحقیق (Research Methodology)

تحقیقی مقالہ "سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر "(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) کی تحریر اور تکمیل ہائیر ایجو کیشن کمیشن اور ہزارہ یونیورسٹی کے طے شدہ اصول ضوابط کے مطابق کیا گیا۔ مقالے کے معیار کو سندی تحقیق کے تقاضوں اور لوازمات سے ہم آہنگ کیا گیا۔ اس تحقیقی مقالے کا طریق تحقیق یوں اپنایا گیا کہ سید عبد اللہ کے تمام مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی اور نثری مواد اور دیگر معاون کتب کی جمع آوری کے لیے سرکاری، نجی اور ذاتی کتب خانوں، انٹرنیٹ، ڈجٹیل لائبریریوں اور جدید وسائل سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے سید عبد اللہ کی نثر کو اسلامی اور پاکستانی عناصر کے حوالے پر کھا اور جانچا گیا ہے۔ مقالے کے لیے ضروری حقائق اور معلومات کو معتبر ذرائع سے حاصل کیا گیا اور اس مطالعے کے دوران سائنسی، علمی، تحقیقی اور تنقیدی و عمرانی اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، حاصل شدہ معلومات اور نتائج کو منطقی، استدلالی اور معروضی انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔

پس منظری مطالعہ (Literature Review)

سید عبد اللہ اپنے عہد کے ایک عبقری ہیں۔ ان کی شناخت کے کئی حوالے ہیں جن میں مدرس ،ناقد، محقق ،اور سماجی دانشور ہونا نہایت معروف ہیں۔ان کے نثری سرمائے میں اسلامی اور پاکستانی افکار اور نظریات خاصے وقیع اور وسیع ہیں جن کی وجہ سے اس تحقیقی مقالے میں ان کے انہی دو حوالوں کو چنا گیا ہے۔اس قبل سید عبد اللہ پر مختلف کام ہوئے ہیں جن میں:

الف۔ ۱۹۹۵ء پروفیسر نسیم اختر نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "ڈاکٹر سید عبد اللہ ۔احوال و آثار" لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔

ب۔ ۱۹۹۴ء میں زاہدہ صادق نے گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج نمبر ۱ میں ایم اے کی ڈگری کے لیے "سید عبد اللہ بحیثیت محقق و نقاد" کے عنوان پر مقالہ لکھا۔

ج۔ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے "ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات"،"طیف غزل" اور "طیف اقبال" کہ جو سید عبد اللہ کی لیکچرز کے مجموعے ہیں مرتب کیے۔

د۔ پروفیسر صادق زاہد نے ایک کتاب تالیف کی جس کا عنوان "ڈاکٹر سید عبد اللہ بحیثیت محقق و نقاد" لکھی ہے۔

مذکورہ بالا کتب کا راقم نے اپنے تحقیق کے دوران تفصیلی مطالعہ کیا اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔ان کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد کی کتب،رسائل اور مجلات مد دلی اور اپنے فرضیہ پر کام کیا اور تحقیقی و تنقیدی نتائج مرتب کیے ہیں۔

تلخیص (Summary)

سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر، اس مقالے کا موضوع تھا اور اس موضوع میں سید عبداللہ کے ہاں پائے جانے والے انہی دو عناصر کو موضوع بحث بنایا گیا۔ اس تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں اس پہلو کو بطور خاص پیش نظر رکھا گیا کہ ان عناصر کا مطالعہ پاک و ہند کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں کیا گیا ہے اور ان عناصر کے خوشگوار اثرات اور کردار کو معروضیت سے پرکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ کیوں پاکستان اور اسلام کا بندھن اتنا مضبوط اور اٹوٹ ہے نیز وہ کون کون سے ہندی اثرات ہیں جو اس ثقافت اور تمدن کی تشخص اور انفرادیت کو بقا اور سلامتی کے ضامن بن سکتے ہیں۔ اسلام اور پاکستان کے ایک ساتھ ہونے میں اہل پاکستان کو کیا فائدے ہیں اور الگ ہو جانے کی صورت میں کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل پر کیا اس علیحدگی سے کوئی اثر پڑے گا اور اگر پڑے گا تو کیا ہو گا۔

سید عبداللہ نے اس حوالے سے ایک طویل جہد کی ہے اور انھوں نے اس حوالے سے خوب سوچا اور مختلف مشاہیر اسلام سے فکری استفادہ بھی کیا۔ سید عبداللہ پاکستان کے وجود آنے کے دیگر اسباب کو بھی منطقی اور جائز مانتے ہیں لیکن اسلامی تشخص کی بقا سے کم اہم جانتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں اس وطن کو اسلام کا قلعہ اور اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ بنائیں جیسا کہ علامہ اقبال اور قائد اعظم نے اس مملکت کا منصب اور مقام سوچ رکھا تھا۔ اسلامی عناصر تو ہند کی سرزمین میں صدیوں سے موجود ہیں اور بعض تو ایسے عناصر ہیں کہ جن کی خوبو ہی ہندی ہو گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم مسلمان اپنی اگلی نسل کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیں اور اپنی روشن خیالی میں اپنا اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کھو دیں، اسی انفرادیت کی بقا کے لیے اسلامیان ہند دو قومی نظریہ پر ایمان لائے اور اپنی قومیت اور مہابھارت کی تقسیم کی مہم چلائی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے جس کا دین، تہذیب، ثقافت اور تاریخ الگ ہے اور وہ ایک الگ مملکت میں اپنے ضابطہ حیات سے جینا چاہتی ہے لہٰذا ایک الگ ملک جس کا نام پاکستان ہے معرض وجود میں آیا۔ اب اس مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی نظام حکومت اور معاشرت کو اختیار کرے جس کی تلاش میں پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ایسا جامع نظام نافذ کیا جائے کہ جس کے نتیجے میں ایک مکمل اسلامی ریاست صورت پذیر ہو اور ان اقدار اور روایات کو فروغ دیا جائے جو اسلامی اور پاکستانی صورت میں سامنے آئیں۔ اسلام کی حقانیت کی دلیل پاکستان ہے تو پاکستان کے وجود اور بقا کا راز اسلام ہے۔ یہی سید عبداللہ کا فلسفہ اور مشن ہے۔

دیباچہ

الحمد اللہ پی۔ایچ۔ڈی کا میرا یہ مقالہ بعنوان سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر، اپنی تکمیل کو پہنچا۔ جب پی۔ایچ۔ڈی کا کورس ورک ختم ہوا تو استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد سفیان صفی کی تجویز پر میں نے صدر شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی جناب ڈاکٹر نذر عابد صاحب کی رضامندی سے اس عنوان کا تحقیقی خاکہ تیار کیا اور اور صدر شعبہ کی خصوصی رہنمائی اور مشاورت سے اپنا یہ خاکہ جمع کرایا۔ اللہ کے فضل سے ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ نے میرے لیے اس موضوع کی باقاعدہ منظوری دے دی اور ڈاکٹر نذر عابد میرے نگران اور ڈاکٹر الطاف یوسف زئی معاون نگران مقرر ہوئے۔ میرے لیے یہ موضوع بالکل نیا اور اچھوتا تھا اور ان خطوط پر میں نے اس مرحلہ سے قبل کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن سید عبداللہ کے نثری سرمائے کی تلاش اور مطالعے کے دوران ہی میں اس حقیقت کو پا گیا کہ جن دوزاویوں سے یہ تحقیق مقصود ہے وہ وقت کی اشد ضرورت ہیں اور اس تحقیق کے نتائج اسلام اور پاکستان کے باہمی رشتے کو واضح اور مضبوط تر کریں گے۔ اس حاصل تحقیق سے کئی نئے حقائق اور جدید تقاضے بھی سامنے آئیں گے جو پاکستان اور اہل پاکستان کی فکری اساس کے تعین میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔

اس موضوع پر مواد کی جمع آوری اور سید عبداللہ کے نظریات کی بہترین تفہیم کے لیے میں نے مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کی ابتدائی تصورات کا مطالعہ شروع کیا اور میرے نگران اساتذہ نے بھرپور رہنمائی فرمائی۔ جس کے لیے میں اپنے شعبے کے اساتذہ کا بالعموم اور خصوصاً ڈاکٹر نذر عابد صاحب کا ممنون احسان ہوں کہ انھوں وقت بے وقت میرے لیے وقت نکالا اور میرا سارا مقالہ حرف بحرف پڑھا اور سرخ روشنائی سے اصلاح کی اور نرم لہجے میں سرزنش بھی کرتے رہے، ڈاکٹر نذر عابد صاحب کا شکریہ ادا کرنا کسی طور ممکن نہیں سوائے اس کے کہ ان کو نیک دعائیں دی جائیں کہ اللہ ان کو صحت و ایمان کے اعلیٰ درجوں پر فائز رکھے۔ آمین۔ میرے معاون نگران ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کی مشاورت اور رہنمائی بھی میرے ساتھ رہی۔ استاد مکرم ڈاکٹر محمد سفیان صفی کا بھی شکر گزار ہوں جو حقیقی معنوں میں میرے اس مقالے کے محرک ہیں اور میرے مشفق استاد بھی ہیں۔

کتابوں کی تلاش کہ جو ایک سکالر کے لیے سب سے کڑا مرحلہ ہوتا ہے اس میں اللہ کے فضل سے کافی مدد ملتی رہی اور اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، جناب پروفیسر بشیر احمد سوز، ڈاکٹر احسان الحق غازی کوٹ مانسہرہ، ڈاکٹر قاضی سلطان محمود، شعبہ پاک سٹڈیز ایبٹ آباد یونیورسٹی، پروفیسر احسان شعبہ پاک سٹڈیز گورنمنٹ کالج منڈیاں ایبٹ آباد، ڈاکٹر نوراللہ شعبہ، ایبٹ آباد پبلک سکول ایبٹ آباد، پروفیسر محمد فاروق شعبہ اردو اور ناصر داود ملک شعبہ پاک سٹڈیز، گورنمنٹ کالج حویلیاں اسی کالج کے لائبریرین قاری آصف، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج نمبرا کے لائبریرین محمد نواز، مفتی سعید عبداللہ مہتمم مدرسہ عثمانیہ دارالقران مانسہرہ، راجہ نور محمد نظامی (بھوئی گاڑ، ٹیکسلا)، پروفیسر فرزانہ اقبال شعبہ اردو گورنمنٹ کالج برائے خواتین منڈیاں ایبٹ آباد نے کتب کی فراہمی میں رہنمائی اور مشاورت بہم پہنچائی۔ ان تمام اصحاب کا میں دلی طور پر شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ میرے دوستوں میں پی۔ایچ،ڈی سکالر عابد علی، راشد سلیم خان، عامر حسن صدیقی، راجہ قدیر اقبال اور سید اعظم شاہ نے خصوصی تعاون کیا اور اس کے لیے وہ کسی بھی شکریے کے طالب نہیں لیکن میں سراپا سپاس ہوں۔ میرے ماموں جان جمیل الرحمٰن (کاکول) نے اس مقالے کو دقت نظر سے پڑھا اور املا کی اغلاط کی نشان دہی کی میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔سیدہ انعم علی اور محترمی جناب سید تصدق شاہ صاحب نے اس مقالے کے لیے میری جتنی مدد کی اور میرے سوالات کے لیے جس قدر زحمت اٹھائی اس کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، جب جب ان کو کسی پریشانی کا بتایا ان کے چہرے کی بشاشت نے حوصلہ افزائی کی، اللہ ان کو صحت، زندگی اور ایمان دے۔

میرے اس مقالے کا مکمل ہونا ایک خواب ہی ہوتا اگر میرے ابو جی میری ہمت نہ بندھاتے اور امی جو میرے لیے دعاؤں کا منبع ہیں کہ ان کی دعا کے بغیر مجھ سے کوئی بھی کام ڈھنگ سے ہو ہی نہیں پاتا، اللہ میرے ان دعاؤں کے لیے اٹھے ہاتھوں کو سلامت رکھے۔اپنی شریک حیات کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی کہ انھوں نے مجھے حتی الوسع ہر کام اور ذمہ داری سے بری کیا۔ مقالے کی تیاری اور مکمل ہونے کے ہر مرحلے میں ان کا بھرپور ساتھ رہا ہے۔ امجد سعید قریشی ایڈوکیٹ، نے بھی ممکنہ حد تک خاندانی معاملات اور دیگر ذمہ داریوں کے بوجھ کو بانٹ کر میری یک سوئی کا سامان کیا، میں ممنون ہوں۔

قریش زادہ حب محمد جماعت نہم کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی مجھ سے رہنمائی نہیں لیا کرتا تھا کہ میرے کام کا حرج ہو گا، جواہرہ عادل میرے مقالے میں میری نرس بنی رہی اور خوب خدمت کی، قریش زادہ ظل محمد، قریش زادہ عکس محمد عکسی کا بھی شکریہ کہ ان دونوں نے میرے ساتھ ممکنہ حد تک تعاون کیا۔

عادل سعید قریشی
پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ سکالر
شعبۂ اُردو
ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

باب اوّل

سید عبد اللہ: مختصر سوانح

خاندانی پس منظر

سید عبداللہ شاہ بن سید نور احمد شاہ کا تعلق صوبہ خیبر پختونخوا کے ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور سے تھا۔ سید عبداللہ کے دادا سید شاہ حضرت المعروف شاہ جی، چکوال سے ہجرت کر کے شیر بائی گاؤں آ گئے تھے۔ سید عبداللہ کے دادا کے پانچ بیٹے تھے۔ بعد میں وہ شیر بائی گاؤں سے ترک سکونت کر کے ایک اور قریب گاؤں بنام منگلور آ گئے۔ سید عبداللہ کا خاندان مشہدی سادات کہلواتا ہے۔ عطیہ سید اپنے خاندانی پس منظر پر گفتگو کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

> ”ہمارے جد امجد، جو ہندوستان آئے تھے ان کا نام سید باقر شاہ تھا۔ تین پشتوں تک اس خاندان نے چکوال میں ہی قیام کیا پھر اسی خاندان کے ایک بزرگ شاہ حضرت المعروف شاہ جی شیر بائی گاؤں میں آ بسے۔ انہی کے بیٹے سید نور احمد شاہ تھے، جو میرے دادا تھے۔“(۱)

سید عبداللہ کے والد سید نور احمد شاہ کے چار بھائی اور بھی تھے جو اپنی والد کے ساتھ ہی شیر بائی گاؤں سے منگلور آ گئے۔ سید عبداللہ کا شجرہ نسب آج بھی ان کی بیٹی اور بھتیجوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس شجرہ کے مطابق تیس واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی بن ابی طالب سے جا ملتا ہے۔ سید عبداللہ کے خاندان کا تعارف کراتے ہوئے مسز تسنیم اختر لکھتی ہیں:

> ”شاہ حضرت المعروف شاہ جی سکھوں کے خلاف سید احمد بریلوی کی تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ اسی تحریک کے دوران انھوں نے اپنا گاؤں شیر بائی، جو تناول کے علاقے میں واقع ہے، چھوڑا اور گاؤں منگلور منتقل ہو گئے کیونکہ شیر بائی کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ شاہ جی کے پانچ بیٹے تھے۔ جن کے نام عبداللہ، محمد حسین، فیض احمد، عبدالرحمان اور نور احمد تھے۔“(۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی ”خود نوشت“ کے عنوان سے ایک مختصر مضمون میں اپنا جامع تعارف کراتے ہیں۔ اسی مضمون میں وہ اپنے خاندانی پس منظر سے یوں متعارف کراتے ہیں:

> ”میں ایک ذی علم خاندان کا فرد ہوں۔ درس و تدریس میرے بزرگوں کا عمومی مشغلہ تھا۔ میرے والد ہی میرے اولین استاد تھے۔ میں نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم انہی سے حاصل کی ہے۔“(۳)

سید عبد اللہ کا خاندانی پس منظر علمی و مذہبی تھا۔ اجداد نے علم اور حکمت کے میدان میں بھی کام کیا۔ سید عبد اللہ نے بھی علم کے حصول کا شوق اور اس میدان میں تحصیل علم کی لگن بھی اپنی خاندانی روایت سے لی۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کی شخصیت پر بھی ان کے وجیہہ خاندانی پس منظر کے اثرات ملتے ہیں۔ ان کا تحصیل علم کا رجحان اور طلب علم میں ان کے والد صاحب کی خواہش اور کوشش دونوں شامل تھیں۔ سید عبد اللہ عموماً اپنے بارے میں بات کرنے سے احتراز کرتے تھے لیکن ان کے چند گفتگوؤں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان والد ان کی تعلیم و تربیت کے لیے فکر مند تھے۔

ولادت

ڈاکٹر سید عبد اللہ کے والد صاحب نے تین شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی سے ڈاکٹر سید عبد اللہ متولد ہوئے تھے۔ نور احمد شاہ کا تعارف کراتے ہوئے مسز تسنیم اختر رقم طراز ہیں:

> ''بہن بھائیوں میں نور احمد سب سے بڑے تھے۔ یہی ہمارے موضوع مقالہ سید عبد اللہ کے والد تھے۔ انہوں نے تین شادیاں کیں پہلی بیوی کا تعلق ہری پور (ہزارہ) سے تھا، ان سے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹے کا نام فقیر شاہ رکھا گیا جو بعد میں سید عبد اللہ کے نام سے معروف ہوا۔''(۴)

سید عبدااللہ، نور احمد شاہ کے گھر ۵ اپریل ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ اگلی نسل میں سید عبد اللہ اس خاندان کے پہلے بیٹے تھے۔ آپ کی تین بہنیں بھی تھیں۔ آپ کا نمبر سب سے آخری ہے۔ آپ کے والد صاحب نے ایک شادی اور بھی کر رکھی تھی جن سے بھی ایک سوتیلا بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ان سے سبھی بہت لاڈ پیار کرتے تھے اور والدہ کی انسیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بہت توجہ دیتی تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت میں والد صاحب کا خوب ہاتھ بٹایا کرتی تھیں لیکن جلد ہی وہ فوت بھی ہو گئیں۔

تعلیم و تربیت

سید عبداللہ کی پیدائش ضلع مانسہرہ کے مضافاتی گاؤں کی ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام گھر ہی پر کیا گیا۔ سید نور احمد شاہ پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ مقامی سطح پر اس حکمت کے علاوہ ان کی علمیت اور فہم و فراست کی وجہ سے خاصی عزت تھی اور وہ خود اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم کی نگرانی کرتے تھے۔ عطیہ سید اپنے دادا کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''آجی کے والد عالم دین بھی تھے اور طبیب بھی۔ مگر اپنی حکمت کو انہوں نے کبھی روپیہ کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔۔۔انہیں عربی اور فارسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔''(۵)

سید نور احمد شاہ نے اپنے بیٹے سید عبداللہ کی ابتدائی تعلیم کا ذمہ خود لیا اور ان کو اس غیر رسمی تعلیم کی بنیاد فارسی اور عربی زبان کی تدریس ہی پر رکھی تھی۔ ان دونوں زبانوں کے ادبی شہکار آپ کو پڑھائے گیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ابتدائی تعلیم کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''میں نے ابتدائی دینی اور دنیاوی تعلیم انہی (والد) سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے بعد کریما نامۂ حق، پند نامہ عطار، گلستان و بوستان، سکندر نامہ بری و بحری، یوسف زلیخا تک فارسی خط کتابت، انشائے شکستہ، خوش خطی اور بعد میں حساب بھی انہی سے پڑھا۔''(۶)

سید عبداللہ کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے والد صاحب نے ان کی شخصیت سازی پر بھی خاص توجہ دی اور ان کو اکثر و بیشتر اسلامی اقدار اور روایات کی پیروی اور اسلامی چلن پر اصرار کرتے تھے۔ عطیہ سید کا کہنا ہے کہ دادا جان مذہبی شخصیت کے مالک تھے۔ نماز روزہ کا خصوصی اہتمام کرتے تھے لہذا اپنی ساری اولادوں پر اس لحاظ سے خاص توجہ دی اور سید عبداللہ کی سیرت سازی پر ان کی غیر معمولی توجہ تھی۔(۷) آپ کو مڈل کلاس پاس کرنے کے بعد اگلی جماعتوں کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول مانسہرہ بھیج دیا گیا تاکہ تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ والدہ اپنے عین عنوان شباب میں چل بسیں جس کا دکھ ساری عمر سید عبداللہ کو رہا وہ لکھتے ہیں:

> ''ابھی میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ اسی وجہ سے میری طبیعت زندگی بھر محبت کی پیاسی رہی اور اندر کا زخم کسی اور محبت سے نہ بھر سکا۔''(۸)

والدہ کی محبت اور توجہ کی کمی کو سید صاحب ہمیشہ محسوس کرتے رہے اور نجی محفلوں میں بھی احباب سے ذکر بھی کرتے تھے۔ ان کے انٹرویو بھی ان کی اس خلش اور کسک کا پتا دیتے ہیں۔

ایبٹ آباد میں سید عبداللہ نے نویں کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۰ء میں اپنے ایک چچا کے پاس لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ سکول بھاٹی گیٹ لاہور میں داخلہ لے لیا لیکن پھر جلد ہی مدرسہ نعمانیہ لاہور میں داخل کرا دیے گیے جہاں انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی۔ اسی قیام کے دوران تحریک خلافت میں شامل ہو کر علی گڑھ بھی چلے گئے اور اس باب میں وہ خود یوں رقم طراز ہیں:

''ایبٹ آباد سے لاہور آنے پر ماحول بدل گیا۔ میں اب دین اور سیاست میں دلچسپی لینے لگ گیا ۔ تحریک خلافت کا زمانہ شباب پر تھا۔ زمیندار اخبار اس زمانے میں ادب و سیاست کو دو آتشہ مہیا کرتا۔۔۔ میں بھی زمیندار کا مشتاق ہو گیا۔۔۔ پھر قدرت مجھے علی گڑھ لے گئی۔ میں تحریک خلافت کا ایک کم عمر سپاہی بن کر جامعہ ملیہ علی گڑھ کا طالب علم ہو گیا۔۔۔ علی گڑھ میں دینی ادب کی تدریس کا خاص اہتمام تھا۔ میں اس سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔۔۔ دینی علوم سے میری دلچسپی، علی گڑھ سے واپسی پر لاہور میں اس وقت بڑھی جب میں مرحوم و مغفور مولانا احمد علی صاحب کے حلقہ درس میں شریک ہوا۔''(۹)

غرض مدرسہ اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ ساتھ ساتھ رہا اور بالآخر ۱۹۲۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا گیا۔ اسی سال ایف اے کا امتحان بھی پاس کیا اور ۱۹۲۷ء میں بی اے کر لیا اور پھر ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۵ء میں ایم اے فارسی اور پھر ایم اے عربی کا امتحان ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ اس کے ساتھ مختلف سرٹیفیکیٹ کورسز بھی کرتے رہے جن میں ۱۹۳۴ء میں لائبیریری سائنس میں سرٹیفیکیٹ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی۔ لٹ) کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔(۱۰) ڈاکٹریٹ کے لیے سید عبداللہ نے ایک ضخیم مقالہ بعنوان ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' لکھا تھا ۔ اس مقالہ کی قدر پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر صادق زاہد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی پہلی کاوش ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ہے۔ سید صاحب نے بحیثیت ایک محقق و نقاد کے جو معیار متعین کیا تھا اس پر ان کے زیر بحث تحقیقی مقالہ کی بنیاد کوشش بسیار کے بعد رکھی۔۔۔۔۔ اس میدان میں سید صاحب وہ پہلے مجتہد ہیں جنھوں نے تحقیقی و تنقید کا چولی دامن کے ساتھ ثابت کیا۔ اور اس روایت کے وہ امین ہیں جس کی بنیاد اورینٹل کالج لاہور میں مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال اور حافظ محمود خان شیرانی اور دیگر بزرگوں نے رکھی تھی۔''(۱۱)

یوں سید عبداللہ کا تعلیمی سفر مکمل ہوتا ہے انھوں نے جن اساتذہ سے فیض علم کا اکتساب کیا ان میں پروفیسر محمد اقبال، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد سورتی، مولانا احمد علی اور مولانا غلام مرشد جیسے نامور اور عہد ساز علماو فضلا شامل ہیں۔ سید عبداللہ اپنے تمام اساتذہ کا ذکر نہایت ادب واحترام سے کرتے تھے اور اپنے ان اساتذہ کی تعریف کرتے اور ان کے علمی قد کاٹھ پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔

تعلیم وتربیت کے باب میں ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ذوق اور طبیعت کی تربیت سازی میں اپنے گھر کے مذہبی اور علمی ماحول کو اہم قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علمی گھریلو ماحول نے ان کی رغبت دین کے لیے بڑھائی۔ والد اور والدہ دونوں با عمل مسلمان تھے۔ پھر مدارس میں اسلامی تعلیم نے بھی ان کے مزاج کو مذہبی رنگ میں ڈھالنے کا ماحول باہم پہنچایا۔ مذہبی رجحان کے اثرات ان کی تمام تخلیقات میں بھی ملتے ہیں اور خود ان کی زندگی بھی ان کے اس مذاق کی شہادت دیتی ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں:

> "(ڈاکٹر سید عبداللہ) کردار واخلاق میں خالص اسلامی نظریہ کے حامل تھے اور انہوں نے یہ کبھی پسند نہ کیا کہ ان کے متوسلین، تلازمہ، معاصر یا اعزہ اس دائرے (اسلام) سے باہر قدم رکھیں۔"(۱۲)

سید عبداللہ کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوتی تھی اس کے اثرات کے ساتھ انہوں نے اپنی عمر عزیز گزاری اور اپنی اولادوں کو بھی یہی دینی اور علمی ماحول فراہم کیا۔

ملازمت

ڈاکٹر سید عبداللہ کا تعلیمی سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ان کی ملازمتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سید عبداللہ کی تعلیمی اسناد میں سے کچھ باقاعدہ طالب علم کے طور پر حاصل کردہ ہیں اور کچھ پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے حاصل کی گئی ہیں۔ سید صاحب کی پہلی ملازمت فہرست ساز (Cataloger) کی تھی اور یہ ملازمت کا سفر اورینٹل کالج لاہور کی پرنسپل شپ تک جا پہنچا تھا۔ سید عبداللہ کی ملازمت کا ایک مختصر سا ریکارڈ یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

۱)فہرست ساز(Cataloger)پنجاب یونیورسٹی لائبریری،۱۹۲۵ء تا۱۹۲۸ء

۲)عریبک اسٹنٹ،پنجاب یونیورسٹی لائبریری،۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء

۳)مہتمم، شعبہ عربی، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۳۴ء تا۱۹۳۸ء

۴)منشی فاضل کے استاد، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۳۸ء تا۱۹۳۹ء

۵)لیکچرار، شعبہ اردو، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۴۰ء تا۱۹۴۵ء

۶)ریڈر، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۴۵ء تا۱۹۴۸ء

۷)صدر، شعبہ اردو، اورینٹل کالج لاہور ۱۹۴۸ء تا۱۹۴۸ء

۸)یونیورسٹی پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۳ء تا۱۹۵۴ء

۹)پرنسپل، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۵۴ء تا۱۹۶۲ء

۱۰)استاد و صدر شعبہ عربی، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۳ء تا۱۹۶۵ء

۱۱)صدر، دائرہ معارف اسلامیہ ۱۹۶۶ء تا۱۹۸۶ء(۱۳)

یاد رہے کہ یہ سید عبداللہ کے مختلف عہدوں اور ملازمتوں کی مختصر ترین فہرست ہے۔ وہ اس کے علاوہ بھی قلیل مدتوں کے لیے مختلف عہدوں اور منصبوں پر کام کرتے رہے ہیں جیسے انھیں اورینٹل کالج لاہور ہی میں فارسی کے مدرس کا منصب بھی ملا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کے صدر بھی رہے۔ سید صاحب پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تالیف کے اعزازی ناظم بھی رہے وغیرہ وغیرہ۔(۱۴)

سید عبداللہ ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے جس بھی کام کی بھی ذمہ داری اٹھائی اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ملازمتوں کے دوران انھوں نے کئی نشیب و فراز دیکھے جن کو انھوں نے کمال حکمت، فہم، عقل مندی سے حل کیا۔ اُنھوں جس ذمہ داری کا ذمہ اُٹھایا اس کا حق ادا کیا۔ ان کی احساس ذمہ داری کے متعلق ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> ”سید عبداللہ کی بہترین صلاحیتوں میں سنجیدگی، وقار، انتظامی امور کی نگرانی، تدریسی مہارت، تحقیقی و تنقیدی دیانتداری شامل ہیں۔۔۔ڈاکٹر سید عبداللہ اسی محاذ کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض منصبی بھی احسن طریقے سے ادا کرتے رہے۔ جب اورینٹل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو علوم مشرقی کے

تحفظ اور احیا کے کام کے ساتھ ساتھ تدریسی نظام الاوقات، اور انتظامی امور کے لیے دن رات محنت کی۔ وہ معلمی کو عبادت سمجھتے تھے۔"(۱۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورینٹل کالج لاہور میں منشی فاضل کے استاد کے طور پر پھر لیکچرار اور پروفیسر اور پھر صدر شعبہ کی حیثیت سے انھوں نے جانفشانی سے کام کیا ان کی محنت اور ایمانداری کا ہر کوئی معترف تھا۔ سید عبداللہ نے تدریس کو ہمیشہ ایک مشن اور اور ذمہ داری کے طور پر لیا ہے۔ ان کا مزاج ایسا تھا کہ اپنے ذمے آئے ہر کام کو جاں فشانی اور لگن سے انجام دیتے تھے۔

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر سید عبداللہ نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی ان کی اپنے ہی خاندان میں ہوئی تھی ان کا نام ولایت النسا تھا۔ ان کا تعلق بھی شیر بائی گاؤں سے تھا۔(۱۶) ان کا انتقال ۱۹۳۳ء میں ہو گیا۔ ولایت النسا کے بطن سے سید عبداللہ کا ایک بیٹا زبیر مشہدی متولد ہوا تھا۔ زبیر مشہدی باعتبار پیشہ مدرس اور شاعر بھی تھے ان کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد سوز لکھتے ہیں:

> "سید زبیر مشہدی نامور علمی اور ادبی شخصیت ہیں اور سید عبداللہ کے فرزند ہیں۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی گاؤں منگلور ہے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء آپ بزم علم و ادب ایبٹ آباد کے صدر رہے۔ ۱۹۶۶ء میں انجمن احباب فکر ایبٹ آباد کے صدر رہے۔ ۱۹۹۰ء میں آپ ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی تین تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ "آیا تیرا خیال" اور "آغوش وفا" آپ کے شعری مجموعے ہیں جبکہ "نشانِ منزل" مضامین کا مجموعہ ہے۔"(۱۷)

سید زبیر مشہدی بھی ایک ادبی اور علمی انسان تھے۔ اور بڑے باپ کے بیٹے ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا بھی ایک ادبی حلقہ اثر تھا۔ ان کے دو بیٹے سید محسن اور سید انیس مرحوم بھی تھے۔ سید عبداللہ کی دوسری شادی بی بی حوا سے ہوئی۔ جو ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں اور سید عبداللہ کی مزاج آشنا تھیں۔ سید عبداللہ کا ان سے ایک خاص انس اور احترام کا رشتہ تھا۔ عطیہ سید بتاتی ہیں کہ سید صاحب کی ازدواجی زندگی قابل رشک تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے بیگم کو ساتھ رکھتے

تھے۔ گاؤں جائیں یا ہوٹل ان کی بیگم ان کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ حوا بی بی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر سید عبداللہ کی اہلیہ علم و ادب کا شوق اپنے گھر سے لائی تھیں۔ لیکن جب اپنے شوہر کے گھر آئیں تو انھیں جو علمی ماحول ملا، اس کے باعث یہ شوق مزید دو آتشہ ہو گیا۔۔ بیگم صاحبہ انتہائی نفیس، خوبصورت شوخ و شنگ اور دلچسپ خاتون تھی۔ ان کی ذہانت اور خوبصورتی کی بنا پر سید عبداللہ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے درمیان جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔۔۔سید عبداللہ کے ساتھ ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کی۔''(۱۸)

ڈاکٹر روبینہ شاہین کی اس رائے سے عطیہ سید اور دیگر اس خاندان کے افراد بھی اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ سید صاحب نے بیگم حوا بی بی کے ساتھ ایک خوشگوار اور اطمینان بھری زندگی بتائی ہے۔ یہ جوڑا اپنے خاندان بھر کے لیے قابل رشک تھا۔ سید عبداللہ کی اس دوسری شادی میں ایک بیٹا بنام سید سجاد حسین شاہ تھے جو لاہور میں وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ سید سجاد ایک وسیع مطالعہ رکھنے والے اور عمدہ ادبی مزاج کے حامل انسان تھے۔ ان کو فلسفہ، علم جفر اور علم ہندسہ سے خاص شغف تھا۔(۲۷) اس شادی سے سید عبداللہ کی ایک بیٹی ڈاکٹر عطیہ سید بھی ہیں۔ عطیہ سید کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد سوز لکھتے ہیں:

''عطیہ سید نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فلسفہ میں اول پوزیشن اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۔ ۱۹۴۰ء میں اعلی تعلیم کے لیے نیو پارک یونیورسٹی امریکہ گئیں واپس آکر لاہور کالج برائے خواتین میں بطور شعبہ صدر کام کیا۔''(۱۹)

عطیہ سید معلم ہونے کے علاوہ ایک منجھی ہوئے قومی سطح کی افسانہ نگار بھی ہیں۔ غرض سید عبداللہ کی اولادیں ان کی تربیت اور تعلیم سے خوب نام ور ہوئیں اور جس جس شعبے میں گئے نیک نام کمایا۔ ان کی تینوں اولادیں ادبی اور علمی میدانوں میں الگ شناخت رکھتی ہیں۔ جو سید صاحب کی تربیت اور تعلیم کا نتیجہ ہے۔

علمی وادبی سفر

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے ایک مصروف اور تھکا دینے والی زندگی کو اپنے لیے چنا تھا۔ منصبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کالج سے قلبی وابستگی نے ان کو شاید ہی کبھی فراغت محسوس ہونے دی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی بھی خاص پر رونق اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو ایک نظام الاوقات (Time Table) کے تحت ڈھال لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک کامیاب اور بھرپور علمی اور ادبی زندگی گزاری ہے۔ سید عبد اللہ کے علمی اور ادبی سفر کی روداد خاصی طویل اور تفصیل طلب ہے۔ سید عبد اللہ ایک ماہر استاد زبان و ادب اردو، فارسی اور عربی تھے۔ اسلامیات کے مضمون پر بھی خاص دسترس حاصل تھی۔ انگریزی ادب پر بھی ان کو خاص دسترس حاصل تھی۔ ادبی حوالے سے بھی ان کی خدمات ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے ادیب، صاحب اسلوب انشا پرداز، معتدل اور متوازن المزاج نقاد، ایک جانفشاں اور زیرک محقق کے طور پر ایک مستند حوالہ بھی رکھتے ہیں۔ سید عبد اللہ کی علمی اور ادبی خدمات کو الگ الگ دو ابواب میں بانٹا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ بیک وقت معلم وادیب تھے۔

سید عبد اللہ کی علمی اور ادبی حوالے سے زندگی کا باقاعدہ آغاز اورینٹل کالج لاہور سے قبل اس وقت ہوتا ہے جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں فہرست ساز کے بطور پر ملازمت کا آغاز کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ مختلف قلمی ناموں سے معاشرتی و معاشی اور عمرانی موضوعات پر مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے ان قلمی ناموں سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> ”استاذی سید صاحب ان تمدنی، معاشرتی اور قومی مسائل پر جن میں سیاسی رنگ آجانا ناگزیر تھا۔ وہ مخفی کوہستانی، زبیر ہزاروی، عارف عرفان اوراحمد کبیر کے نام سے اخبارات اور رسائل میں لکھتے تھے اور یہ سلسلہ ابتدا سے جاری ہو کر مدتوں چلتا رہا۔“(۲۰)

اہل بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا دل دردمند قوم اور ملت کے مسائل اور نوزائیدہ پاکستان کے لیے تکلیف میں تھا اور وہ ان موضوعات پر قلمی ناموں سے بھی انشا پردازی کرتے رہے ہیں۔ سید صاحب کے یہ مضامین بھی علمی وادبی حلقوں میں سراہے گئے ہیں۔ ان مضامین پر بات کرتے ہوئے افضل حق قرشی بتاتے ہیں:

> ”سید عبد اللہ کے مضامین کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو انھوں نے مختلف قلمی ناموں سے لکھا۔ اس انشا کا موضوع کو خالص ادبی نہیں لیکن اس ضمن میں سنجیدہ کام کی ضرورت ہے کہ ان مضامین اور

مقالات کو بھی تلاش کیا جائے اور ان کی تدوین کے بعد ان کی قدر متعین کرنے کی سعی کی جائے یوں سید عبد اللہ کے علمی و ادبی قد کاٹھ میں خاصا اضافہ ہو گا۔"(۲۱)

مذکورہ غیر ادبی تحریروں کے بعد سید عبد اللہ ادبی تحریروں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ یہ ادبی ذخیرہ شائع شدہ ہے اور ان کتب کو اہل فکر و نظرے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کتب میں ایک اچھی خاصی تعداد علمی و ادبی تحقیق و نقد کے باب میں لکھی گئی کتابوں کی ہے۔ جن سے اساتذہ اور طلبا بیک وقت استفادہ کرتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد مرزا، سید عبد اللہ کی ناقدانہ بصیرت اور محققانہ بلوغت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ موجودہ دور کے بہترین رہنما، ماہر تعلیم، دانشور اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بااصول نقاد اور باضمیر ادیب بھی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آپ دنیائے ادب میں ایک محقق کی حیثیت سے آئے اور اپنی تحقیقی جگر سوزی، محنت اور ہمت کی وجہ سے ایسا نام پیدا کیا کہ موجودہ دور کے محققین آپ کے نام کو تحقیق کے اصول کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ نے عالم تحقیق سے عالم تنقید میں قدم رکھا ہے۔۔ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی محل کے چار ستون یا اصول ہیں۔ تفتیش، تحقیق، تحلیل و تجزیہ۔ آپ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جب تک کسی چیز پر مکمل عبور حاصل کر کے اس کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک اس پر کسی قسم کی تنقید کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔"(۲۲)

پروفیسر رشید مرزانے اس اقتباس میں سید عبد اللہ کے انداز نقد و تحقیق پر خاصی روشنی ڈالی ہے کہ سید صاحب ان دونوں میدانوں کے شاہ سوار ہیں اور انھوں نے اہل فکر و نظر سے اس باب میں داد بھی چاہی ہے۔ ان کے مقالات نقد و تحقیق معروضیت اور موضوعیت و جامعیت کی اعلیٰ ادبی خوبیوں کے حامل ہیں۔ نیز یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ سید عبد اللہ کے ادبی مقالات و مضامین صرف تدریسی ضرورتوں کے لیے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا اس باب میں جتنا بھی کام ہے وہ بلا تخصیص ادبی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ ادبی حوالہ سے ڈاکٹر سید عبد اللہ کی چند شہرت یافتہ کتب یہ ہیں:

۱)ادب و فن
۲)اردو ادب جنگ عظیم کے بعد
۳)اطراف غالب
۴)اعجاز اقبال (مجموعہ)

۵)بحث و نظر

۶)پاکستان۔ تعبیر و تعمیر

۷)تحریک نفاذ اردو

۸)تعلیمی خطبات اور دوسرے مضامین

۹)چند نئے اور پرانے شاعر

۱۰)سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا

۱۱)سہل اقبال

۱۲)شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن

۱۳)فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ (پی ایچ ڈی کا مقالہ)

۱۴)کلچر کا مسئلہ

۱۵)مباحث

۱۶)مطالعہ اقبال کے چند رخ

۱۷)مقامات اقبال

۱۸)نقد میر

۱۹)نئے پرانے سخن ور

۲۰)وجہی سے عبد الحق تک

۲۱)ولی سے اقبال تک وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کئی کتابیں مختلف یونیورسٹیوں کے ایم۔اے کے نصاب میں بھی پڑھائی بھی جارہی ہیں علاوہ ازیں ان کے مقالات و مضامین فرداً فرداً بھی مختلف درجوں کے نصابوں کا حصہ ہیں۔ان کی کتب سے طلبا انفرادی طور پر بھی استفادہ کرتے ہیں۔

سید عبد اللہ کی علمی اور ادبی حیات بھی بھرپور اور مصروف تھی۔ فرائض منصبی کے ساتھ ادبی خدمات کا بجالانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے لیکن سید عبد اللہ جیسے نابغہ روزگار نے ان دونوں محاذوں پر خوب انصاف سے کام لیا۔ سید

صاحب نے اپنی کتابوں میں گراں بار اصطلاحات اور ادق تراکیب سے تنقید و تحقیق کو دور رکھا۔ انھوں نے فصیح و بلیغ اور سلیس اردو کو برتا ہے۔

علمی حوالے سے سید عبداللہ کا سب سے نمایاں حوالہ ادارہ دائرہ معارف اسلامیہ کی صدارت کا ملنا اور پھر اس منصب پر نہایت جاں فشانی اور سبک روی سے کارِ منصبی کا انجام دینا ہے۔ سید صاحب سے قبل اس کرسیِ صدارت پر ان کے استاد مولوی محمد شفیع تھے۔ ان کے بعد یہ بھاری ذمہ داری سید صاحب کے حصے میں آئی۔ اس حوالے سے سید جمیل احمد رضوی لکھتے ہیں:

> "(سید عبداللہ) ۱۹۶۶ء میں یونیورسٹی کے شعبہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے صدر بنادیے گیے۔ سید عبداللہ نے اپنی پوری توجہ اس کام کی رفتار کو تیز کرنے میں لگادی۔ وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں اس کی تمام جلدیں شائع ہو جائیں۔ مختصراً یہ کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ بھی ان کی زندگی بن گیا تھا۔"(۲۳)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی خوش قسمتی تھی کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اس کو میسر آئے اور جب ان کو اس کی صدارت ملی تب اس انسائیکلوپیڈیا کی صرف دو جلدیں مکمل ہوئی تھیں اور جب آپ نے اس دنیا کو چھوڑا تو اس کی بائیس جلدیں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔(۲۴) ڈاکٹر سید عبداللہ کے اس کارنامے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> "یہ بیس سال (۱۹۶۶ء تا ۱۹۸۶ء) علمی اور ادبی لحاظ سے نہایت بار آور رہے ہیں۔ آپ کی زندگی میں فراغت کے لمحات شاید و باید ہی آئے۔ آپ کی زندگی قائد اعظم کے ارشاد کام کام اور کام کے مجسم تھی۔ شبانہ روز سعی و علمی، تعلیمی، تحقیقی، ادبی، تمدنی و معاشرتی مصروفیات بھی احسن طریق پر انجام دیتے اور قومی مسائل پر غور و حوض کے لیے وقت نکالتے تھے۔"(۲۵)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ انسائیکلوپیڈیا کی تیاری، تراجم و تصحیحات کا بیشتر کام ان کی صدررات سنبھالنے سے پہلے ہو چکا تھا مگر طباعت کی رفتار تسلی بخش نہ تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے سست رفتاری کے اسباب کا پتا چلایا اور ان کا سدباب کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لنڈن) میں اسلامی تصورات یا تو موجود نہیں اور اگر ہیں تو واضح نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی تصورات سے متعلق مقالات میں اضافہ اور ترامیم کیں اور انھیں مسلمانوں کے مذاق و مزاج اور تاریخی و تہذیبی سانچے میں ڈھالا۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے تیکنیکی و فنی امور کی طرف بھی توجہ دیتے ہوئے معمولات کی

مکمل فہرست تیار کی۔ املا کے طریقوں میں یکسانیت پیدا کی تہجی ترتیب پر از سر نو غور کیا۔ سید عبد اللہ کے زمانہ صدارت میں بیس(۲۰) جلدیں شائع ہوئیں۔(۲۶)

سید عبد اللہ کا علمی اور ادبی سفر اس قدر جاندار اور ثروت مند ہے کہ اس پر الگ ایک جامع مقالے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس باب میں ادبی موضوعات سے لے کر تاریخی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور خالص اسلامی موضوعات پر بھی لکھا۔ کوئی بھی موضوع ہو، سید صاحب کا انداز فکر و نظر عالمانہ اور مفکرانہ ہے ان کا ہر مقالہ اور مضمون اپنی وقعت، وسعت اور جامعیت کا داد خواہ ہے۔ بات میر تقی میر کی ہو یا غالب کی طرفداری مقصود ہو، اسلامی ثقافت کا موضوع ہو یا پاکستانیت کے تقاضوں کی شرح مطلوب ہو، سید عبد اللہ کی فکر اور انداز تفکر معتدل، متوازن اور جدت پسند ہو گا اور ان کے مباحث مدلل واضح اور معروضی ہوں گے۔ اسی لیے ان کا چھوڑا ہوا ذخیرہ ادب، اردو ادب کا قیمتی سرمایہ متصور کیا جاتا ہے۔

غیر منصبی سرگرمیاں

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اسی سال کی عمر پائی۔ اس زندگی ناپائیدار کا ایک ایک لمحہ انھوں نے نہایت ذمہ داری سے بسر کیا۔ ان کی منصبی ذمہ داریاں دمِ آخر تک خاصی بھاری تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے بہت سی غیر منصبی ذمہ داریاں بھی اپنے ذمہ لے رکھی تھیں۔ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے وقت نکالنا اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا کچھ سید عبد اللہ کی طبیعت ہی کا کمال تھا۔ ان غیر منصبی سرگرمیوں کی اگر ایک غیر رسمی فہرست ہی بنائی جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ سید عبد اللہ ایک خوش سلیقہ اور کام کو وقت پر نمٹانے والی شخصیت تھے۔ انھوں نے اسی سالہ زندگی میں جتنا کام کیا ایک عام آدمی اس کا عشر عشیر بھی نہ کر پائے۔

ان غیر منصبی سرگرمیوں میں سید صاحب کی ادبی تنظیموں کی سرپرستی کرنا، زیر نگرانی تحقیقی کام کرنے والے طلبا و طالبات کی رہنمائی، ادبی اداروں کی سرپرستی کرنا، ان ادبی اداروں میں مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو لاہور، مرکزی اردو بورڈ وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ اداروں میں بطور رکن اور سربراہ کے بھی معاملات دیکھے اور پنجاب یونیورسٹی کے تصنیفی اور تحقیقی اداروں میں فعال کردار ادا کرنا شامل ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ان کی غیر منصبی خدمات جلیلہ کو یوں خراج تحسین دیتے ہیں:

"سید صاحب یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں اور دیگر بورڈوں کے رکن اور معاشرتی قدروں کے اداشناس بھی ہیں۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ بڑے علمی، تعلیمی اور تہذیبی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی اور ان کو سرسبز و شاداب بنایا۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پاکستان اورینٹل کانفرنس (۱۹۵۶ء) اردو کانفرنس (۱۹۴۸ء) اردو کانفرنس (۱۹۲۱ء) وغیرہ کی تنظیم کرنے کے علاوہ اردو اکیڈمی کی تعمیر و تاسیس کر کے اسے پاکستان کا ایک فعال ادارہ بنایا۔ مختلف تعلیمی معاشرتی اور تہذیبی موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے وقتاً فوقتاً جو بلند مایہ مضامین (اردو اور انگریزی) میں لکھے اور مختلف مجالس میں تقاریر ارشاد فرمائیں۔ ان سے ملک کے اہل فکر و نظر نے بڑی بصیرت حاصل کی ہے۔"(۲۷)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی رائے صائب ہے اور سید عبداللہ نے اپنی غیر منصبی ذمہ داریوں کو بھی نہایت خوش اسلوبی اور شائستگی سے نبھایا اور نیک نام کمایا ہے۔ اردو کے ضمن میں بھی ان کی خدمات خاصی نمایاں ہیں اور انہوں نے اردو زبان کے نفاذ اور اردو کے جائز مقام کے لیے عملی جدوجہد بھی کی۔ سید عبداللہ کو ان کی اسی حوالے سے "بابائے اردو ثانی" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی اردو خدمات سے بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی خوش اور مطمئن تھے۔ دونوں صاحبان اردو کے درمیان ایک خوشگوار تعلق بھی رہا۔ اس تعلق کے متعلق محمد اسلام نشتر لکھتے ہیں:

"بابائے اردو انجمن ترقی اردو (ہند) کے پلیٹ فارم سے ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں سے جن محبان اردو اور جانثاران اردو سے خط کتابت کے ذریعے رابطہ کرتے تھے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ قیام پاکستان کے بعد تادم واپسیں تک ارض وطن میں نفاذ اردو کے لیے ایک مینارۂ نور ثابت ہوئے۔ انھوں نے اردو کے لیے مختلف تحریکیں چلائیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے لیے بابائے اردو کا یہ انتخاب نہایت موزوں اور مناسب تھا۔"(۲۸)

اردو کے نفاذ کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے بارہ اردو کانفرنس منعقد کرائیں، مقالات لکھے اور خط کتابت کے ذریعے پاکستان کے طول و عرض میں اپنے شاگردوں اور احباب کو اس مہم کے لیے تیار کیا۔ سید عبداللہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتے تھے۔ وہ اردو کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کے خواہاں بھی تھے۔ ان ساری غیر منصبی سرگرمیوں کے لیے وہ ہر دم تیار رہتے تھے۔ ان کی ان خدمات کا ہر جگہ اور ہر سطح پر اعتراف بھی کیا گیا ہے۔

عادات وخصائل

ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت کا سب سے نمایاں زاویہ ان کا معلم ہونا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک مذہبی سوچ وفکر رکھنے والے انسان تھے۔بظاہر ان کا حلیہ شریعت کے مطابق نہ تھا لیکن ان کے دل میں اسلام کے ساتھ گہرا لگاؤ اور انسیت موجود تھی۔ سید عبداللہ اپنے دینی رجحان سازی میں اپنے گھر کے مذہبی ماحول کا اثر سمجھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ تصوف کے لیے بھی خاص التفات رکھتے تھے۔عطیہ سید لکھتی ہیں:

> ''فلسفیانہ رجحانات میں ان کا التفات تصوف اور مثالیت کی جانب تھا۔ وہ ارسطو کا بہت احترام کرتے تھے لیکن اصل یگانگت افلاطون ہی سے رکھتے تھے، افلاطون، جو تصوف اور مثالیت کے افکار کا علم بردار تھا اور جس کی اپنی شخصیت میں اصول تانث کا غلبہ تھا۔''(۲۹)

سید عبداللہ ایک سلجھی ہوئی اور معتدل شخصیت کا نام ہے جہاں دین اور دنیا کا حسین امتزاج ملتا ہے۔وہ تمام عمر ایک متوازن شخصیت کے طور پر جانے گئے۔ان کے خیالات اور اطوار میں شدت یا کسی چیز کی زیادتی ان کے متعلقین نے کہیں بھی اور کبھی بھی نہیں محسوس کی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مزاج اور طبیعت میں چیلنج قبول کرنے کا ملکہ غیر معمولی تھا۔وہ ہر کام کے کرنے کے لیے آمادہ ہو جانے والی انسان تھے کوئی بھی ذمہ داری ان کو تفویض ہوتی اس کو وہ نہایت اخلاص اور احسن طریق انجام دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ درس و تدریس سے لے کر انتظامی معاملات تک ان کا برتاؤ ایسا ہی تھا۔ دائرہ معارف اسلامیہ کی صدارت کے دوران انھوں نے جس خلوص اور محنت شاقہ سے کام لیا اس کی مثال نہیں ملتی۔اسی طرح علوم مشرقیہ اور اردو زبان کے نفاذ کے لیے بھی سید عبداللہ کا مشن ان کے جنون کا عکاس ہے۔انھوں نے زندگی کو ہمیشہ ایک چیلنج سمجھ کر گزارا ہے۔سید عبداللہ کی منصبی اور غیر منصبی ذمہ داریاں اور سرگرمیاں ان کی بھرپور زندگی کا پتا دیتی ہیں۔سید صاحب کی شخصیت کے اس رخ پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> ''سید عبداللہ کی بہترین صلاحیتوں میں سنجیدگی، وقار، انتظامی امور کی نگرانی، تدریسی مہارت، تحقیقی و تنقیدی دیانتداری شامل ہیں۔۔۔۔وہ معلمی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور جو وقت بچ جاتا اس

میں اردو کے فروغ کی منصوبہ بندی ، وسائل کی فراہمی جیسے امور کے لیے کوشاں ہو جاتے۔"(۳۰)

سید عبد اللہ نے قولِ قائد اعظم کام کام اور کام کے مصداق زندگی گزار دی ہے۔ ساری عمر محنت اور جاں فشانی سے کام لیا۔ اپنی ملازمت کو عبادت جانا اور لوگوں سے محبت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ سید عبد اللہ کی شخصیت کی منکسر المزاجی ، تحمل و بردباری نے ان کے کالج کی فضا پر بھی گہرے اور مثبت اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"استاد محترم کی شخصیت کے اس پہلو کا اثر اورینٹل کالج کے فارغ التحصیل طلبا میں نمایاں نظر آتا ہے کہ یہاں سے جانے والے طالب علم صرف علم اور ڈگریاں ہی لے کر نہیں جاتے بلکہ استاد محترم کی عظیم شخصیت سے درویشی، قناعت، صبر ، نظم و ضبط، خلق اور درد مندی کی صفات کا بھی گہرا اثر ساتھ لے جاتے ہیں"(۳۱)

ان مذکورہ صفات کے علاوہ بھی کئی صفات ان طلبا اور طالبات کو سیکھنے کے لیے ملتی تھیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کی ذات ہی درحقیقت وہ منبع تھی جس سے اس ادارے میں وہ علمی ور ادبی ماحول موجود تھا جس سے اسلامی اور مشرقی اقدار سیکھنے کو ملتی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کی ذات ہی نے اپنے طلبا کی شخصیت اور ان کے اذہان دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ مشرقی اقدار کے دلدادہ تھے۔ ان کے ہاں تہذیب اور آداب کا اعلیٰ ترین معیار مشرقی اور اسلامی اقدار ہی کا ہے۔ خود بھی اسلامی اور مشرقی اقدار کا نمونہ رہے۔ ان کے رفقائے کار، شاگرد اور خاندان کے افراد اس امر پر متفق ہیں کہ سید صاحب حیاداری، پردہ اور دیگر اعلی اسلامی اور مشرقی روایات و اقدار کے حامی تھے اور وہ خود بھی وضع داری اور مشرقیت کا بہترین نمونہ تھے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین ان کی مشرقی اقدار اور تہذیب سے انس کے باب میں ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا بیان کردہ ایک واقعہ بیان کرتی ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ کوئی لڑکی ساڑھی باندھ کر آگئی۔ سید صاحب نے طالبہ کو بلایا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔ سید صاحب نے لڑکی کی طرف دیکھے بغیر فرمایا "بیٹی! جاؤ کپڑے پہن کر آؤ۔" طالبہ نے یہ کہنے کی کوشش کی وہ لباس پہنے ہوئے ہے مگر اس سے پہلے وہ بولتی سید صاحب نے دوبارہ زور دے کر کہا "اسی وقت گھر جاؤ اور کپڑے پہن کر آؤ۔"(۳۲)

یوں وہ اپنے کالج کے طلبا اور طالبات پر نظر رکھتے تھے اور ان کے اخلاق اور اطوار کی قطع وبرید کرتے تھے۔ طلبا اور طالبات ان کی سرزنش اور نصیحت کو نصیحت پدرانہ کے طور پر لیتے تھے۔ اس عہد کے سبھی شاگردانِ سید ان کی تربیت اور اخلاق سازی کے باب میں متفق اللسان ہیں۔ سید عبداللہ اپنے ادارے کے ماحول اور علمی فضا پر کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔

سید عبداللہ بتاتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں ایک نمایاں عنصر غم پسندی کا بھی ہے جس کا تعارف وہ خود "غم پسند" کی اصطلاح سے کراتے ہیں (۳۳) اسی وجہ سے وہ میر تقی میر کے بھی گرویدہ رہے ہیں۔ سید عبداللہ کی طبیعت میں سنجیدگی اور انکساری کا مادہ بھی زیادہ تھا۔ وہ بڑے منصب تک پہنچ جانے کے باوجود خود کو ایک عام آدمی کے طور پر دیکھنا اور دکھانا پسند کرتے ہیں۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "رحمت کی طلب میری زندگی کا خاص مضمون ہے اور اسی میں گہرا اعتقاد رکھتا ہوں۔ شاید اسی لیے خدا تعالیٰ کا کرم شامل ہے کہ میں گناہ کو گناہ سمجھتا ہوں مگر اس پر فخر نہیں کرتا۔ میری عادتیں بھی فضول سی ہیں کیونکہ بندہ نہ فرشتہ ہے نہ ولی۔ ایک آدمی ہے جو بہت سی ایسی بھی ہیں جو بعضوں کی نظر میں اچھی نہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں کچھ لوگ ضرور پسند کرتے ہیں۔ میں بعض امور میں بے حد مستعد اور بعض میں بے حد سست الوجود ہوں مجھ سے دنیا کو دکھ پہنچے ہیں مگر اس پر اکثر نادم رہا کیونکہ دانستہ دکھ کسی کو نہیں دیا، زندگی میں نشاط غفلت سے بڑا فائدہ اٹھایا اور ہر حال میں طبیعت اندر سے آسودہ رہی البتہ دو چار سال سے امنگ میں بڑی کمی نظر آتی ہے اور حال حضرت جگر مرادآبادی کا سا ہو رہا ہے:
>
> طبیعت ان دنوں شائستہ غم ہوتی جاتی ہے   مرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے" (۳۴)

یہ اقتباس سید عبداللہ کی شخصیت کی لفظی تصویر کشی کر رہا ہے کہ وہ ایک منکسر المزاج، ہمدرد، خود شناس، دوسروں کے کام آنے والے، دوسروں کو سہولتیں اور آسانیاں دینے والے، گناہ سے ڈرنے اور نیکوکار انسان تھے۔ ان کی ذات میں اپنے متعلقین سے پیار اور دھیان رکھنے والی خوبی بھی موجود تھی۔

سید عبداللہ خوش گفتار اور خوش لباس شخصیت کے مالک تھے۔ لکھنے لکھانے سے خاص شغف تھا اور مطالعہ کتب ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ علمی اور ادبی محافل میں بلا تامل جاتے اور اسی رشتہ سے منسلک احباب و اصحاب سے راہ و رسم رکھتے

تھے۔ عطیہ سید بتاتی ہیں کہ سید عبداللہ نے خاندانی مسائل، خانگی جھگڑوں اور قضیوں میں کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ اہل خاندان کے دکھ درد میں برابر شریک ہوتے اور حتی الوسع ان کی مدد یا صلاح ومشورے بھی دیتے لیکن ان کی زندگی کا منشور بالکل مختلف تھا وہ گھر میں، کھانے کی میز پر ہنسی کھیل بھی کرتے اور پڑھائی کے وقت علمی اور علم سے متعلقہ ہی مختلف موضوعات پر بات کرتے تھے۔(۳۵) سید عبداللہ نے زندگی کو آسان بنانے کے لیے معاملات زندگی کو ضروری اور غیر ضروری امور میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یونہی انھوں نے نہایت دیانت اور انصاف پسندی کے ساتھ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کو انجام دیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی عادات اور خصائل کے متعلق احباب اور ان کے ساتھ کام کرنے والے ساتھی بتاتے ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاق اور اچھی عادات کے مالک تھے۔ اپنے ساتھیوں کی دلآزاری نہیں کرتے تھے ان کے ماتحت لوگ بھی ان کے اعلیٰ ظرفی اور برداشت کی تعریف کرتے تھے۔ غصہ آتا تھا مگر عموماً ضبط اور برداشت سے کام لیتے تھے۔ اپنے افسران بالا اور ماتحت رفقائے کار سے بھی تعلقات خوشگوار اور اچھے تھے اور ہر کام کو وقت پر اوراحسن ترین طریقے سے انجام دینے کی سعی کرتے اور کامیاب بھی ہوتے تھے۔ غرض ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت اپنے ہر رنگ اور زاویے میں مکمل اور خوب صورت تھی۔ احباب کی محفلوں میں ہنسی مذاق، شعرا اور ادبا کے اجلاس میں ہم جنس، شاگردوں کے درمیان ہنسوڑے اور شفیق استاد بن جاتے تھے ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> ''استاد مکرم ڈاکٹر سید عبداللہ استاذ لاساتذہ اور علم وفن کی روشنی کے بلند روشن مینار تھے۔ آپ بے بدل ماہر تعلیم، بے مثال محقق، بلند مرتبہ منفرد نقاد اور جامع العلوم شخصیت تھے۔ انتہائی شفیق، مہربان اور دردمند انسان، آپ کی گفتگو میں سنجیدگی، اصول پسندی اور مزاح کا ایک تیکھا انداز تھا۔ آپ کے الفاظ میں صبح کی شبنم کا ٹھہراؤ اور محبت کی گھلاوٹ موجود ہوتی تھی۔''(۳۶)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی مذکورہ خوبیوں کے متعلق ان کے احباب اور ماتحت گواہی دیتے تھے آپ نے ہمیشہ اپنے حلقہ احباب کو عزیز رکھا اور منصبی معاملات کو الگ رکھے رکھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا شخصی کردار میں حلیم الطبعی، قناعت پسندی، خوشامد کے لیے ناپسندیدگی، معاملات زندگی میں ایمانداری اور اپنی ستائش سے بیزاری نمایاں تھی۔ آج کل کے مادیت پسند اور پرست عہد میں میڈیا اور شہرت سے دور رہنا یا خود کو دور رکھنا جہاد عظیم ہے لیکن سید عبداللہ نے ہمیشہ اس طرح کی

سر گرمیوں اور حیلوں وسیلوں کی حوصلہ شکنی کی اور خود کو اس مصنوعی دوڑ سے دور رکھا ہے۔ شہرت سے بیزاری اور خود ستائی سے دوری ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا اوران کے اکثر انٹرویو اور خطوط اس اس ضمن میں ثبوت ہیں۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے کہ سید عبداللہ کی شخصیت کے سبھی رنگ اور زاویے ان کی کامیاب زندگی کا پتا دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اپنے زاویوں کی بالغ تربیت اور اخلاق کے حسن سے گزاری ہے۔ زندگی کے جس سٹیج میں وہ جس روپ میں جہاں سے گزرے اسی کردار سے انھوں نے خوب انصاف کیا ہے۔ زندگی میں آنے والے ساتھیوں، دوستوں، رشتہ داروں، عیال، ماتحتوں سے عدل کیا اور ان کے ساتھ ہمدردانہ اور مساویانہ برتاؤ کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ خوشی اور غم کو زندگی کا جزو جانا اور اپنے کار منصبی میں ان کو حائل نہیں ہونے دیا۔ باپ، استاد، منتظم اور مشیر کی حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان بتاتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سید عبداللہ شاہ مشرقی تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ان کا دفتر اور گھر اپنے دوستوں اور شاگردوں کے کھلا رہتا تھا۔ یوں کہوں کہ دوستوں کے تو دوست تھے ہی مخالفوں کے ساتھ بھی ان کے برتاؤ میں بھی اسلاف کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔''(۳۷)

ڈاکٹر شاکر اعوان کی رائے صائب ہے اور سید عبداللہ کی شخصیت میں ایک جامعیت تھی جس طرح وہ اپنی ذات میں ایک مکمل ادارہ تھے اسی طرح ان کا کردار بھی نفیس اور نستعلیق تھا ان سے ملنے والے ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔(۳۸)ان سے ملنے والے ان کی شخصیت کے بارے میں یہی کہتے تھے کہ ان کی ذات اپنے ہر رنگ اور زاویہ میں مکمل اور متاثر کرنے والی تھی۔ ان کا مزاج اور مذاق دونوں اعلیٰ درجوں پر تھے اور ان کی طبیعت میں عاجزی اور محنت و لگن کا عنصر نمایاں تھا بالفاظ دیگر سید عبداللہ ایک حسین اور جاذب شخصیت کے مالک تھے۔

بحیثیت استاد

سید عبداللہ کا سب سے بڑا اور مستند حوالہ ان کا مدرس ادب ہونا ہے۔ وہ بیک وقت اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مضامین کے استاد رہے ہیں۔ اورینٹل کالج لاہور میں آپ نے تقریباً اکتیس سال تک معلمی کی خدمت انجام دیں۔(۳۹) ان کے رفقائے کار اس باب میں متفق اللسان ہیں کہ آپ ایک عدیم المثال اور منجھے ہوئے استاد تھے۔ خود سید عبداللہ بھی اپنے استاد ہونے پر اکثر بیشتر فخر کرتے تھے۔ سید عبداللہ نے اس میدان میں جو نیک نامی کمائی اس کا بھی جب ذکر کرتے تو

ان کے الفاظ ان کے دلی کیفیت کے عکاس ہوتے تھے۔ سید عبداللہ کے استاد کی حیثیت سے فرائض منصبی سے بڑھ کر ان لوگوں کے مقرر معیائیر کو برقرار رکھنا تھا جس کی جگہ ان کی اس کالج میں تقرری کی گئی تھی بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

> ''۱۹۳۸ء میں آپ (سید عبداللہ) شاداں بلگرامی کی جگہ استاد فارسی مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی جگہ استاد اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ریڈر اردو اور ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی پروفیسر اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں دوسرے منصبی فرائض کے علاوہ شعبہ عربی کے صدر کے فرائض بھی سنبھالے۔ ان مختلف مناصب کے تنظیمی امور سرانجام دینے کے ساتھ آپ نے ایم اے اردو، فارسی، عربی کی تدریس میں بھی حصہ لیا۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے درس و تدریس میں اس خلوص، شغف اور انہماک سے حصہ لیا کہ اس خدمت کو منصبی فریضہ ہی نہیں سمجھا بلکہ جذب وشوق کا بلند مقام دیااور اسی میں مسرت وراحت کو تلاش کیا۔''(۴۰)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد اس بات پر متفق ہیں کہ سید صاحب ایک عظیم، محنتی، انتھک اور روشن ضمیر استاد تھے۔ جنھوں نے اپنے شاگردوں کو صرف تعلیم ہی نہیں تہذیب سکھائی ہے وہ خود مشرقی تہذیب اور اوضاع کے مالک انسان تھے لہذا انھوں نے اپنے متعلمین کی سیرت سازی بھی اسی انداز میں کی ہے۔ سید عبداللہ کے تدریسی حوالے سے بات کرتے ہو پروفیسر اسلم انصاری لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب پورے اہتمام سے کلاس میں آتے تھے۔ وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے (حالانکہ انہیں کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی تھی) وہ کلاس میں ایک پڑھانے والے استاد کی حیثیت سے آتے تھے اس لیے وہ چاک، ڈسٹر اور حوالے کی کتابوں کے بغیر کسی کلاس میں نہیں آئے۔ یہ اور بات ہے کہ حوالے کی کتاب شاذو نادر ہی کھلتی تھیں۔ اس لیے کہ تمام حوالے قدرتی طور پر ان کے لیکچر میں موجود ہوتے تھے۔کلاس میں آتے ہوئے اور پڑھاتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے متفرق کاغذوں کا ایک چھوٹا یابڑا تھیلا ضرور ہوتا تھا۔ ان کاغذوں پر سبق کے لیے اشارے ہوتے تھے ان اشاروں کو وہ خود ہی سمجھ سکتے تھے۔ کہیں الفاظ و تراکیب ہوتی تھیں کہیں اردو اور فارسی کے اشعار ہوتے تھے کسی ایک آدھ جگہ پر یوں بھی لکھا ہوتا تھا 'لطیفہ' گویا ہر لیکچر کے لیے وہ کچھ لطیفے بھی سوچ کرتے آتے تھے اور یہ پہلے سے طے ہوتا تھا کہ انہیں لیکچر کے کسی

خاص موڑ پر طالب علموں کو لطیفہ سنانا ہے۔ معلوم نہیں وہ اپنے لطیفے کہاں سے اخذ کرتے تھے۔
بعض اوقات وہ اپنے پرانے طالب علموں کے واقعات کو لطائف بنا کر پیش کر دیتے تھے۔''(۴۱)

اس طویل اقتباس کا مقصد سید عبداللہ کے انداز تدریس اور ان کے کلاس کے دوستانہ اور صحت مندانہ ماحول سے آگاہی دینی مقصود تھی۔ جہاں وہ اپنے طلبا کو ایک خاص ماحول میں درس دیتے تھے۔ ان کا ہر لیکچر ایک خاص انداز اور اسلوب رکھتا تھا جس سے وہ اپنے تعلیم کو دوامیت بخشتے تھے۔ سید عبداللہ کی شخصیت اور مذاق کو اچھے سے جاننے کے لیے مجلہ 'سوغات' کے نام سے ایک شخصیہ بھی ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے مرتب کیا ہے۔ اس مجلہ میں سید صاحب کے اپنے انٹرویو کے علاوہ ان کے شاگردوں اور دوستوں کے مضامین بھی ہیں۔ سید عبداللہ کی شخصیت اور ذات کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس رسالے کا حقیقی مقصد بقول سجاد احمد جان:

''رسالہ 'سوغات' ان مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو گزشتہ اپریل میں سید صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر پڑھے گئے تھے۔ جسے سید صاحب کے شاگردوں اور مداحوں کا مختصر گروہ تزک و احتشام سے منانا چاہتا تھا لیکن سید صاحب کی تحریک پر بڑی طمانیت اور سنجیدگی سے تجدید عزم کے جذبے سے انجام دیا۔۔۔''سوغات'' کے مضامین میں سید صاحب کے عزائم کو روشناس کرانے اور ان کی ترویج کے لیے ایک قابل قدر کوشش ہے۔''(۴۲)

یہ کتاب سید عبداللہ کی شخصیت اور ان کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے تبحر علمی، مشن اور اعلیٰ اقدار و روایات کے امین استاد ہونے کا پتا دیتی ہے۔ نیز ان کے 'تعلیمی خطبات' بھی ان کے وژن (Vision) نظام فکر اور اسلوب تدریس کی باب میں خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا سارے نثری سرمائے میں ان کا استاد کی حیثیت سے قد کاٹھ ابھر کر سامنے آتا ہے اس حوالے سے ان کے تعلیمی اور معاشرتی موضوعات پر تقاریر اور مضامین کا مجموعہ ''تعلیمی خطبات اور دیگر مضامین'' کے نام سے ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے مرتب کیا ہے۔ اپنی اس کاوش کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

''زیر نظر خطبات میں تعلیم کے بنیادی مقاصد کی تفصیلی بحث موجود ہے۔ ان نظریات کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان (پاکستان کے نظام تعلیم میں موجود) کی خوبیوں اور کوتاہیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ استاد محترم پاکستانی تعلیم کے بنیادی

مقاصد کیا بیان فرماتے ہیں اور ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں یہ مقاصد علمی طور پر کس حد تک پیش نظر ہیں"۔(۴۳)

بحیثیت استاد کے باب میں سید عبد اللہ کے متعلق بحث کو منطقی انجام تک لے جاتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ سید عبد اللہ اپنے عہد کے عبقری تھے اور ان کی شناخت کا سب سے مستحکم اور مضبوط حوالہ ان کا مدرس ہونا ہی تھا۔ وہ خود بھی اپنی تحریروں میں بھی اس حوالے سے اعتراف کرتے ہیں کہ استاد ہونے کو میں نے ہمیشہ شرف و عز جانا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس کام کو اخلاص، دیانت داری، ایمان داری، شفقت اور بے لوث ہو کر انجام دیا۔ طلبہ و طالبات کو پڑھایا بھی اور ان کے پڑھنے کے ماحول کو اسلامی اور مشرقی اقدار اور روایات سے تیار بھی کیا۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

"ان کی علمی حیثیت بنیادی طور پر ایک استاد کی تھی۔ تدریسی فرائض ان کے لیے فرض منصبی ہی نہیں بلکہ مقصد حیات (بھی) تھے۔ جو انداز مجالس میں ہوتا وہی تدریس میں بھی اپناتے تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا، لطائف، دلچسپ واقعات اور فارسی، عربی اردو کے اشعار سے ماحول کو پر لطف بنا لیتے تھے۔ اس طرح طلبہ ہمہ وقت ان کی طرف متوجہ رہتے۔ اپنے شاگردوں پر خاص طور پر مہربان تھے۔ ان کو علمی و ادبی کاموں میں مصروف عمل ہونے کی ترغیب دینا، ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ خود ایسے موقع فراہم کرتے کہ انہیں کام کی تحریک ملے۔۔۔ یونیورسٹی سے ان کی وابستگی کا زمانہ لگ بھگ چالیس سال رہا۔ اس دوران میں انھوں نے تحقیقی کام کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی ایم اے کلاسوں کو پڑھایا اور تحقیقی کاموں کی نگرانی کی۔ اس پوری مدت میں انہوں نے کوئی رخصت نہیں لی۔ وہ ہر دلعزیز استاد، محنت اور شفقت کا پیکر تھے۔"(۴۴)

المختصر سید عبد اللہ بحیثیت استاد ایک بڑا نام ہے اور ان کے کالج اور یونیورسٹی کے شاگرد اور رفقا متفق اللسان ہیں کہ سید صاحب نے صدق دل اور اخلاص سے اپنا یہ فرض انجام دیا۔ ان کی لیاقت، پیشہ ورانہ بوجھ اور جوش و عزم کا اعتراف غیر لوگ بھی کرتے ہیں۔ ان کے استادانہ صلاحیتوں کا اعتراف عوامی اور سرکاری ہر دو سطحوں پر کیا گیا ہے۔ ان کے شاگردوں کی ایک غیر رسمی فہرست میں بڑے بڑے نام ہیں جن میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر عبد الستار آغا، سید ذوالفقار حسین بخاری، منور ابن صادق، ڈاکٹر ریاض مجید، راجہ رشید محمود، افتخار احمد صدیقی، عطاالحق قاسمی، پروفیسر جگن ناتھ، پروفیسر اسلم انصاری وغیرہ نام اہم ہیں۔

پروفیسر ایمریطس

پروفیسر ایمریطس، کا اعزاز خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے بحیثیت استاد کیسی خدمات بجالائی ہوں گی اور ایک تعلیمی ادارے کے لیے بے مثال علمی اور ادبی فضا بنانے میں اپنا مثبت کردار اس طور ادا کیا کہ اس ادارے میں اعلیٰ علمی اور ادبی روایات نے جنم لیا اور اپنے صحن میں پڑھنے والے طلبا کی ایسی روحانی اور اخلاقی تربیت کی کہ جس سے پاکستان کو ہر شعبہ زندگی میں ایمان دار، مخلص، سنجیدہ اور متین طبع لوگ ملے۔ انہی خدمات کے عوض اورینٹل کالج لاہور میں ڈاکٹر

سید عبد اللہ کی مذکورہ اعلیٰ اور شاندار خدمات کے اعتراف کرتے ہوئے ان کو "پروفیسر ایمریطس" کا اعزاز دیا گیا۔ پروفیسر ایمریطس کا مفہوم اور معنی کچھ یوں ہیں:

to that held "Retired but retaining an honorary title corresponding immediately before retirement .

(۴۵)

پروفیسر ایمریطس ایک بڑا اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس اعزاز کا ہما ہر کسی کے سر نہیں بیٹھتا۔ سید عبد اللہ کی مقبولیت اور تبحر علمی کا اس سے بڑا اعتراف ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین اس ضمن میں یوں لکھتی ہیں:

> "سید صاحب کی اردو زبان و ادب کی عظیم خدمات کے پیش نظر "شعبہ اردو" کی طرف سے "پروفیسر ایمریطس" کا اعزاز دیا گیا۔ ڈاکٹر عبد اللہ ہمیشہ اپنے ذاتی پیڈ پر اپنے اس اعزاز کا ذکر کیا کرتے تھے۔"(۴۶)

پروفیسر ایمریطس کا اعزاز در حقیقت اس شخص کی خدمات جلیلہ کا اعتراف ہوتا ہے جس نے اپنے سارے عرصہ ملازمت میں شاندار خدمات بجالائی ہوتی ہیں۔ سید عبد اللہ نے اس شعبہ اردو میں نہ صرف درس و تدریس کی اعلیٰ روایات کو پروان چڑھایا بلکہ تحقیقی اور تنقیدی کلچر کی پرورش بھی کی تھی۔ لہذا ان کی ہستی ایک ذریعہ آمادگی اور ایک وسیلہ رہنمائی بھی تھی جس کے اعتراف میں ان کو یہ اعزاز ملا جس کا وہ واقعی استحقاق رکھتے تھے۔

علمی، ادبی مجالس کی رکنیت

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مصروف زندگی گزاری ہے۔ نجی مصروفیات تو ایک طرف رہیں۔ منصبی ذمہ داریاں کے ساتھ ساتھ غیر منصبی سرگرمیاں بھی رہیں۔ علمی و ادبی حلقوں میں اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ لوگ اور احباب ان کو علمی و ادبی مجالس و محافل میں شرکت ہی کے لیے نہیں بلاتے تھے بلکہ ان کی سرپرستی اور مشاورت اور رکنیت پر بھی اصرار کرتے تھے۔ لاہور کی ادبی و علمی تنظیموں میں بھی ان کا کردار خاصا فعال تھا۔ ایبٹ آباد کے علمی وادبی حلقے بھی ان کی توجہ اور وقت سے محروم نہ تھے گو لاہور سے خاص طور پر آنا تو یقیناً ممکن نہ ہوتا ہو گا مگر چھٹیوں یا کسی اور بہانے ایبٹ آباد میں ہونے پر وہ کئی تقریبات میں شامل ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مختلف علمی و ادبی مجالس و تنظیموں میں خاصا فعال کردار ادا کیا ہے۔ ان تنظیموں کی ایک مختصر اور بے ربط سی فہرست ان کی شخصیت کے اس پہلو سے تعارف کے لیے یوں مرتب کی جاتی ہے:

۱) جامعہ پنجاب کی سینٹ کی رکنیت

۲) اقبال اکیڈمی کی رکنیت

۳) سیرۃ النبیؐ نصاب کمیٹی کی صدارت

۴) مقتدرہ قومی زبان کی بنیادی رکنیت

۵) مرکزی اردو بورڈ کی رکنیت

۶) ماہر علوم مشرقیامت نامزدگی

۷) مجلس استناد اردو کی رکنیت

۸) قومی ریویو کمیٹی برائے نصابی کتب کی صدارت

۹) رکن ترقی اردو بورڈ، کراچی

۱۰) رکن مرکزی اردو بورڈ، لاہور

۱۱)رکن مجلس ترقی ادب، لاہور

۱۲)بانی وناظم اعلیٰ، انجمن ترقی اردو، لاہور

۱۳)بانی واعزازی پرنسپل اردو کالج، لاہور

۱۴)رکن اساسی، اکادمی ادبیات (پاکستان) اسلام آباد

۱۵)رکن، مجلس منتظمین ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (۴۷)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان تمام مجالس میں تفویض کردہ عہدوں پر اپنا کردار فعال رکھا اور خوب نام کمایا ہے۔ سید عبداللہ اپنے ذمے لگنے والے ہر کام کو اخلاص اور بے لوث ہو کر انجام دیتے رہے ہیں۔

وفات

ڈاکٹر سید عبداللہ کا آخری پروجیکٹ "دائرہ معارف اسلامیہ" تھا۔ دو جلدوں کے بعد یہ ذمہ داری آپ کو سونپی گئی اور آپ نے اس کام کو بائیس جلدوں تک پہنچادیا۔ ۹مارچ۱۹۸۶ء کو اسی دائرہ معارف اسلامیہ کے دفتر میں کام کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ پر فالج کا حملہ ہوا۔ (۴۸) اس بیماری میں انھوں قریباً پانچ ماہ گزارے اور پھر ۱۴اگست ۱۹۸۶ء کو دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، ہزاروں سوگواران نے انہیں گلشن راوی لاہور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔ (۴۹) یوں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان وادب کا استاد، ماہر علوم مشرقیات ، السنہ شرق کا سرپرست اور اردو زبان کے مجاہد کا عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔

اناللہ واناعلیہ راجعون۔

اعزازات

ڈاکٹر سید عبدللہ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان نے ان کو اعلیٰ قومی اعزاز "ہلال پاکستان" دیا۔ پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز "صدارتی تمغہ حسن کارکردگی" بھی ان ۱۹۶۹ء میں ان کو دیا گیا۔ سید عبداللہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کو "ماہر علوم مشرقیات" بھی نامزد کیا گیا۔ "پروفیسر ایمریطس" کا اعزاز بھی آپ کو حاصل رہا۔ ۱۹۶۱ء

میں حکومت ایران کی طرف سے ''نشان سپاس'' بھی پیش کیا گیا اس کے علاوہ انھوں اپنی شاندار کتب لکھنے پر کئی انعامات بھی حاصل کیے۔

حوالہ جات

۱)عطیہ سید، آ جی، مشمولہ ارمغان ڈاکٹر سید عبد اللہ مرتب ڈاکٹر تحسین فراقی، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۹

۲) تسنیم اختر، مقالہ ڈاکٹر سید عبد اللہ (احوال واثار) غیر مطبوعہ، مملوکہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۱۹۹۵، ص ۱

۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، خود نوشت، مشمولہ سوغات (شخصیہ)، مجلس ارادتمندان سید لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۲۱

۴) تسنیم اختر، مقالہ ڈاکٹر سید عبد للہ (احوال واثار)، ص ۲

۵)عطیہ سید، انٹرویو، بذریعہ فون، لاہور، ۲۱ فروری ۲۰۱۷

۶)ڈاکٹر عبد اللہ، خود نوشت، مشمولہ سوغات (شخصیہ)، ص ۲۲۱

۷)عطیہ سید، آ جی، مشمولہ ارمغان، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ص ۴۹

۸)ڈاکٹر سید عبد اللہ، سید صاحب کی کہانی خود ان کی زبانی، اخبار اردو، ستمبر ۱۹۸۷، ص ۳

۹)ڈاکٹر سید عبد اللہ، خود نوشت، ص ۲۲۲ تا ۲۲۳

۱۰)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶

۱۱) پروفیسر صادق زاہد، تاثرات و تجزیات، الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۳

۱۲)ڈاکٹر محمد باقر، قول، مشمولہ، مقالہ ڈاکٹر سید عبد اللہ (احوال و آثار) از تسنیم اختر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱

۱۳)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت و فن، ص ۷۵

۱۴)زاہدہ صادق، غیر مطبوعہ مقالہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ بحیثیت نقاد، مملوکہ، زاہدہ صادق، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج نمبر ۱، ایبٹ آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷

۱۵)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت و فن، ص ۲۴، ۲۳

۱۶) پروفیسر بشیر احمد سوز، مشاہیر ادبیات ہزارہ، ہزارہ چیئر، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۲

۱۷)پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اردو زبان ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۱۸)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت و فن، ص ۲۹

۱۹)ڈاکٹر عطیہ سید، مضمون آ جی، ص ۵۵

۲۰)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اردو خدمات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۲۱)افضل حق قرشی، انٹرویو بذریعہ فون، مدیر، سہ ماہی صحیفہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۳فروری ۲۰۱۲ء

۲۲)پروفیسر رشید مرزا، مضمون، ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت ایک ادیب و محقق، مشمولہ سوغات (شخصیہ)، ص ۲۰۸

۲۳)سید جمیل احمد رضوری، ڈاکٹر سید عبداللہ (کتابیات) مشمولہ ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۰

۲۴)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اردو خدمات، ص ۹

۲۵)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ایضاً، ص ۹

۲۶)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت و فن، ص ۱۹

۲۷)ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر سید عبداللہ شفیق استاد عظیم محقق، مشمولہ سوغات، ص ۴۶

۲۸)محمد اسلام نشتر، ڈاکٹر سید عبداللہ، بابائے اردو اور تحریک پاکستان، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو، ادارہ فروغ زبان، اسلام آباد، جنوری ۲۹۹۸ء، ص ۲

۲۹)ڈاکٹر عطیہ سید، آ جی، مشمولہ ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۴۹

۳۰)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت و فن، ص ۲۳۱۔ ۲۵

۳۱)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ عظیم استاد، مشمولہ سوغات، ص ۵۰

۳۲)ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، مشمولہ ڈاکٹر سید عبداللہ، شخصیت و فن، ص ۲۶

۳۳)ڈاکٹر سید عبداللہ، خود نوشت، مشمولہ سوغات، ص ۲۲۱

۳۴)ڈاکٹر سید عبداللہ انٹرویو، مشمولہ مقالہ پی ایچ ڈی بعنوان ڈاکٹر سید عبداللہ (احوال و آثار)، ص ۴۹

۳۵)ڈاکٹر عطیہ سید، انٹرویو بذریعہ فون ۲۰۱۸/ ۱۰/ ۲۳

۳۶)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اردو خدمات، ص ۲۰

۳۷)ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، انٹرویو رہائش گاہ، بفہ مانسہرہ، ۱۳فروری ۲۰۱۷ء

۳۸)تسنیم اختر، مقالہ سید عبداللہ (احوال و آثار) ص ۲۷

۳۹)ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر سید عبد اللہ شفیق استاد عظیم محقق، مشمولہ، سوغات، ص ۷۴
۴۰)ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ایضاً ص ۴۴
۴۱)اسلم انصاری، استاد مکرم سید عبد اللہ، مجلہ فنون، نومبر دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۲۳
۴۲)سجاد احمد جان، پیش لفظ، سوغات، شخصیہ، ص ۴
۴۳)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، مرتبہ مجلس ارادتمندان سید، لاہور، ص ۲۳
۴۴)ڈاکٹر روبینہ شاہین، تقریظ، سوغات (شخصیہ)، ص ۴
۴۵)آکسفرڈ ڈکشنری، ایڈیشن پنجم، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۹۵ء، ص ۳۳۷
۴۶)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت و فن، ص ۱۷
۴۷)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ایضاً، ص ۲۵
۴۸)پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، ص ۱۳
۴۹)زاہدہ صادق، مقالہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ بحیثیت محقق و نقاد، ص ۴

باب دوم

اسلامی اور پاکستانی عناصر: تمہیدی مباحث

موضوع کا تعارف

سید عبداللہ کی شخصیت کے کئی معتبر اور مستند حوالے ہیں جن میں ان کی اسلام پسندی، جدت پسندی اور ان کا محب پاکستان ہونا خاصا نمایاں ہے۔ انہوں نے پاکستان کے لیے اور پاکستان کے مستقبل کے لیے سوچا اور برصغیر کے مسلمانوں کی تقریبا ہزار سالہ تاریخ کو پاکستان کے مستقبل سے جوڑ کر اس مملکت کو دیکھا ہے اور احیائے اسلامی کے لیے جہاد بالقلم بھی کیا۔ سید عبداللہ کا نظریہ احیائے اسلامی دراصل مسلمانوں کو اپنے اسلام اور جدیدیت کی طرف رغبت دلانے کا مشن تھا اور ان کی نثری خدمات نے اس ضمن خاصا کام کیا ہے۔ یہ وہی تحریک تھی جس میں انیسویں صدی کی شروعات میں علامہ اقبال و اکبر وحالی بھی اپنے اپنے انداز میں کام کر چکے تھے۔(۱) اب جہاں تک سید عبداللہ کی تحریر کا تعلق ہے وہاں ہمیں اسلام اور مسلمانوں، پاکستان اور پاکستانیوں اور سب سے بڑھ کر اسلام اور پاکستان حوالے سے جاندار اور وقیع کام ملتا ہے۔ ارباب فکر و نظر کے لیے خاصا فکری مواد موجود ہے۔ اس حوالے سے سید صاحب کی اہم کتابیں بالخصوص "پاکستان: تعبیر و تعمیر"، "ادب و فن"، "کلچر کا مسئلہ"، "اعجاز اقبال"، "تحریک نفاذ اردو" ہیں۔ اس کے علاوہ "سید عبداللہ کے تعلیمی خطبات" مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری بھی خاص ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ "سید عبداللہ کی اردو خدمات" اور "طیف اقبال" مرتبہ ممتاز منگلوری میں بھی چند موضوعات کے حوالے سے مواد اور شرح مل جاتی ہے۔ اسلامی اور پاکستانی عناصر کے تعبیر اور توضیح کے حوالے سے ان کے اپنے افکار سے بھی تعارف سے بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی تخلیقات میں یعنی اپنے نثری سرمائے میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کو باہم جدا کر کے پیش نہیں کیا ان کے نزدیک پاکستان اور اسلام ایک ہی سکے کے دورخ ہیں، پاکستان، اسلام کے بغیر اپنے وجود کی دلیل ہی کھو دیتا ہے۔(۲) اور اسلام کو اپنے نفاذ کے لیے پاکستان چاہیے تھا لہذا سید عبداللہ پاکستان اور اسلام کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں:

> "بہر حال اسلام کا نعرہ (پاکستان کے حصول کے لیے) وقتی ضرورت نہیں تھا بلکہ اپنے جملہ منطقی لوازم کے ساتھ مستقل اور قابل عمل اور واجب التعمیل اصول کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔۔۔لہذا پاکستان بن جانے کے بعد اس پر عمل ایفائے عہد کے لیے ضروری ہے بلکہ خود پاکستان کی ہستی کی بنیادی شرط ہے۔۔۔اسلام ہی پاکستان کی اساس ہے۔"(۳)

اس مختصر تمہیدی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کی تلاش اور اس کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ سے ہم ان کے فکری نظام کو اس خاص حوالے سے پرکھ سکیں گے اور پاکستان اور اسلام کے رشتے کے

ساتھ ساتھ ان کے پاکستانیت کے تصور، جذبہ بازیافت، ان کے تعلیمی افکار، علامہ اقبال کے فکری شرح بالخصوص اسی موضوع کے حوالے سے، قائداعظم کے خیالات کی روشنی میں پاکستان اور اسلام کے بندھن کی توضیح و تصریح ہو پائے گی اور نئی نسل کو بھی پاکستان کی تاریخ، حال اور مستقبل کو اسلام کے ساتھ جوڑنے اور اس کے حقیقی مقام کی پہچان دلا سکیں گی۔ یہ بھی کہ پاکستان کے قیام کا مقصد اسلامی ریاست کا قیام تھا جہاں مسلمان اسلامی تعلیمات اور قوانین کی بالادستی قائم کرتے ہوئے اسلامی طرز پر اپنی زندگیاں بسر کر سکیں۔ سید عبداللہ کے افکار ایک اہم فریضہ یہ بھی ادا کر رہے ہیں کہ وہ ایک پل کی صورت رکھتے ہیں یعنی ان کے افکار عالیہ اس راہ اور اس منزل کے لیے مینارہ نور ہیں جو پاکستان اور اس کے باسیوں کو فوزاً عظیما سے ہمکنار کرے گی۔ سید عبداللہ کے اس منصب خاص پر بات کرتے ہوئے عطش درانی لکھتے ہیں کہ سید عبداللہ (پاکستانی) معاشرے کی بھی معتدل ناقد ہیں کہ وہ مغربی اور غیر اسلامی اقدار کی نشاندہی کر رہے ہیں اور ان کے افکار اسلامی معاشرے اور پاکستان معاشرت کے قیام کے رہنمائی اور آمادگی کا کام کر رہے ہیں۔(۴)

ضرورت و اہمیت

سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کے مطالعہ کی ضرورت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے وجود اور اس کے ساتھ وابستہ نظری امیدوں کی حدود متعین ہو سکیں۔ پاکستانی ادب اور ثقافت اور دیگر پہلوؤں پر لکھنے والوں کے لیے راہیں متعین ہو سکیں یعنی نئے لکھاری جو ان موضوعات پر کام کرنے کے خواہاں ہیں وہ اپنی حدود و قیود سے آگاہ ہو سکیں اور وہ اپنی حقیقی منزل کی پہچان بھی کر سکیں اور اس منزل کی راہوں حائل رکاوٹوں پہچانا جا سکے۔ ان پروپیگنڈوں کو قابو کیا جا سکے جو اس قوم اور مملکت کے بے وقوف دوست اور ناسمجھ ہمدرد پھیلا رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دھیان طلب ہے کہ ادبی سرگرمیوں میں اس طرح کی تحریکات کے نتائج ہمیشہ مثبت رہے ہیں اور اس سے قبل بھی اردو ادب میں مختلف قومی اور بین الاقوامی تحریکات کے اثرات ملتے ہیں۔ ان تحریکات نے جہاں اردو ادب کو نئے خیالات اور زاویوں سے روشناس کرایا ہے وہیں نئے تجربات کے مواقع اور در بھی تخلیق کاروں کے لیے وا کئے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "تخلیق کار اپنے ماحول اور نظریہ حیات سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ جہاں وہ رہتا ہے وہیں سے اس کو موضوعات، حوالے اور تحریک ملتی ہے۔"(۵)

ڈاکٹر انور سدید کی یہ رائے صائب ہے کہ ماحول اور نظریہ زندگی ہی اس لکھاری کے نظام فکر کو تشکیل دیتا ہے اور وہ اپنے تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے پیمانوں سے ہی حسن و قبح اور خیر و شر کو ماپتا ہے اور اس سے اپنے نظریہ حیات اور فکرِ ذات کو تشکیل دیتا ہے۔ ثانیاً آج ہماری کرہِ ارض ایک دنیائی دیہہ (Global village) بن چکی ہے۔ فکر و نظر کے معیارات میں سبک رو تبدل و تغیر و قوع پذیر ہو رہا ہے۔ لیبارٹریوں میں تشکیل پانے والے آزمودہ و مجرب نتائج غلط اور رد کیے جا رہے ہیں۔ ایسی سنجیدہ اور نازک صورت حال میں ہر قوم کے بالیدہ اور سنجیدہ طبع و فہم رکھنے والے حضرات اپنے کل یعنی مستقبل کی فکر میں ہوتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کا ذہنی، جسمانی اور روحانی پرداخت کا فریضہ عہد حاضر میں آسان نہیں رہا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے بالخصوص اسلامی ضرورتوں، ادبی تقاضوں، سائنسی حاجات اور وقت کے بدلتے مطالبات کے ساتھ خود کو اور نئی نسل کے ادبا اور شعرا کو ہم آہنگ کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور واضح مقاصد کا تعین وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پاکستان جیسی نوزائیدہ قومیت اور مملکت کو اپنے نظریہ فعالیت، ترویج اور تشہیر کے لیے ذمہ دار، معتبر اور مستند وسیلہ ادب ہی نظر آ رہا ہے کیوں کہ یہ ذریعہ ہی احسن طریقے پر مذہبی، روحانی، ملی، ثقافتی، سماجی اور عمرانی مسائل کو معروضیت کے ساتھ برت سکتا ہے اور ایک عظیم اور یقینی تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ سید عبداللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”ہمارا ادب ہماری روحانی آرزوؤں کا ترجمان ہو۔ یہ ایسا ادب ہو جو اس ملک سے محبت کے جذبات پیدا کرے، اس میں پاکستانی آئیڈیالوجی کی روح موجود ہو۔ یہ ان مقاصد و آمال کی بھی ترغیب دے جو تحریک پاکستاں کے مد نظر تھے۔“(٦)

اصل بحث کی طرف گریز کرنے سے قبل اس سوال کا جواب بھی لازمی بنتا ہے اسلامی اور پاکستان عناصر کا مطالعہ کیوں ضروری ہے اس میں کسی بھی دانشور کے لیے ایسا کیا خاص ہے یا یہ عام آدمی کے لیے کس طرح کی افادیت رکھتا ہے۔ اس کا جواب یوں ہو گا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ایک نظریہ کے تحت ہندوستان کی تقسیم کی۔ دوم اس تقسیم کا مقصد صرف زمین کا دو حصوں میں بانٹ لینا نہیں تھا بلکہ دو قوم کو الگ الگ تسلیم کرنا تھا۔ سوم دونوں قوموں کے نمایاں پہلوؤں کو سامنے لانا تھا اور پھر حاصل ہونے والی مملکت کو اس کی غایت اولیٰ کے بموجب سنوارنا، قائم کرنا اور دوام بخشنا تھا۔ بالفاظ دیگر پاکستان نظریے کی دین تھا اور اسی نظریے کی بقا اور استحکام کے لیے اس ملک کو انہی خطوط پر استوار کرنا تھا جن کے نتیجے میں پاکستان ایک ایسی لیبارٹری بنتا جس میں اہل پاکستان اسلامی اصولوں کو جانچتے اور پرکھتے اور اسلامی فقہ کی عملی صورت کو آزماتے اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بناتے۔ لہٰذا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بن جانے والی ریاست کا مشن مکمل نہیں ہو گیا بلکہ حقیقی مشن تو اب شروع ہوا تھا۔ پاکستان کے قیام کی اصل وجہ دین اسلام تھا اور دین اسلام کی وجہ سے پاکستان بنا

تھالہذا پاکستان کا حوالہ اسلام اور اسلامیان ہند ہی تھے اور ہیں۔ پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کی ہزار بنیاد ہو سکتی ہیں لیکن پاکستان کے تشخص کا حوالہ ایک ہی تھا اور ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے۔ اس حقیقت سے مفر، نہ صرف پاکستان کو بے دلیل کر دیتا ہے بلکہ مسلمانان ہند کو بے شناخت کر دیتا ہے۔(۷) لہذا ادب ہی کیا پاکستان سے وابستہ ہر شے اور ہر حوالہ اسلامی ہے اور یہی سرخ روئی کی راہ بھی ہے۔ "اسلامی اور پاکستانی عناصر "کا ادب اور نثری سرمائے میں ہونا یا ملنا یا ان کی تلاش دراصل کئی مقاصد کے حصول کا باعث ہے مثلاً

ا۔ اسلام کی اہمیت اور افادیت، اسلام ہی پاکستان کا معتبر حوالہ اور واحد دلیل۔

ب۔ اسلام کے حوالے سے پاکستان کی قدر اور حیثیت کا جدا ہونا ۔

ج۔ قیام پاکستان سے وابستہ آرزوؤں اور تمناؤں سے آگاہی اور ان کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع پیدا کرنا۔

د۔ استحکام پاکستان میں اسلام کا ممکنہ کردار، اسلامی ثقافت، تہذیب، تمدن اور معاشرت وغیرہ کا عمل دخل اور ان کی غیر مشروط بقا کی سعی۔

ہ۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم کے افکار و نظریات کی روشنی میں اسلامی مملکت کے خدوخال اور پاکستان کے مقام کا تعین وغیرہ

غرض اس طرح کے کئی اور مقاصد بھی متعین کیے جاسکتے ہیں جن کو وجہ سے نثری سرمایوں میں اسلام اور پاکستان دونوں کو الگ الگ اور اکٹھے بھی موضوع بحث بنایا گیا ہو ۔ یہاں ایک پہلو یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ "اسلامی اور پاکستانی عناصر " دراصل دو مختلف اور متضاد عناصر ہرگز نہیں ہیں۔ یہ دراصل ایک ہی سکے دو رخ ہیں۔ اسلامی عناصر کا چلن جب سرزمین ملک خداداد پاکستان میں ہو یا ہو گا تو وہ پاکستانی عناصر ظہور میں آئیں گے پاکستانی عناصر اسلامی عناصر کے عکاس اور ہم شکل ہوں گے ۔(۸)

پاکستان اور اسلام کے باہمی رشتہ اور تعلق پر مفکرین کی بڑی تعداد کام کرتی رہی ہے اور آج بھی کر رہی ہے کیونکہ ان عناصر کا معروضی اور سنجیدہ مطالعہ جہاں فکری مغالطوں اور منفی پروپیگنڈوں کو دور کرے گا وہیں تفہیمات کی نئی اشکال بھی پیدا کرے گا۔ ان عناصر کا معروضی اور سائنسی طرز کا مطالعہ ، پاکستان کی نئی نسل کو اپنے ماضی، موجودہ نسل کو اپنے حال اور ہر دو کو اپنے، اسلام اور پاکستان کے مستقبل کو ساتھ جوڑے گا اور اس شیرازہ بندی سے بھی آگاہ کرے گا کی جس

نے ہندی مسلمانوں کو پاکستانی مسلمان پر فخر کا خیال، ترجیح کا سلیقہ اور شرف کا موقعہ دیا کیونکہ ہم پاکستان کے قیام کے سے قبل بھی ایک حسب رکھتے تھے اور ہندو سے یکسر جدا تھے اسی لیے ہمارا پاکستان کے قیام کے وقت یہ دعویٰ یہ تھا بقول چوہدری نذیر احمد خان:

> "پاکستان بناتے وقت علی الاعلان یہ دعوی کیا تھا کہ ہم ایک ایسی ریاست بنانا چاہتے ہیں جس میں مسلمان اپنے مذہب ، اپنی تاریخ ، اپنی روایات ، اپنے نظریات کے مطابق ایک منفرد اسلامی معاشرہ قائم کریں گے۔"(۹)

یعنی مسلمانان ہند کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اسلامی اقدار اور روایات کے لیے پاکستان چاہتے تھے لہذا اب یہ دعویٰ حقیقی روپ میں منصہ شہود پر آ چکا ہے اب اس کی بنیادوں ، درو دیوار اور ستونوں کو مضبوط کرنا ہے پس اس کام کے لیے اب پاکستانی دانشوروں، مفکرین، اساتذہ اور ادبا و شعرا کا فرض کے وہ نئ نسل کو اس حقیقت سے آگاہ کریں:

۱۔ نظریہ پاکستان کے عوامل اور عناصر سے آگاہ کیا جائے۔

۲۔ دو قومی نظریہ کو نئ نسل کے قلوب و اذہان میں واضح اور راسخ کیا جائے۔

۳۔ اسلام کی تعلیمات اور مسلمان کی زندگی کے ضابطوں کو اجاگر کرے۔

۴۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل اور تعمیر کے لیے نئ نسل کی کردار سازی کی جائے اور اعلیٰ اسلامی تعلیمات کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔

۵۔ اسلامی معاشرت، ثقافت اور اسلامی قوانین کو اپنانے پر فخر کا احساس دیا جائے وغیرہ۔

اسلامی عناصر اور پاکستانی عناصر کی آگاہی ایک مکمل اور مستحکم پاکستان کی ضمانت ہے اور انہی شرائط کے اہتمام پر یہ ملک خداداد مضبوط مملکت، نمائندہ ریاست، علامہ اقبال کے خواب کی حقیقی صورت اور قائداعظم کا اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ بن پائے گا۔ یوں تو اسلامی عناصر میں ایک مسلمان کی پوری زندگی آجاتی ہے لیکن خصوص سے جب اسلامی عناصر کا مطالعہ مقصود ہو گا تو اس وقت ان عناصر کو زیر مطالعہ لایا جائے گا جن جن کا تعلق فرد کے بنیادی عقائد اور اسلامی طرز حیات ہو گا مثلاً نمائندہ عناصر میں اسلام کا تصور زندگی، اسلامی قدار و روایات کا فروغ، اسلامی تصوف، اتحاد عالم اسلام، فکر اقبال میں اسلامی عناصر، اسلام کا تصور عورت، اسلام کا معاشی نظام اور اسلام کا تصور تعلیم وغیرہ کے تصورات سید عبد اللہ کے ہاں ملتے ہیں اور ان اسلامی عناصر سے ہی وہ اپنا نظام فکر تشکیل دیتے ہیں۔

فصل اول

اسلامی عناصر: تمہیدی مباحث

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے وہ ایک مسلمان کی زندگی کا انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام معاملات اور اختلاط و ارتباط انسانی کے ہر زاویہ پر روشنی ڈالتا ہے اور رہنمائی کے اصول بھی مہیا کرتا ہے۔ اسلامی اصول اور قواعد کا مقصد حقیقی ایک پر امن، خوشحال دوستانہ و مربیانہ معاشرہ اور ایک عدل و انصاف اور مساوات سے مزین مملکت کا قیام ہے۔ جہاں حاکمیت اعلیٰ صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہو۔ جیسے خورشید احمد لکھتے ہیں:

> ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو ایک زندگی کے مسائل کا ایسا معقول اور سائنٹیفک حل پیش کرتا ہے جو فکر و نظر کی ہر الجھن کو دور اور ہر عقدے کو حل کر دیتا ہے اور دوسری طرف تہذیبی اور تمدنی زندگی کے لیے ایک منفعل لائحہ عمل دیتا ہے جو انسانی معاشرے کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور صحت مند بنیادوں پر اس کے مستقبل کے ارتقا کی راہیں ہموار کرتا ہے اسلام پوری قوت کے ساتھ زندگی کی روحانی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور مادی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے استعمال کرتا ہے۔''(۱۰)

اس رائے کی اصابت مسلم ہے کہ اسلامی عناصر سے مراد وہ اصول، نظام، تراکیب اور کلیات ہیں جو مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی سائنٹفک حل فراہم کرتے ہیں اور انسانی عقدوں کو اس طور پر سلجھاتے ہیں کہ ایک اسلامی معاشرے میں اسلامی اقدار پروان چڑھتی رہیں نیز وہ معاشرتی نظام ہائے حیات کو ترتیب دیا جائے کہ ایک صحت مند اسلامی سوسائٹی متشکل ہو سکے۔ حقیقت میں یہی اسلام نظام حیات کی غایت اولیٰ ہے۔

اسلامی عناصر کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے اسی لیے زندگی کے رنگوں گننا اور ان کا کلی احاطہ کر لینا غالباً ممکن نہ ہو گا لہذا چند نمایاں عناصر کو چن کر بحث کی جائے گی۔ یہ عناصر وہی ہوں گے کہ جن کی امتیازی صورت اس خاص اسلوب حیات کو شناخت دے رہی ہو گی۔ مثلاً اسلامی عناصر میں اسلامی تصور زندگی، اسلامی اقدار اور روایات کا فروغ، تصوف کا زندگی اور ادب پر اثر اور اس کے نتائج، اتحاد عالم اسلام میں فرد و جماعت کا کردار، اتحاد عالم اسلامی کے لیے کاوشیں، فکر اقبال سے

استفادہ اور اس فکری نظام سے مستقبل اور حال کا سنوارنا اور اسلامی تصور میں عورت کا مقام، اسلامی نظام تعلیم اور اس کے مسائل اور تدارکات، اسلام کا معاشی نظام وغیرہ اہم عناصر ہیں۔

ان اسلام عناصر کا مطالعہ عہد حاضر میں اس لیے بھی ضروری ہے کہ مذہب کو مغرب نے انفرادی حیثیت دے رکھی ہے جبکہ مشرق میں مذہب متاع زیست ہے پس نئی نسل کو دین سے آگاہی اور دینی اصولوں سے استفادہ کے لیے ان عملی صورت سے متعارف کرانا ضروری ہے جن کی مدد سے اسلامی زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامیآیا جاپائے گا۔

اسلامی عناصر کی پہچان

اسلامی عناصر کی پہچان یہ ہے کہ ایک ہندی مسلم کی زندگی میں کئی رنگ اور کئی انداز مختلف معاملات کے لیے اپنائے جاتے ہیں مثلاً ماتم مرگ، شادی بیاہ، دیگر خوشی اور غم کے مواقع آتے ہیں یہ بھی کہ کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں مسلمان اپنے دین سے رہنمائی چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تقاضوں کے مطابق گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اس طرح یہ امر بھی خاصا اہم ہے کہ ایک اسلام کا پیروؤ اپنے تمام ضوابط اور قوانین کے لیے اپنے دین ہی کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی تمام رہنما اصول اور قوانین درحقیقت اسلامی عناصر ہیں جن کی پہچان اور جن پر عمل پیرا ہو کر فرد اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکتا ہے اور ان اعلیٰ مقاصد کا حصول ممکن بنا سکتا ہے جن پر عمل پیرا ہونے کا حکم اسے اللہ عزوجل نے دے رکھا ہے۔

اسلام کے احکامات اس فرد واحد کی سرخ روئی کا ضامن ہوتے ہیں جو ان کا اہتمام کرتا ہے قرآن مجید میں بڑا واضح فیصلہ سنا دیا گیا ہے:

> ”جو کوئی صالح عمل کرتا ہے تو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے اور جو کوئی برائی کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہے اور تیرا رب اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا نہیں۔“(۱۱)

اس لیے اسلامی عناصر کی پہچان اور ان کا تعین کسی مفکر اور دانشور کے ہاں بہت ضروری ہے۔ اس سرگرمی سے جہاں اس کے نظام فکر کے دائرہ کار سے آگاہی ہو سکتی ہے بلکہ یہ بھی پتا چلے گا کہ اس کا فکری اسلوب ان اعلیٰ مقاصد کے لیے کس قدر ممد و معاون ہے جن کا حکم اللہ نے دے رکھا ہے۔

ایک اسلامی معاشرہ میں چند عناصر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے۔عقائد کا تعلق ایک فرد کی فکر اور عمل سے ہوتا ہے۔عقائد اس فرد واحد اور اس ایک خاص اجتماع کے فکری سوتوں کی صورت گری کرتے ہیں اور پھر اس کے افعال و اعمال کی سمت کو تعین کرتے ہیں۔عقائد کسی بھی مذہب کے ماننے والے کو زندگی اور معاملات زندگی سے نمٹنے اور نبرد آزما ہونے کا طریقہ اور قرینہ دیتے ہیں علاوہ ازیں یہی عقائد فکری اعتبار اور فلسفہ زندگی کی اساس بھی بنتے ہیں۔عقائد اسلام کی تعداد متعین نہیں لیکن اس مقالے میں جن چند ایک کو زیر بحث لایا جائے گا ان میں عقیدہ توحید، عقیدہ آخرت، ارکان اسلام وغیرہ۔

اسلامی عناصر کے مطالعہ کے ساتھ ان کے دائرہ کار کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اسلامی عناصر کے مطالعے کا جہاں یہ امر کا قابل لحاظ ہے کہ وہ نظام حیات کے ہر پہلو کو اسلامی صورت دیتے ہیں، وہیں اسلامی عناصر اس فکری اور روحانی تجربے، تربیت اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کو بھی یقینی بناتے ہیں جو اسلام کا حقیقی وظیفہ ہے۔اسلامی عناصر کی بنیادی ہیئت بقول قرآن کچھ یوں ہے:

> ”اے ایمان والو! اللہ پاک پر ایمان لاؤ اور اللہ پاک کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو نازل کی اللہ پاک نے نبی محمد ﷺ پر اور کتابوں پر ایمان لاؤ جو پہلے نازل فرمائی گئیں اور جو کوئی اللہ پاک کا اور اس کے فرشتوں کا اور اسی کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا انکار کرتا ہے تو تحقیق وہ بہت گمراہ ہے۔“(۱۲)

ان اساسی عقائد سے اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور ان عقائد کو نظام تعلیم سے راسخ کرنا ہے اور اس تعلیمی نظام کے مقاصد کو قرآن و حدیث سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہ تعلیمی نظام جہاں فرد کے انفرادی عقائد کو رائج کرے گا، وہیں اجتماعی اسلامی تقاضوں کی تکمیل کو بھی یقینی بنائے گا۔

عقائد کے بعد معاشرتی تنظیمات آتی ہیں جو کہ درحقیقت انہی عقائد کی دین ہوتی ہیں۔اسلامی عناصر دراصل شعائر اسلامی ہیں جن کو دیکھ کر ایک خاص محل اور معاشرت کو دیگر محلات و معاشرتوں سے ممتاز کیا جا سکتا ہے۔اسلام درحقیقت ایک معاشرہ کی تشکیل کے لیے کام کرتا ہے۔ اس معاشرت کی بنا پر ہی وہ اپنے احکامات کی تعمیل چاہتا ہے۔عقائد کا نتیجہ یہی عملی صورتیں ہیں جن سے پھر اسلامی اقدار اور روایات جنم لیتی ہیں ان سب کا مجموعی نتیجہ پھر اسلامی معاشرے کا قیام ہے اور یہی اسلام کے عقائد کا منتہا ہے۔

اسلام کا تصور زندگی

اسلامی تصور زندگی، اسلامی عناصر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں اسلامی تصور زندگی کے نافذ ہونے کی دو سطحیں ہیں اول انفرادی اور دوم اجتماعی۔ اہل معاشرہ جو اس تصور زندگی سے کامل آگاہ ہوتے ہیں وہ اس کے نافذ کرنے اپنی فہم اور دانست اور استطاعت کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں کام کرتے ہیں۔ ایک مثالی زندگی کی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک ایسی فضا اور ماحول بناتے ہیں کہ جہاں اسلامی معاشرت جنم لے جہاں اللہ کا پسندیدہ اور مجوزہ نظام رائج ہو اور حاکمیت اعلیٰ اللہ کو حاصل ہو۔ اسلامی تصور زندگی یہی ہے کہ ہر کام، ہر نفس، ہر قدم اسلام کی منشا کے مطابق ہو اور ہر شعبے میں رہنمائی کا منبع اسلام ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ”دین و دنیا کے ہر مسئلے میں آنحضرت کے اسوہ حسنہ اور اقوال وارشادات ہی کو حکم بنایا ہے اور جب معلوم ہو جائے کہ آنحضرت کا ارشاد یہ ہے تو اس کے سامنے گردن جھکا دینا سب سے بڑا اسلام ہے۔“(۱۳)

اسلامی تصور زندگی کا مثالی نمونہ سرکار دوعالم حضرت محمد ﷺ کا اسوہ ہی ہے جس کو اللہ تعالی نے اسوہ حسنہ کہا ہے۔ اسی اسوہ حسنہ کو ایک مسلمان کی زندگی کی معراج بھی قرار دیا ہے بلکہ اسوہ رسول ایک کسوٹی ہے جس کے ساتھ ہم نے اپنے اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں اور مطلوبہ ترمیم اور تبدیلی لا سکتے ہیں۔

اسلامی اقدار و روایات کا فروغ

اسلامی عناصر کے حوالے سے ایک عنصر اسلامی روایات کی ترویج اور نا مناسب اور متحارب اسلام مغربی تصورات اور روایات کی بیخ کنی کا بھی ہے۔ سو سال سے زائد عرصہ تک انگریزوں کی غلامی کے نتیجے میں مسلمانان ہند پر ان کی تہذیب اور تعلیمی تصورات نے منفی اثرات مرتب کر دیے ہیں۔ مغرب کی سائنسی ترقی اور صنعتی انقلابات کے ثمرات سے کل مشرق ہی احساس کم تری کا شکار ہوا ہے، مسلمانان ہند کا بھی متاثر ہونا کوئی غیر منطقی اور بعید از عقل بات نہیں۔ اس مغربی

ریلے کو اسلامی تعلیمات اور اخلاقی ضوابط سے روکنا ہو گا۔ مغرب کی اقتدار کی پسندیدگی اور ان کی اندھادھند تقلید اسلامی عناصر کے پاکیزہ اور فعال نظام کو دیمک طرح چاٹتی جاتی رہے گی۔ مغربی تہذیب کا مقابلہ کمزور ایمان اور احساس کمتری کے مارے ہوئے مسلمانوں سے ہے، جن کے سینے اسلام کی تعلیمات سے خالی اور جن کے قلوب مغرب کی چمک سے مغلوب ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کا حال بہت خراب ہے بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

> ''مسلمان (ہر محاذ پر) پسپا ہو رہے ہیں ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے۔ ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ ان کی فکری اور نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصوارت، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔''(۱۴)

اس مغربیت کا سدباب اور اس کے بدلے میں اسلامی اور مشرقیت کا فروغ لازمی ہے کیونکہ اسی صورت میں ہی مسلمانوں کی شناخت کا تحفظ ممکن ہے۔ سوچ کے ان پیمانوں کو اسلام کے تابع کرنا ہو گا جن سے ہماری اسلامی شناخت متعلق ہے۔ مشرق اور مغرب میں ایک توازن اور اعتدال والا مسلک اپنانا ہو گا۔ آنے والی نسلوں کو پوتر اور مصفا اسلامی قدریں ترسیل کرنا ہوں گی تاکہ وہ اپنی شناخت اور اصل پر فخر اور ناز کے لیے دلیل اور سلیقہ میسر آئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے اسلام کو اس کی اصل روح اور حقیقی شکل میں محفوظ رکھا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مغرب کی اندھادھند تقلید اور ہندی اثرات سے اسلامی اقدار اور روایات کو مامون رکھا جائے۔

اسلامی تصوف

تصوف ایک طریق حیات ہے جس میں فرد اپنی روحانی پاکیزگی حاصل کرتا ہے اور نفسانی خواہشات کا تزکیہ کرتا ہے۔(۱۵) اس کی کئی تعریفیں قبول عام حاصل کر چکی ہیں پھر بھی کوئی ایک تعریف اس کی جامعیت کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ اہل علم اس اصطلاح کی معنوی وسعت پر تو متفق ضرور ہیں لیکن اس کی ایک تعریف پر متفق نہیں، بہر طور تصوف کی اصطلاح کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اشرف کمال لکھتے ہیں:

”یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو کہ عرفان ذات کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔روحانی تجربات کو تصوف میں بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔روحانی تجربہ مکمل تنہائی اور یکسو ہونے سے تعلق رکھتا ہے جہاں تک صوفیانہ کلام کا تعلق ہے تو صوفیانہ کلام میں بھی ترک دنیا،ترک خواہشات،ترک سوال،تزکیہ نفس،صبر ورضا، تحمل،برداشت، نفس کشی جیسے موضوعات کوبطور خاص مد نظر رکھا جاتا ہے۔تصوف ایک طرز عمل، طرز فکر اور طرز زندگی کا نام (بھی) ہے جس میں علم وعرفان کی منازل طے کی جاتی ہیں۔“(۱٦)

ہندوستان میں اسلامی تصوف کو ایک پورا نظام فکر مانا جاتا ہے جہاں اولیائے کرام نے اسی باب میں گرانقدر خدمات انجام دیں اور اسی نظام فکر سے خود کو بھی آلائشوں سے مامون رکھا اور اپنے مریدین کے تربیت اور ان کے تزکیہ کا کام لیا ہے۔ تصوف نے کئی دبستانوں میں رواج پایاہے اور کئی سلسلہ فکر کام بھی کر رہے ہیں۔اسلامی عناصر میں بھی اس کی حیثیت کلیدی ہے اور معاشرتی سائنسدان اس سے معاشرتی اور سماجی اصلاح کا کام لینے کے خواہاں ہیں۔

اتحاد عالم اسلام

اسلام اپنے مقلدوں سے سے اس بات کا متقاضی ہے کہ اہل کلمہ باہم بھائی بھائی بن کر رہیں۔اسلامی قومیت اسی حوالے سے دیگر ہر تصور قومیت سے جدا ہے کہ اسلام اپنے کلمہ گو کو دوسرے کلمہ کا بھائی قرار دیتا ہے۔اس ضمن میں احادیث اور آیت ہائے قرآنی بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ موجود ہیں جن میں اہل اسلام کو مواخاۃ کا درس اور حکم دیا گیا ہے۔اتحاد عالم اسلام کے باب میں اسلام بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم ذمہ داریاں تفویض کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ اہل اسلام بمثل ایک جسم کی ہوں اور اتحاد کی ایسی مضبوط صورت ہو جس سے ایک مضبوط دیوار کی طرح مسلمان اپناوجود منوالیں۔چودھری نذیر احمد خان لکھتے ہیں:

”مذہب کی بنیاد پر وسیع تر اتحاد ممکن ہے۔کیونکہ ہمارا مذہب محض ایک طریقہ عبادات نہیں بلکہ ایک دین ہے یعنی ایک مکمل ضابطہ حیات جس سے تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل حل ہو سکتے ہیں اور جس کے اضافی نظریہ حیات کی ضرورت نہیں رہتی۔خواہ وہ کسی قسم کے ازم کا روپ دھارے۔“(١۷)

بشرطیکہ مسلمان حقیقی صورت میں اسلام کو اپنالیں اور اسلام سے وابستگی اور تعلق دکھاوے اور ذاتی منفعت کے لیے نہ ہو۔ ہر کوئی نیک نیتی سے اللہ کو حاضر ناظر جان لے اور اس کے احکامات پر اخلاص سے عمل پیرا ہو جائے۔ خود کو ان اسلامی اخلاق اور کردار کا مثالی نمونہ بنالیں تو پھر اس طرز کا منطقی نتیجہ اتحاد عالم اسلام ہی ہو گا کیونکہ عالم اسلام کا اتحاد اخلاق اسلام کا ہی مظہر ہے۔

فکر اقبال میں اسلامی عناصر

اسلامی عناصر کی فہرست میں فکر اقبال کا مقام بھی خاصا بلند اور اہم ہے اس بات سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہے۔(۱۸) اقبال نے اپنے فکری نظام میں مسلمان کے انفرادی اور اجتماعی حوالے میں نہایت خیال افروز اور عملی تصورات پیش کیے ہیں یہ تصورات اقبال کے مشرقی ماخذات اور ان کی اسلامی طرز فکر اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب سے پردہ چاک کرتے ہیں نیز اقبال کی کامل نظری تفہیم کے لیے مشرقی علوم سے آگاہی لازمی ہے اور علوم شرقیہ اور مشاہیر شرق سے واقفیت ناگزیر ہے۔ اقبال شناسی اور اقبال فہمی در حقیقت اسلام اور فہم اسلام کا دوسرا نام ہے اور اسی فلسفہ اقبال سے عہد حاضر کے کئی مسائل اور بنیادی سوالات کا مفصل اور جامع جوابات بھی مل جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کا فکری سرمایہ ملت اسلامیہ کے استفادے کا منتظر ہے۔ بہر کیف فکر اقبال ایک پورا علمی و ادبی مضمون بن چکا ہے جس کو عرف عام میں 'اقبالیات' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے بعد میں آنے والے فلسفیوں، متکلمین، شاعروں، نثر نگاروں، سماجی و عمرانی دانشوروں کو متاثر کیا ہے بلکہ ان کی اکثریت اقبال کی فکری اور نظری مرید ہے۔ اقبال کے فکری تناظر میں ان کی تحقیقات نئے مباحث اور زاویہ فکر کے در وا کرتی ہیں۔ اقبال کا فکری نظام در حقیقت نشاۃ اسلامیہ کا پیغام رکھتا ہے۔(۱۹) اس پیغام کو ملت اسلامیہ تک بالعموم اور پاکستانی قوم تک بالخصوص پہنچانا ہے اور اس ملت و قوم کو قائل کرنا اور ان کو خواب خرگوش سے جگانا اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اقبال کے تصور شاہین اور خودی کے نظریے میں مسلمان قوم کے نوجوان کو مرد کامل بنتا دیکھتے ہیں اور اس کو تسخیر کائنات اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر کی ذمہ داری سونپتے ہیں کیونکہ یہی فریضہ تو اللہ نے بھی اسی امت وسط کے سپرد کیا ہے۔ اسی طرح پاکستان اور اسلام کے متعلق بہت سا فکری مواد اقبال کے علاوہ کہیں اور ملتا ہی نہیں مثلاً نظریہ تعلیم، نظریہ تربیت، نظریہ تعلیم نسواں، اسرار خودی اور رموز

بے خودی، حب الوطنی اور عظمت رفتہ کا حصول، فنون لطیفہ، اشتراکیت اور اس کے مضمرات، نظریہ مغربی جمہوریت وغیرہ۔

اسلام کا تصور عورت

عہد حاضر میں مغربی تصور عورت نے ایک باقاعدہ مہم کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی اسلامی معاشروں میں بھی ایسی فکر کے حامل لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو لگتا ہے کہ اسلام نے عورت کو محبوس کر رکھا ہے اور عورت کا استحصال کیا جارہا ہے۔ اس مغالطہ کو پھیلانے والے اسلام کے ہی مفکرین ہیں جو روشن خیالی کی گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کے نزدیک عورت کا مثالی روپ یورپ اور امریکہ میں ملتا ہے اور عورت کو وہ ایک نمائشی اور حظ اندوزی کے عنصر کے طور پر دیکھتے ہیں جب کہ عورت ایک الگ جنس ہے جس کو اسلام نے صدیوں قبل احترام اور وراثت سے نواز کر مستور کیا۔ عورت کو گھر گرہستی کے معاملات سونپ کر اس کی نزاکت اور طاقت کے مطابق حقوق و فرائض کی تقسیم کی۔

اسلامی نظام تعلیم

اسلام میں تعلیم کی اولین صورت نبی اکرم ﷺ کے دور میں دکھائی دیتی ہے اور پھر خلفائے راشدین اور اموی، عباسی ااور عثمانی عہد میں بھی تعلیم کو اسلامی احکامات اور احادیث کی روشنی میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عباسی عہد حکومت میں عربی زبان میں تمام علوم کی کتب با آسانی دستیاب تھیں اور مسلمان ہی تمام سائنسی اور غیر سائنسی علوم پر چھائے ہوئے تھے۔ اسلام کا اسلامی معاشرہ تعلیم کے ذریعے ایک شعور اور بالیدگی کا خواہاں ہوتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت اور اس کے دائرہ کار کو اسلام نے اپنے آغاز سے ہی نہایت صراحت اور وضاحت سے اپنے پیروکاروں کو سمجھا دیا تھا۔ 'اقرا' سے شروع ہونے والا دین، طلب علم کو مسلمان مرد و عورت پر فرض قرار دیتا ہے۔ (۲۰)

اسلامی تصور تعلیم انہی افکار اور اقدار کے تعلیم و ترویج کو یقینی بناتا ہے جو اسلامی نظام حیات کو احسن ترین صورت میں ترتیب دیں۔ اسلام کا نظریہ تعلیم اہل معاشرہ کو ان اسلامی عوامل یا عناصر سے تعارف کراتا ہے جو حقیقی اسلامی طرز حیات (code of life) کی صورت گری کو یقینی بناتے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے مروجہ ہر دو نظام ہائے تعلیم یعنی

مشرقی اور مغربی پر معروضی انداز میں نظر ثانی کی جائے اور اپنے ہر دو نظام تعلیم کو اسلامیآیا جائے اور اسلامی تعلیم اقدار کو اخلاص اور صدق دل سے رواج دیا جائے، جن سے محب اسلام اور محب رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نفوس پیدا ہوں کیونکہ اسی صورت میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کی بناڈالی جاسکتی ہے اوراسلامی تعلیم نظام کی غایت اولیٰ بھی یہی ہے۔خورشید احمد اسلامی نظریہ تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ میں یہ منفرد مقام اسلام کو ہی حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیام بر ثابت ہوا۔۔۔اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔''(۲۱)

ہمارے نظام تعلیم کی اساس بھی خالصتاً اسلامی ہو گی تو کہیں جا کر ان کو مقاصد حاصل کر پائیں گے جن کے نتیجے میں مضبوط اور مستحکم پاکستان کا خواب وابستہ ہے۔اس نظام میں رفاہیت، مساوات، ثقافت اور اسلامی شعار کی تدریس ہی بنیادی مقاصد ہونے چاہییں۔(۲۲)

اسلام کا معاشی نظام

اسلام کے پاس ایک مستحکم اور پائیدار معاشی نظام ہے جو مضبوط معاشرتی بنیادوں کا ضامن ہے۔اسلام اپنی ہر ریاست کو فلاحی ریاست بنانے کا خواہاں ہے جو لوگوں یعنی اپنی رعایا کی کفالت عامہ کو یقینی بنائے اور ہر شخص کو بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، لباس، رہائش و معالجے کی سہولیات فراہم کرے، تعلیم اور نوکری کے وسائل کا انتظام کرے،اسلام کے معاشی نظام کا مقصود حیات انسانی کو اس نہج پر استوار کرنا ہے کہ ہر مسلمان انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے دنیاوی اور اخروی فوزاً عظیما حاصل کر سکے۔(۲۳) اسلام کے معاشی نظام کی روح میں غریب پروری اور قرض حسنہ جیسی انسان دوست اسلامی قدریں موجود ہیں اور جہاں سود جیسی قبیح اور انسان دشمن نظام کی بیخ کنی ملتی ہے۔اسلام کی معاشی تنظیم معاشرے میں ایثار و قربانی، امداد باہمی، ہمدردی و خیر خواہی کو یقینی بناتی ہے۔اس سلسلے میں حکیم محمد اسحاق لکھتے ہیں:

"خدا کے نزدیک اس کی پوری مخلوق اس کا ایک کنبہ ہے اور ایک ہر ایک کی بہبود و خیر خواہی اس کے پیش نظر ہے۔ اسلام کا نظام معاش میں مزدور کے مفاد کی نگہداشت کرنا، سرمایہ دار کا دین قرار دیا گیا ہے۔ کاشت کار کے حقوق کی ادائیگی کو زمیندار کا مذہب اور مالدار کی جائز ضرورتوں کو پورا کرنا مزدور کے لیے عبادت ٹھہرایا گیا ہے۔ زمیندار کے حقوق کی ادائیگی کاشتکار اور مزارع کے لیے نیکی بنادی گئی۔"(۲۴)

یہ وہ کلیہ ہے جس پر اسلامی معاشی نظام استوار ہے۔ اسی نظام معاش کے نفاذ کے لیے کام کیا جانا چاہیے۔ اہل ارباب فکر کے ہاں بھی اسی نظام میں اس مملکت خداداد کی فلاح اور بقا بھی مضمر ہے۔ معاشرتی نظام میں معاشرتی انصاف اور معاشی مساوات پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ اسلام کا اصرار ہے کہ ایسا معاشرہ متشکل ہو کہ جس میں معاشی مساوات ہو اور معاشرہ میں عدم تحفظ نہ ہو، احساس کم تری اور دل برداشتگی کی فضا قطعاً نہ ہو یعنی روزگار کے مواقع اور ذرائع ہر انسان کو بلا تخصیص میسر ہوں تو ایسی صورت میں ایسا امکان ہرگز نہیں کہ ایسے معاشرے میں کوئی عدم مساوات کی صورت نمودار ہو۔ اسلامی نظام کی صورت گری پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

"اسلامی نظام حیات میں زندگی تمام فطری اور قدرتی کارخانوں کی مانند اپنے گول مدار پر محو خرام رہتی ہے کہ ایمان و اسلام سے شروع ہوتی۔ ارکان وعبادات میں متشکل ہوتی اور معاملات و اخلاقیات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس میں سے ہر پہلی چیز دوسرے عامل اور ہر دوسری چیز پہلی کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایمان و عمل اور اخلاق کی لڑی میں ایک حلقہ دوسرے کا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ یہ وہ میکانزم ہے جو اسلامی عناصر کو فعال اور عملی صورت میں بدلتا ہے۔"(۲۵)

اسی طرح معاشی نظام یا معیشت اسلامی تنظیمی صورت بھی ایک اسلامی معاشرہ کے قیام میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔ اسلامی معاشی تنظیم کی دو اشکال ہیں ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی، معاشیات کی تنظیمی صورت میں اسلام کا نظام بڑی وضاحت کے ساتھ فرائض اور حقوق کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔ اسلامی نظام معیشت پر بات کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمان لکھتے ہیں:

"اسلام نے نظام حکومت کا جو نقشہ تیار کیا ہے ان میں نہ مذموم سرمایہ داری کا گزر ہو سکتا ہے اور نہ طبقاتی جنگ کا امکان ہے، اس کا معاشی نظام نہ افراد کے انفرادی حقوق کو سلب کر کے تعطل و جمود

پیدا کرتا ہے اور نہ افراد کو جماعتی زندگی سے کاٹ کر بالکل آزاد چھوڑتا ہے اور بلاشبہ اس کا معاشی نظام نفع بازی کی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانوں کی حاجت روائی کی اساس پر قائم ہے۔"(۲۶)

یہ اقتباس اسلامی نظام معیشت کا خلاصہ ہے کہ اسلام معاشرے میں اقتصادی امور کی اعتدال پسندی اور صدقات و زکوٰۃ کے حوالے سے ایسی تنظیم چاہتا ہے جہاں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر نہ ہو بلکہ دولت کی منصفانہ تقسیم میں افراد معاشرہ زندگیاں گزاریں اور وہ زندگیاں خوشحال و آسودگی کی صفات رکھتی ہوں۔

اس تمہیدی بحث کو سمیٹتے ہوئے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اسلامی عناصر ایک فرد اور جماعت کی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں اور اسلامی قرائن و اطوار والی زندگی ہی ایک خالص اسلامی معاشرت کو یقینی بناتی ہے۔ وہ مفکرین اور دانشور جو اپنی اسلامی فکر کو پاکستان اور اہل پاکستان کی تربیت اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی تشکیل کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں وہ پاکستان کو ریاست مدینہ کی پیروی میں قائم ہونے والی واحد نظریاتی ریاست سمجھتے ہیں اور وہ اس سماج اور تمدن کے وکیل ہیں جس کے لیے سرکار دوعالم اور ان کے خلفائے راشدین نے کام کیا ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان کا قیام ایک حادثہ نہیں تھا اور نہ ہی اس وطن کے لیے اسلام کا نعرہ ایک وقتی حکمت عملی تھی۔ پاکستان اسلام کے نظریاتی قوت کا اظہار تھا کیونکہ اس کا قیام اسلامی تعلیمات کا منطقی نتیجہ تھا۔ لہٰذا اسلام ہی کی اساس پر پاکستان کی نظری اور فکری عمارت کی بنیاد رکھی جائے گی اور یہ بھی اسی صورت میں تقسیم ہند کو ایک معتبر اور مستند دلیل بھی دی جاسکتی ہے وگرنہ مہابھارت کا بٹوارہ کرنا کچھ ضروری نہیں تھا غیر اسلامی ثقافت اور معاشرت کے ساتھ ہی اگر زندگیاں گزارنی تھیں تو پھر پاکستان کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ پاکستان ایک مسلمہ اسلامی ریاست کے طور پر معرض وجود میں آگیا ہے تو اب یہ لازمی ہے کہ بحیثیت قوم ہم ہر شعبہ زندگی میں خواہ وہ ادب ہو یا سیاست، معاشرتی اقدار ہوں یا ثقافتی روایات یا سماجی و اقتصادی و عمرانی مسائل ہوں مسلمان کے لیے تعلیمات اسلامی سے ہی ہر شعبے رہنمائی لینا لازمی ہے۔ اس حقیقت میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ اسلامی عناصر کی نشوونما اور نگہبانی ہی اس اسلامی ریاست کے تشخص اور بقا کی ضامن ہوگی۔

اسلامی عناصر اپنے مقاصد اور عزائم سے اسلامی نظام حیات کی اصل شکل کو سامنے لاتے ہیں جس سے پاکستان کی مملکت خداداد میں اس نظام حکومت کو نافذ کرسکتے ہیں جس کے لیے اس وطن کو حاصل کی گیا تھا۔ پاکستان کی حقیقی بنیاد چونکہ اسلام ہے اس لیے اس بنیاد کو بہر صورت مامون اور محفوظ کیا جانا چاہیے۔ اس فکر کے سوتے قرآن و سنت ہیں ان ہی سے کل معاملاتِ حیات اور اصول روزمرہ منضبط و مستنبط ہوں گے اور کیے جائیں گے۔ پاکستان میں اسلامی تعلیمات اور دستور

اسلامی سے کلی استفادہ کی راہ ہموار کی جائیں گی۔ آئے روز پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور روز افزوں زندگی کے معاملات کی گھمبیرتا سے بطریق احسن نمٹنے کے لیے ایک جدید اجتہاد کا نظام بھی قائم کیا جانا چاہیے۔ اسلامی نظام حیات اور آئین کے نفاذ کے نتیجے ہی میں اسلامی معاشی، اسلامی ثقافتی، اسلامی تہذیبی، اسلامی معاشرتی تنظیمات بھی صورت پذیر ہوں گی اور اسلامی اصولیات اور ملت کا تصور دلوں کو مسخر کرے گا اور اس عظیم سلطنت کی تشکیل ہو پائے گی جس کا خواب نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر کے شاعر علامہ اقبال اور سید جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا۔(۲۷) اور پاکستان کا مطلب اور مقصد یہ تھا کہ یہ خطہ ارضی عالم اسلام کو متحد و منظم کرے گا اور ساری اسلامی دنیا کی رہبری اور رہنمائی کرے گا اور اس کے باسی اسلام کو اوڑھیں گے اور اسلام پر اپنی حیات کی اساس رکھیں گے اور یوں مدنی ریاست کی یاد تازہ ہو گی اور اسلامیان اہل ہند اوج کمال پائیں گے اور اپنی قومیت پر فخر کریں گے۔ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو سونپیں گے۔ پاکستان کے منصب و وظیفہ کی تفہیم اسی صورت میں ممکن ہو پائے گی جب اسلامی عناصر کا معروضی انداز فکر اور حقیقت پسندانہ طور پر ڈھونڈا جائے گا اور ان کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے گا۔ ان اسلامی عناصر و تصورات سے پاکستان اور اسلام کے رشتے کی تعریف ہو پائے گی اس کی حدود متعین ہو پائیں گی تبھی پاکستان کی مستحکم تعمیر اور دوامی استحکام حاصل ہو پائے گا۔

فصل دوم

پاکستانی عناصر: تمہیدی مباحث

پاکستانی عناصر کا مطالعہ کئی جہات رکھتا ہے اور اس کے کئی مقاصد اور ثمرات بھی ہیں۔ پاکستانی عناصر کی تحقیق و تلاش کی اہمیت و افادیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے ان عناصر کے تعین و شناخت کے بغیر اس مملکت خداداد کے مستقبل اور حال کی سنوار ممکن ہی نہیں بلکہ اس ملک اور ریاست کی تاریخ اور عدیم النظیر ماضی کے تسلسل کی ضمانت بھی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ ہند کو جب پاکستان جیسی نعمت عظمیٰ ملی تو عوام ہی کو کیا احباب فکر و نظر کو لگا کہ تحریک پاکستان نے اپنا منطقی انجام پا لیا ہے۔ پاکستان کی نظریاتی اساس نے اپنی اصل صورت اختیار کر لی اور اب مسلمانان ہند نے ہنسی خوشی سے زندگیاں گزارنی ہیں اور بس، اور یہ بھی کہ اب اسلامی نظام خود بخود نافذ ہو جائے گا اور مسلم تہذیب اور ثقافت روز افزوں ترقی کرنے لگے گی اور اسلامی معاشرت خود بخود اشاعت پانے لگے گی۔ اسلامی تمدن

اور اسلامی ادب بھی اپنی روحانی طاقت اور غیبی قوت ہی سے پرداخت پائے گا، اسی لیے پاکستان بن جانے کے بعد مذکورہ پہلوؤں کو اہل فکر و نظر نے درخور اعتنا جانا ہی نہیں اور پھر پاکستان کے سب سے مستند اور مستحکم حوالے کو ہی پاکستان دشمن عناصر نے نشانہ بنایا یعنی نظریہ پاکستان کی اوٹ سے دو قومی نظریہ کے خلاف تشکیک پھیلانے کی مہم چلائی۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان سیاسی میدان میں بھی شدید بحرانوں کا شکار تھا۔ پاکستان اور پاکستانیت کو کسی نامعلوم دشمن کا سامنا بھی نہ تھا بلکہ اس کے دشمن نے بہانگ دہل کہہ دیا تھا کہ اس خطہ کو ہم چھے ماہ میں نیست و نابود کر دیں گے۔(۲۸) گو چند نہایت مخلص لوگوں کو اس مملکت خداداد کے معرض وجود میں آنے اور اس کے لیے اسلامیان ہند کی قربانیوں کا علم تھا ثانیاً وہ اس مملکت کے حقیقی منصب سے کاملاً آگاہ بھی تھے لیکن اس جانب کماحقہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ سید عبداللہ اپنی کتاب میں اس حوالے میں اپنی قوم کو بالعموم اور سوچ بچار کرنے والے احباب کو خصوص سے متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پاکستان بن جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں۔۔۔ کہ ہم کوئی کام ڈھب سے نہ کر سکے۔ ہماری قومیت کے قلعے کے شگاف صاف طور سے نظر آنے لگے ہیں۔ اس کا باعث یہی ہے کہ ہم نے سیاسی (مفادات ذاتی) سطح پر سب کچھ کیا مگر قوم کی ذہنی، روحانی اور جذباتی تربیت کی طرف توجہ نہ کی۔ بد قسمتی یہ رہی کہ مسلم لیگ کو ادیبوں اور دانشوروں کی رفاقت و تائید سے محروم رہی پھر نظریہ پاکستان کے حق میں علمی مواد تیار نہ ہو سکا جس سے اس ملک کی فلسفیانہ اساس قائم ہو سکتی۔ لہٰذا پاکستان محض سیاسی کارنامہ بن کر رہ گیا، اسے ایک فکری یا روحانی حقیقت بننے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔"(۲۹)

اس خام خیالی نے پھر وہ گل کھائے کہ الامان و الحفیظ۔ اگر پاکستان کے بنتے ہی ان عناصر کو معلوم کر لیا جاتا اور ان کی شناخت کے بعد ان کو محفوظ کرنے اور ان کے باقاعدہ اشاعت و ترویج پر انفرادی یا اجتماعی کام ہوتا رہتا تو آج کی پاکستانی قوم کو کوئی بھیڑ کہہ کر نہ پکارتا۔ اب یہ کام ناگزیر ہو گیا ہے کہ پاکستانی عناصر کو تلاش کیا جائے اور پھر ان کو معروضی انداز میں اہل پاکستان اور غیر پاکستانیوں تک پہنچایا جائے تاکہ پاکستان کی ایک الگ اور جدا شناخت بن سکے۔ یہ وجہ ہے کہ پاکستانی عناصر کی حدود اور شناخت عہد حاضر کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کئی محبان وطن اور چند ایک ادارے بھی اس کام میں مصروف ہیں۔ اس کام کو پاکستان سے محبت کرنے والے جہاد قرار دیتے ہیں۔(۳۰)

پاکستانی عناصر کی پہچان

بحث کی جانب بڑھتے ہوئے کہ پاکستانی عناصر سے مراد وہ عناصر ہیں جو پاکستان اور پاکستان سے متعلق ہوں اور اس وطن کے جداگانہ تشخص کی ایک معتبر شناخت اور مستند پہچان کا حوالہ بنتے ہوں یا بن سکتے ہوں، ان کو پاکستان عناصر کے نام سے معنون کیا جائے گا۔ پاکستانی عناصر تقسیم ہند کے بعد اس نئی ریاست کے قیام کے ساتھ معرض وجود میں آئے اور اس نئی قومیت اور اس کی تہذیب، تمدن اور کلچر کی شناخت کا حوالہ بنے۔ تقسیم ہند سے قبل مسلمانان ہند کی پہچان ہندوستان ہی تھا اور جغرافیائی حوالہ ہی باعث شناخت بھی تھا۔ مگر جب اسلامیان ہند نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی چاہی اور پھر نیا وطن معرض وجود میں آیا تو اسلامی اقدار اور کلچر اور معاشرت وغیرہ پاکستانی بن گئیں۔ اب جو جو عوامل، حوالے اور روایات پاکستان سے متعلق ہیں یا ہوں گی وہ سب پاکستانی عناصر کہلائیں گی۔

دو قومی نظریہ: توضیح و تشریح

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایک نظریہ یعنی ''دو قومی نظریہ'' کی منطقی دین ہے۔ اس نظریہ نے ہندی مسلمانوں کو اپنی انفرادیت اور الگ تشخص کا دھیان دیا۔ دو قومی نظریہ نے برصغیر نے مسلمانوں ایک الگ ریاست کے حصول کا تصور دیا ۔ دو قومی نظریہ پر بات کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنی تقریر ۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو کہا تھا:

> ''ہندو کیوں نہیں سمجھتے کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اقلیت اور اکثریت کی بات ہی نہیں ہے۔ مساوی حیثیت کی قومیں ہیں، تم بھی قوم ہو اور ہم بھی قوم ہیں۔ چھوٹی بڑی کوئی نہیں ہے۔ ہمارا فلسفہ زندگی مختلف ہے۔ کلچر مختلف ہے، ہمارا خدا ایک ہے۔ تمہارے سات کروڑ خدا ہیں۔ ہمارا کھانا پینا مختلف ہے، مسٹر گاندھی دال بھات کھاتا ہے، ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں جو اس کی ماتا ہے۔ ہماری تاریخ علیحدہ ہے۔ ہمارا ہیرو، ان کا دشمن ہے اور ان کا ہیرو ہمارا دشمن ہے، ہمارے فیض کے چشمے جدا جدا ہیں تو پھر ہم ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں۔''(۳۱)

یہ دو قومی نظریہ جو پاکستانی عناصر میں سب سے اولین درجہ رکھتا ہے کا خلاصہ یہی ہے جو قائداعظم نے آسان اور واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ بلکہ قائداعظم کئی اور جگہوں پر بھی اس دو قومی نظریے کو مکمل وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ ہندی مسلمان، ایک قوم ہیں اور مکمل قوام رکھنے والی قوم ہے۔ اسی لیے دو قومی نظریہ کو پاکستانی عناصر

میں اولیت اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔اس باب میں اس عہد کے دانشوروں نے عام مسلمان کو اس مغالطے میں ڈال دیا تھا کہ ہندی مسلمان خود کو ہندوستان میں ایک اقلیت سمجھ بیٹھے تھے۔اس ضمن میں ایک اقتباس نواب بہادر یار جنگ کا اس بات کا بین ثبوت ہے،وہ اپنی تقریر میں کہتے ہیں:

> ''قائد اعظم نے جس وقت لیگ کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی،ہمارے دماغوں پر مختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے،برادرانِ وطن نے بانداز دوستی ہم کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں۔یہ احساس کمتری ہر چھوٹے بڑے میں سرایت کر گیا تھا۔قائد اعظم نے ہم کو بتایا کہ ہم اقلیت نہیں ہیں۔دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلا سکتی ''تم ایک قوم ہو،مستقل قوم،جس کے قوام اقوامِ عالم سے بالکل مختلف اور جدا ہے اور جس کی بنیاد و ترتیب،جغرافیہ،نسل و رنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔''(۳۲)

یہ وہ فکری ابہام تھا جس سے ہندی مسلمانوں کو نکالنے کا سہرا اس عہد کے مسلمان رہنماؤں کے سر ہے جن میں سر فہرست کا قائد اعظم اور علامہ اقبال ہیں جنھوں نے اس سوئی ہوئی قوم کو جگایا اور یہ باور کرایا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں جن کا ایک ساتھ رہنا اس لیے ن ممکن ہے جس پر روشنی قائد اعظم نے خود ڈال دی اور دوسری وجہ یہ کہ مسلم اور ہندو قوم کا ایک ساتھ رہنا مغربی طرز جمہوریت میں بھی ممکن نہیں اور یہی سچائی تھی جس کی نشان دہی علامہ اقبال نے بھی کی ہے۔اب پاکستان ایک ناگزیر ضرورت بن چکا تھا جس کے لیے بر صغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور آج بھی پاکستان کے ساتھ جڑی امیدیں اور ملت کی آرزوئیں اسی وقت پوری ہو پائیں گی جب اس وطن عزیز کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں محفوظ ہوں گی۔ان کے تحفظ اور بقا کے لیے دو قومی نظریہ کی پہچان اور اس کی حقیقت کو اپنی قوم کے دلوں میں راسخ کرنا ہو گی تبھی یہ اٹل حقیقت منوائی جا پائے گی کہ ہندوستان کی تقسیم صرف زمین کا بٹوارہ نہ تھا بلکہ ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا حیثیت دینے اور منوا لینے کی تحریک تھی جس نے بھارت ماتا کو بانٹ کر اپنا آپ منوایا۔

پاکستانی ثقافت اور اس کے تشکیلی عناصر

پاکستانی عناصر کے حوالے سے مطالعہ میں دوسرا سب سے بڑھ کر جو عنصر سامنے آتا ہے وہ 'پاکستانی ثقافت' ہے۔ ۱۴اگست ۱۹۴۷ میں معرض وجود میں آنے والی یہ نظریاتی پاکستان در حقیقت مدینہ المنورہ کی مملکت کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ اس ریاست کا سب بڑا محرک اور اسلامیان ہند کی جدا اور منفرد پہچان کو محفوظ کرنا تھا اور یہ پہچان اور نشانی کوئی اور نہ تھی بلکہ اسلامی ثقافت تھی جس کے ہر رنگ اور انداز کو مسلمان مامون کرنا چاہتے تھے۔ جیسے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بقول علامہ اقبال:

> "ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہے۔ پس یہ امر کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کیے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے لہذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہند قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ملا دیا جائے۔"(۳۳)

علامہ اقبال کے اس مطالبے کا مقصد اولیٰ یہ تھا کہ یہ ریاست اسلامی تقاضے اور اسلامی نظام حیات، اسلامی ثقافت کو مامون کرے گی جو گذشتہ کئی صدیوں سے اس سرزمین میں پرورش پا رہی ہے۔ پاکستانی عناصر کے حوالے سے پاکستانی ثقافت کے خدوخال اور تشکیلی عناصر کا مطالعہ جہاں پاکستانی ثقافت کے ثروت مندی کو متعین کرے گا، وہیں تشکیلی عناصر کی شناخت بھی کر پائے گا۔ اسی تعین عناصر سے پاکستانی ثقافت کے فروغ اور ترویج میں خاصی مدد ملے گی۔ سید عبد اللہ اسلامی ثقافت کی ترویج و اشاعت کا کلیہ یوں بتاتے ہیں:

> "ثقافت، صرف خارجی مظاہر کا نام ہے، نہ عادات کا صرف خارجی روپ ہے۔ ہر ثقافت کی ایک داخلی روح ہوتی ہے۔ لہذا قومی ثقافت کے لہجے یا اسلوب میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک افکار عقائد کی داخلی سطح میں تبدیلی میں کوئی انقلاب رونما نہ ہو، ثقافت دراصل افکار و عقائد کا تابع ہے اس لیے اگر رنگ ثقافت کو بدلنا مقصود ہے تو روح افکار میں تبدیلی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"(۳۴)

اس باب میں سید عبد اللہ یہی چاہتے ہیں کہ پاکستانی ثقافت اپنے ظاہری اور باطنی ہر دو روپ میں اسلامی تہذیبی اور تمدنی سر چشمہ سے فیض یاب ہو اور علاقائی مسلم ثقافتوں کو تحفظ دیتے ہوئے پاکستانی کلچر کو فروغ اور اشاعت دی جائے۔

پاکستان کے ساتھ ایک بڑی ذمہ داری اس ہند اسلامی ثقافت کی بقااور ترقی بھی ہے جوبیک وقت پاکستان کی پہچان اور تشخص کا فریضہ بھی انجام دے رہی ہے اور ساتھ ہی اس وطن خداداد کے بسنے والوں کو باقی سب حوالوں سے بری کرتے ہوئے اس نئی پہچان پر فخر اور نازاں بھی کر رہی ہے۔ تیسری زاویہ اس کا اسلام کا بول بالا بھی ہے کہ جو قیام پاکستان کا اصل محرک ہے اس ضمن میں مولانا عبد الستار نیازی کی رائے ملاحظہ کیجئے:

> "پاکستان محض زمین کے ٹکڑے یا کسی خاص اسنائی گروہ کے اقتدار کا نام نہیں بلکہ پاکستان ایک ضابطہ حیات ہے۔ یہ ضابطہ حیات اسلام ہے۔ اسلام صرف چند مذہبی اصول ہی پیش نہیں کر تا بلکہ الہیات، اخلاق معاشرت حکومت، تعزیر، عدل، لین دین کے لیے بھی ایک مخصوص نظام تجویز کرتا ہے۔"(۳۵)

مولانا نیازی کی رائے صائب ہے کہ پاکستان وجود میں آجانے سے مشن مکمل نہیں ہوا بلکہ اصل مشن حقیقی معنوں میں شروع ہوا ہے کہ اسلام کے نام حاصل ہونے والا یہ پاکستان اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ کے ساتھ ساتھ پاکستانی ثقافت کا محافظ اور فروغ اور وسعت دینے والا بنے گا۔ اسلامی ضابطہ حیات سے مراد پاکستانی ضابطہ حیات ہے اسی طرح پاکستانی ثقافت، پاکستانی حدود، پاکستانی معاشرت، پاکستانی فکر، پاکستانی لباس، پاکستانی شادی، پاکستانی موسیقی، پاکستانی صنعت، پاکستانی مصوری، اور پاکستان ادب جیسی اصطلاحیں پاکستان کی پہچان اور پاکستان کی ساکھ کو بڑھائیں گی۔ پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کا تحقیق مطالعہ ایک ضروری امر اس لحاظ سے بھی ہے کہ یوں اس ثقافت کے فروغ کو اس کی راہ میں ممکنہ رکاوٹوں کو ہٹایا یا کم کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کی ثقافت کے تشکیلی عناصریوں تو بہت سے ہیں لیکن جن چند عناصر کو بطور خاص اس مقالے میں زیر مطالعہ لایا جائے گا ان میں نظریہ حیات کے اثرات و ثمرات، فلسفہ تطہیر زندگی، مذہب رواداری، اعتدال پسندی اور میانہ روی، آزادی اظہار رائے، نظام سیاست کا اثر، زبان، فنون لطیفہ اور ہندی اثرات وغیرہ شامل ہوں گے۔

پاکستانیت

پاکستانیت کی اس اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ پاکستان سے وابستہ ہر نظریہ، ہر چیز، ہر حوالہ خواہ اس کا تعلق سماج، معاشرت، معیشت، عمرانیات، اقتصادیات، تہوار، اقدار و روایات، رسوم رواجات، ضابطہ ہائے حیات اور موسیقی،

رقص، ادب، علاقائی حوالے غرض سب کچھ جو ایک زندگی کی رنگارنگی اور ہمہ ہمی میں آتا ہے یا آسکتا ہے پاکستانیت کہلاتا ہے۔ سید عبد اللہ پاکستانیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> "پاکستانیت، محض سیاسی، جغرافیائی اصطلاح نہیں بلکہ اس کے کچھ تہذیبی نظریاتی معنی بھی ہیں جن کا براہ راست تعلق ہماری مسلم قومیت اور نظریہ پاکستان سے ہیں۔ پاکستانیت کسی علاقائی مزاج کا نام نہیں اس سے مراد ایک مجموعی مسلم مزاج ہے جو ہزار سالہ تاریخ میں کل مسلمانان ہند نے بین الاقوامی اسلامیات کے تحت ڈھالا جس میں پوری ہندی اسلامی تہذیب آجاتی ہے۔ پاکستانیت کے سیدھے سادے معنی یہ ہیں کہ ادب میں وہ قومی روح منعکس کی جائے جو نظریہ پاکستان میں موجود ہے۔"(۳۶)

دوسرے لفظوں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام عوامل، پہلو اور زاویے جن سے پاکستان کی ساکھ یا پہچان اور پاکستان کے نام کا سکہ بنتا ہے اور جن کے ذریعے اس مملکت کے کلچر اور تمدن اس کے تمام ضابطہ ہائے حیات کا لوہا دنیا میں منوایا جاسکتا ہے ان کا نام پاکستانیت ہے۔ اس اصطلاح کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اور اس کے ساتھ زندگی کے رشتے کو بھی مزید واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبد اللہ یوں لکھتے ہیں:

> "پاکستانیت کا رشتہ وہ ناگزیر رشتہ ہے جس کے بغیر اپنا فریضہ انجام دے سکتا ہے نہ قومیت کی جڑیں معاشرے میں مستحکم ہو سکتی ہیں۔ ہمارے لیے قومیت اور پاکستانیت مترادف الفاظ ہیں۔ یہ پاکستانیت صرف سیاست کے امور تک محدود نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کے کل شعبوں تک ہے۔ پاکستانیت ایک مسلک اور مشرب بن کر زندگی کے باقی شعبوں کی طرح ادب پر بھی چھا جائے۔ یہ پاکستانیت بھی پاکستانی عناصر میں بڑی اہمیت رکھتا اور نئے تصور ہونے کی وجہ سے اپنی ترویج اور معنوی وسعت کا متقاضی بھی ہے۔"(۳۷)

غرض پاکستانیت سے مراد یہ ہے کہ اس نوزائیدہ مملکت کا ہر تعارف اور شناخت کا ہر حوالہ پاکستانیت ہے۔ سبز رنگ کے جھنڈے پر سفید رنگ چاند ستارہ اس ملک کی خاص پہچان ہے اسی طرح صادقین کی خطاطی اور چغتائی کی مصوری، پنجاب کی بسنت کی بہار، قومی پرندہ چکور، قومی جانور مارخور، قومی کھیل ہاکی، قومی لباس شلوار قمیض اور کرتا پاجامہ، غیر ساڑھی لباس یہ سب پاکستانیت کے ظاہری قرائن ہیں اسی طرح دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی پاکستان کے رہنے والے اپنی الگ پہچان اور حوالے کے لیے کام کر رہے ہیں جیسے سیالکوٹ کے آلات جراحی، کھیلوں کا سامان، وزیر آباد کے سٹیل اور سلور کے

ظروف اپنا ایک مستند حوالہ رکھتے ہیں بالکل اسی طرح پاکستان کے موسیقار،ڈرامہ اور فلم ساز بھی پاکستانیت کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں اور اپنے وطن کی پہچان کا قابل عزت حوالہ بنا رہے ہیں۔ ادیب، شعرا،ڈاکٹر،انجنیئر،سافٹ ویئر انجنیئر اور دستکار سبھی اپنے اپنے محاذوں پر پاکستانیت کے علمبر دار ہیں۔

پاکستانی قومیت

پاکستان وہ سر زمین ہے جو صدیوں سے آباد رہی ہے اور یہاں گندھارا، اباسین، بدھ مت اور سکھوں کی بسنے اور حکومتیں کرنے کی مستند تاریخ اور محفوظ آثار موجود ہیں۔اس دھرتی میں بڑی بڑی قومیں آباد رہیں اور آج بھی ان کے آثار اور نشان عام ملتے ہیں لہذا یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ یہاں کے آج کے باسی ان عظیم قوموں کی اولاد ہوں یا نہ ہوں، اس علاقے میں رہنے کی وجہ سے بادل نخواستہ اس تہذیبی اور تمدنی دھارے کے اثرات سے مامون نہیں رہ سکے ہوں گے۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ پاکستان میں اقلیتیں کی موجودگی بہت کم ہے لیکن ان کو اس قومیت یعنی پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور وہ بھی اس ملک کے باسی اور شہری ہیں لیکن پاکستان میں ہندی تہذیب دھارے پر اسلامی اثرات خاصے نمایاں اور واضح اس لیے بھی ہیں مسلمانوں کے طرز حیات کے تقاضے اور مطالبے جدا ہیں لہذا جن علاقوں میں اس ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے ان علاقوں میں اسلامی تمدن اور معاشرت کی وجہ سے اسلامی کلچر کے اثرات زیادہ اور نمایاں ہیں۔

پاکستان میں آباد قبائل اور مقامی قومیتیں بلا تخصیص مذہب، مقامی زبان، علاقہ، مقامی ثقافت و تمدن ایک بڑی ڈوری سے بندھی ہوئی ہے جس کا نام پاکستان اور اسلام ہے۔ یہ ڈور ان تمام مقامی قومیتوں اور علاقائی تنوعات اور مقامی مذاق اور تقاضوں کو ایک نقطہ پر متصل کرتی ہے جس کو عرف عام میں پاکستانی قومیت کی اصطلاح میں بیان کیا جاتا ہے۔یہی مقامیت پاکستان کی ثقافت کو دیگر اسلامی ثقافتوں سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے۔

اب ان علاقائی زبانوں ان کے ادب، علاقائی ثقافتوں اور ان کے اپنانے والوں کو، لوک ادب کے باہمی تعلق اور رشتے کو پاکستان اور پاکستانی ادب سے جوڑنا اور ایک مستحکم قومیت کے خدوخال کو اجاگر کرنا اور علاقائیتوں کو مرکز سے جوڑنا بہت ضروری ہے۔ پاکستان کی قومیت کی روایتی اور جدید تعریف کرنا اور قومیت کے اصول وضوابط کو دیگر ملکی قومیتوں تک پہنچانا بھی پاکستانی عناصر میں ایک خاص عنصر ہے۔ پاکستان کے دانشوروں اور متکلمین کو چاہیے کہ پاکستان کی قومیت کی

روایتی تعریف کریں اور اس کی حدود پر غور کریں اور عہد جدید کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید ضرورتوں کے مطابق اپنی قومیت کو ڈھالنے کی سعی کریں اور قومیت کے لیے نئے اصول وضوابط تشکیل دیں تاکہ پاکستانی قوم اور قومیت کی شناخت دیگر ملکی قومیتوں سے جداگانہ پہچان پاسکے۔(۳۸) اس باب میں ان نیم حکیم اور بداندیش وکم فہم لوگوں سے بھی ہوشیار رہناہو گا جو بظاہر حب وطن کے داعی ہیں لیکن درحقیقت پاکستان کی شناخت اور اتحاد اور شعار اسلامی کے لیے بغض لیے ہوئے ہیں اور جو اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے مقامی قومیتوں (بلوچی، پنجابی، پشتون، سندھی، کشمیری) کو نشانہ بناتے ہیں اوران علاقائی عصبیتوں سے مدد لے کر پاکستان کو کمزور کر رہے ہیں جبکہ علاقائی ثقافتوں، وراثتوں اور اقدار ورواجات کو پاکستان کی اجتماعی شناخت میں جگہ اور مقام دیناہو گا جیساکہ ان مقامی علاقائیتوں کی شیرازہ بندی کے حوالے سے چوہدری چوہدری نیاز احمد سیگھیڑہ لکھتے ہیں:

> "پاکستان میں مقامی قومیتوں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔یہ ہزاروں سال سے اکھٹی رہ رہی ہیں ان کے درمیان مستحکم قومیتی رشتے قائم ہیں۔پاکستان مقامی ثقافتی قدروں کا گہوارہ ہے۔پاکستانی عوام کی (بلاتخصیص) آخر حقیقی قومی تعمیر ہونی ہے جو پاکستانی عوام کے ہی ہاتھوں سے ہوتی لیکن ایک شرط پر کہ انہیں اپنی شناخت خود کرنی ہو گی۔"(۳۹)

چوہدری صاحب کے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ مقامی ثقافتوں اور رسوم ورواجات، مقامی قومیتوں کے اپنی ثقافتی قدروں 'لوک ورثہ 'لوک ادب اور دیگر تمدنی روایات کے ساتھ پاکستانی قومیت کے دھارے میں شامل ہونا ہے یوں پاکستان کو قومیت کا احساس اور اس کے ثمرات حاصل ہوں گے۔جس سے اس مملکت کا منصب اور وظائف پورے کیے جاسکیں گے۔ یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے یہ علاقائی ثقافتیں پاکستان کی اجتماعی ثقافت کے ہی رنگ اور انداز ہیں اور ان کے بنا پاکستان کا اصل چہرہ مسخ ہو جائے گا ثانیاً پاکستان کی اجتماعیت کو بھی زک پہنچ سکتی ہے۔

قومی زبان اردو

پاکستانی عناصر میں ایک بہت اہم قومی زبان اردو ہے۔اردو ایک اساسی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کی سب سے خاص اور بڑی نشانی کے طور پر اردو زبان کو مانا جاتا ہے۔اس زبان کو ہندوؤں نے تختہ ستم بنانا چاہا۔(۴۰) مسلمانان ہند نے اردو کے تحفظ کا بیڑہ اٹھایا اور اردو کو اپنالیا اردو ادب کا شمار ایک ثروت مند زبان کے ادب میں ہوتا

ہے۔ اردو نے تحریک پاکستان میں بھی اپنا خاص اور اساسی کردار پہچانا اور ادا کیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سمیلین کے اجلاس میں موہن داس گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"اردو (زبان) کو مسلمان بادشاہوں نے ترقی دی۔ اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس کی پرورش کریں۔"(۴۱)

یہ اس عظیم ہندو رہنما کی فہم تھی کہ جو اس زبان کے ثقافتی اہمیت کو نہ پہچان سکی اور اردو کو اپنی کج فہمی کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف پھینک کر ہند اسلامی ثقافت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا حالانکہ یہی اردو ہندو مسلم کے اتحاد کا سب سے مضبوط اور محکم وسیلہ تھی۔

تحریک پاکستان ہو کہ قیام پاکستان کے بعد کی کتھا اردو ایک خاص پاکستانی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زبان کو ہندوؤں نے رد کیا(۴۲) تو مسلمانان ہند نے اردو کے سینے سے لگایا گو اس زبان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں تھا لیکن ہندو قوم نے اس کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اسلامیان ہند میں اردو زبان کے مقام اور حیثیت کے بارے میں قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد کبھی بھی کسی بھی پلیٹ فارم پر دو رائے نہیں رکھی گئیں۔ حکمران طبقہ ہو یا بیوروکریسی یا عوام الناس، اردو سے محبت کرتے ہیں اور اس زبان کو قومی دفتری اور سرکاری زبان کے طور پر دیکھنے کے خواہاں ہیں مگر بدقسمتی سے یہ زبان اپنے حقیقی مقام کو تا حال حاصل نہیں کر سکی لیکن ان کے باوجود اردو پاکستانی عناصر میں خاص اور بلند مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ظہور اعوان لکھتے ہیں:

"قومی تشخص (پاکستانی عناصر) کے اظہار کی چند علامتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم زبان ہے۔ زبان قوم کی پہچان ہے۔ اس کی تہذیب وتمدن، ذہن ودماغ اور فکر وثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کسی قوم کے خرد وشعور کے اظہار کا پیمانہ زبان ہوتی ہے۔ آئینی طور پر پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کہ اور یہ حوالے اردو زبان کے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان پاکستانی عناصر میں سب سے خاص ہے گو اس کو وہ حیثیت مل نہیں سکی لیکن اس کا مقام بلاشبہ اپنی جگہ مسلم ہے۔"(۴۳)

اس حوالے سے یا اس امر سے بھلا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان میں کئی افراد انفرادی اور ادارے اجتماعی طور پر اردو کے نفاذ کے لیے سر توڑ کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اردو نے نفاذ کے لیے غیر حکومتی اور غیر سرکاری سطح پر کانفرنسیں منعقد

کرائیں گی، ادبی اور صحافتی میدانوں میں بھی جہاد کیا گیا کیونکہ اردو ایک کلیدی پاکستانی عنصر ہے۔ اردو کے نفاذ میں تاخیر اور رکاوٹوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ”غرض یہ کہ اردو کی مخالفت کے اسباب چند در چند ہیں۔ اول مسلم تشخص، دوم علاقائی فلسفے کی رو سے وحدت و کثرت کا مسئلہ، سوم یہ خیال کہ اردو اسلامی سلطنت کے زمانے کی یاد دلاتی ہے اور جمہوری تصور کے خلاف ہے، چہارم بعض اردو بولنے والوں کے متعلق یہ شکایت کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہیں اور ان کی بہتری زبان دانی مفادات میں علاقوں کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔“(۴۴)

یہ اقتباس تحریک نفاذ اردو کا خلاصہ ہے کہ اس تحریک کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر کو کن کن مشکلات اور جھمیلوں سے واسطہ پڑا اور کس طرح اس مشن کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لیے کوششیں کی گئیں۔ آج بھی مخلص احباب اور ادارے بڑی سنجیدگی اور اخلاص سے اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ادبی اور سیاسی محاذوں پر اس کے لیے کام کیا جا رہا ہے۔

افکار قائد اعظم

قائد اعظم محمد علی جناح، بابائے قوم ہیں۔ تحریک پاکستان ان کے بغیر شاید ہی کامیابی سے ہمکنار ہو پاتی۔ علامہ اقبال وہ شخصیت تھے کہ جس نے ان کے قد کاٹھ کو پہچان لیا اور ان کو قائل کیا کہ کہ آپ مسلمانان ہند کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھائیں۔ قائد اعظم نے جب یہ بھاری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی تو ہندی مسلمان مایوسی اور پستی کی گہرائیوں میں گر چکے تھے۔ کم فہم اور کوتاہ اندیش نام نہاد رہنماؤں نے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا تھا وہ ایک اقلیت ہیں اور مغربی طرز حکومت میں ان کی حیثیت بہت معمولی ہے۔ یہ بھی کہ مسلمانوں کو ایسے دیس میں نہیں رہنا چاہیے جہاں انگریزوں کی حکومت ہو وغیرہ۔ دوسری طرف ہندو کی متعصب سوچ اور منافقانہ طرز عمل بھی مسلمانوں کے وجود کو ہندوستان سے مکمل نابود کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ ایسی نازک اور پر خطر صورت حال میں مسلم لیگ کا معرض وجود میں آ جانا ایک سیاسی معجزہ ضرور تھا لیکن اس سے بڑی انہونی قائد اعظم محمد علی جناح کا مسلم لیگ کی بھاگ ڈور سنبھالنا تھا۔

قائد اعظم کی ذات ایک وجہ عزو شرف تو ہے ہی ان کے افکار بھی پاکستان قوم کے افراد کے لیے مشعل راہ ہیں۔ قائد اعظم نے پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا تو مسلم لیگ ایک کم فعال سیاسی جماعت تھی آپ کے آنے سے اس جماعت نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور ان کو بتایا کہ ہندو کبھی بھی مسلمانوں کو ان کی الگ شناخت کے ساتھ

برداشت نہیں کریں گے جو قوم اردو کو اس لیے دیس نکالا دے رہی ہے کہ وہ اسلامی عہد حکومت کی نشانی ہے تو وہ ان مسلمانوں کو کیوں کر برداشت کریں۔ قائد اعظم نے اپنے سیاسی اور مذہبی افکار کا اظہار گاہے بگاہے کیا ہے اور وہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر دیکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ اسلام اور پاکستان کو مترادف جانتے تھے اور وہ اسلامی اتحاد میں پاکستان کے کردار اور پاکستان کی جغرافیائی اہمیت سے کاملاً آگاہ تھے اور ان کی تقاریر ان کے مسلک، فہم، ادراک اور شعور کی گواہی دیتی ہیں۔ پاکستان کا مستقبل اور کردار اور ہماری خاجہ پالیسی کے رہنما اصول حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ پاکستان کے لیے افکار قائد سے رہبری ایک سودمند حکمت عملی ہوگی۔

فنون لطیفہ

ہر قوم اپنے الگ مذاق اور مزاج مالک ہوا کرتی ہے۔ انہی میلانات اور رجحانات کے نتیجے میں وہ قوم اپنی تمدنی تنظیمات اور معاشرت کے ظاہری اور باطنی اسالیب کو متعین کرتی ہے۔ فنون لطیفہ (fine arts) کسی بھی قوم کے انہی تمام اوصاف کا ظہور ہوتے ہیں۔ مصوری، خطاطی، موسیقی، مجسمہ سازی، ناچ اور عمارات اور باغات وغیرہ کی تعمیر بھی اسی شعبے میں شمار ہو جاتی ہے۔ فنون لطیفہ در حقیقت کسی قوم کی ثقافت کی دین (product) ہوتی ہے۔

اصطلاحات

سید عبداللہ کے اسلامی اور پاکستانی عناصر کے مباحث میں کچھ اصطلاحات بھی موضوع بنیں گی جن کو اس کے استعمال اور ذکر کے وقت یا اور جگہ پر مناسب توضیح اور وضاحت سے لکھ دیا جائے گا تاکہ ان اصطلاحات کا سیاق وسباق بہتر طور پر واضح ہو سکے۔ اسلامی عناصر کے باب یہ اصطلاحات مثلاً ذہنی غلام، رد بدعت، تداخل افکار، ملی ہستی کا تحفظ، اسلامیت وغیرہ پڑھنے کو ملتی ہیں۔ پاکستانی عناصر کے باب میں بھی چند اصطلاحات یہ خاص معنویت رکھتی ہیں مثلاً نظام اصولیات، علاقائیت، صوبائیت، پاکستان گیریت، تمدنی تنظیمات، منسوخ معاشرت، ہم شہری، پاکستانیت، زمینی نظریہ اور پاکستانی کلچر وغیرہ۔

غرض اس باب میں اسلامی اور پاکستانی عناصر کا ایک اجمالی تعارف اور جامع عناصر کی وضاحت اور فہرست مقصود تھی۔ یہ دونوں کام مقدور بھر وضاحت سے ضبط تحریر کیے گئے اور آنے والے ابواب میں انہی عناصر کو تفصیل و ترتیب کے ساتھ قلم بند کیاجائے گا اور موضوع مقالہ کو تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے جانچا اور پرکھا جائے گا۔ آئندہ ابواب میں ان دونوں یعنی اسلامی عناصر اور پاکستانی عناصر کی تفصیلی اور توضیحی بحث بحوالہ سید عبد اللہ کی جائے گی اور ان کی نثر میں پائے جانے والے عناصر کی اہمیت اور قدر کی تعین کی سعی کی جائے گی۔ اس موضوع کا ایک سبب یہ بھی تھا اسلام اور پاکستانیت کی مساوات سے بننے والے شعور اور احساس تفاخر کو قوم تک پہنچایا جائے اور اس وسیلے سے قومیت کے حقیقی احساس کو اہل پاکستان کے اندر اجاگر کیا جا سکے قومی سطح پر ان دونوں عناصر کی دین سے پاکستانی تشخص پیدا ہو گا جو ادب، صنعت، تجارت، صحافت، تعلیم، فنون لطیفہ، مصوری، مجسمہ سازی، خطاطی، موسیقی، ثقافت، معاشرت، معیشت اور عدالت و میڈیا کو پاکستان کی شناخت دے گا۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستانی فرد کو اس کی قومی، ملکی، ریاستی، ملی ذمہ داریوں اور فرائض و وظائف سے آگاہی دے گا۔ صوبوں کی ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی میں یہ پاکستانیت ایک اتحاد، شیرازہ بندی، یکجائی، یگانگت اور یک رنگی کی ضمانت بنے گی۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان اسلامی دنیا میں بھی ایک کلیدی اور بنیادی کردار ادا کر پائے گا۔ پاکستان مسلمان دنیا میں ایک مفاہمتی اور اساسی کردار بھی نبھائے گا جس کا مقصد اس اسلامی دنیا کو متحد اور منظم رکھنا ہو گا۔

اسلامی اور پاکستانی عناصر کے مطالعے کی ضرور اوراہمیت عہد حاضر میں اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کی آزادانہ روش ملکی حالات کی ابتری اور سیاسی و معاشی تنظیمات کی کمزوریوں نے عوام الناس کو بد دل اور ناامید کر دیا ہے۔ ایسی ہوا چل نکلی ہے کہ نئی نسل اپنی کی اہلیتیں لے کر یورپ اور کنیڈا میں ہجرت کر رہی ہے بلکہ ان مغربی ممالک میں اس نسل کے لیے شہریت کی ایک دوڑ شروع ہو چکی ہے۔ کم علم، کج فہم اور برائے نام مفکرین اور دانش ور اس جلتی پر تیل ڈالنے میں یوں مصروف ہیں کہ وہ پاکستان، نظریہ پاکستان، قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے حوالے سے شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستان اور اس کے وجود کو بے دلیل کرنے میں دیگر اسلام اور پاکستان دشمن عناصر کی معاونت کر رہے ہیں۔ اسلام سے دوری کو روشن خیالی، جدیدیت اور اعتدال (moderation) کا نام دیا جا رہا ہے پاکستان اور اہل پاکستان کو اسلام سے دور لے جانے کے لیے دور دور کی کوڑیاں لائی جا رہی ہیں۔ لیکن یاد رہے بابائے قوم نے ۱۹۴۴ء طلبائے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''اسلام ہمارا رہنما ہے اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے۔ ہمیں کسی سرخ یا پیلے پرچم کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمیں سوشل ازم، کمیونزم، نیشنلزم یا کسی دوسرے ازم کی ضرورت ہے۔''(۴۵)

ایک اور جگہ یوں فرمایا تھا:

> ''آپ نے سپاس نامے میں مجھ سے پوچھا ہے کہ پاکستان کا کون سا قانون ہو گا؟ مجھے آپ کے سوال پر سخت افسوس ہے۔ مسلمانوں کا ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب ہے۔ یہی مسلمانوں کا قانون ہے اور بس۔ اسلام پاکستان کے قانون کی بنیاد ہو گا اور پاکستان مین کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہو گا۔''(۴۶)

بحث کو سمیٹتے ہوئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اور پاکستانی عناصر کا مطالعہ عمومی طور پر جہاں پاکستان کی نظریاتی حدود کا تعین کرتا ہے وہیں اس امر کو بھی یقینی بناتا ہے کہ پاکستان اور اسلام ایک کتاب کے دو باب ہیں اور ایک دوسرے کے بنا نامکمل بھی ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہاں ان دونوں عناصر کا معروضی مطالعہ جہاں ان کے خیالات اور افکار سے روشناس کرائے گا وہیں ان عناصر کی توضیح و تشریح پاکستانیت اور اسلامیت کی حدود کا بھی تعین کریں گی۔یوں پاکستان اور اسلام کے مابین رشتے کو دلیل اور تقویت ملے گی اور اسلام اور پاکستان کے نام پر فخر کا احساس دلوں میں جنم لے گا اور اہل پاکستان میں اپنی قومیت اور اپنی ملت کے لیے غیر مشروط حب پیدا ہو گی۔ سید عبداللہ کے نظام فکر سے بھی کامل آگاہی ہو گی اور ان کی اس باب میں کی گئی خدمات کے وقعت و وسعت کا پتا بھی چلے اور تحقیقی اور تنقید معیائیر کی قدر شناسی کی سعی بھی کی جا سکے گی۔

حوالہ جات

۱)ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۸۱

۲)ڈاکٹر سید عبد اللہ، مقامات اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۴۵

۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، مکتبہ خیابان لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۴۵

۴) عطش درانی، پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۵

۵)سبط حسن، ادب اور روشن خیالی، دانیال پبلی کیشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۸

۶)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۷

۷)میاں عبد الرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۴

۸)مولانا عبد الستار خان نیازی، پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟ مجاہد ملت فاؤنڈیشن قصور، ۲۰۱۱ء، ص، ۱۴۴

۹)چوہدری چوہدری نیاز احمد سیگھیڑہ، پاکستان قوم سازی کا عمل، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۶۳

۱۰)خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۲۷

۱۱)مظفر مہدی ہاشمی، پاکستان کی نظریاتی اساس، کاروان ادب لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸۴

۱۲)سورہ آل عمران، پارہ ۴، آیت نمبر ۱۱۰، تاج کمپنی لمٹیڈ کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۳

۱۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۲۱

۱۴)مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲

۱۵)ڈاکٹر نفیس اقبال، تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ص ۲۵

۱۶)ڈاکٹر محمد اشرف کمال، اصطلاحات، اظہار سنز لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۴

۱۷)چودھری نذیر احمد خان، افکار ملی، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۸

۱۸) خلیفہ عبد الحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، س۔ن، ص ۴۵۶

۱۹)ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، دو پاکستان، ادارہ علم و فن پشاور، س۔ن، ص ۱۸۹

۲۰)امام بخاری، صحیح بخاری، جلد دوم، فصل فضائل علم، تاج کمپنی کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۱۴

۲۱)خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۲۱

۲۲)پروفیسر حمید احمد خان، تعلیم و تہذیب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۹

۲۳)مولانا حفظ الرحمان، اسلام کا اقتصادی نظام، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س۔ن، ص ۱۰۴

۲۴)ڈاکٹر اشفاق محمد خان، المطبعتہ العربیہ، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۸

۲۵)پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، عہد نبوی کا نظام حکومت، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

۲۶)حکیم محمد اسحاق، نظریہ کسب و انفاق، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۳۱

۲۷)محمد عبداللہ قریشی، تذکار اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۸

۲۸)صفدر حسین صدیقی، پاکستان کی تعمیر نو، نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۲

۲۹)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۳

۳۰)فتح محمد ملک، پاکستان کا روشن مستقبل، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۴ء، ص ۱۳

۳۱)قائد اعظم محمد علی جناح، مشمولہ، نظریہ پاکستان از سید واجد رضوی، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۹

۳۲)نواب بہادر یار جنگ، منشور پاکستان، بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴

۳۳)علامہ اقبال، مشمولہ، اعجاز اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۱

۳۴)ڈاکٹر سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۶

۳۵)مولانا عبدالستار خان نیازی، پاکستان کیا ہے؟ اور کیسے بنے گا؟، ص ۴۲

۳۶)شیخ محمد اکرام، پاکستان کا ثقافتی ورثہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۲

۳۷)ڈاکٹر سید عبداللہ، ادب و فن، ص ۲۱۷

۳۸)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۳۳

۳۹)چوہدری چوہدری نیاز احمد سیکھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، ص ۳۱۰

۴۰)ڈاکٹر عطش درانی، قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱

۴۱)شیخ محمد اکرام، پاکستان کا ثقافتی ورثہ، ص ۱۴۱

۴۲)میاں عبدالرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ص ۱۳۲

۴۳)ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، دو پاکستان، ص ۳۸۸
۴۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، تحریک نفاذ اردو، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۴۴
۴۵) قائد اعظم، مشمولہ پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک، از عطش درانی، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۰
۴۶) قائد اعظم، مشمولہ، اقبال جناح اور پاکستان از ڈاکٹر صفدر محمود، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳

باب سوم

سید عبداللہ کی نثر میں اسلامی عناصر

سید عبداللہ کے نثری سرمائے میں اسلامی عناصر کی تلاش اور اس کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے لیے ان کی کتب ''ادب وفن''، ''پاکستان تعبیر و تعمیر''، ''کلچر کا مسئلہ'' سید عبداللہ کے تعلیمی خطبات'' اور ''تحریک نفاذ اردو'' خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت کہ ہر لکھاری کا نظریہ حیات اور فکری سرمایہ اس کے مذہبی اثرات کا مظہر ہوتا ہے لیکن سید عبداللہ کے ہاں اسلامی عناصر کی موجودگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک اسلامی معاشرے اور اس کے لوازم کے متعلق غور و فکر بھی کیا۔ انھوں نے برصغیر میں اسلامی طرز حیات کے مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ اس فکری انداز کا موجب تحریک پاکستان اور قیام پاکستان تو ہے ہی وہ اس سرزمین کو اس مذہبی اور دینی تسلسل کے پس منظر میں بھی دیکھتے ہیں جس کا سلسلہ محمد بن قاسم سے شروع ہوتا ہے اور جس کو عروج سلطنت مغلیہ نے دیا اور اس سرزمین ہند کو ایک نئے مذہب اور اس کی ثقافتی ثروت مندی سے ترفع بخشا اور ایک خالصتاً ہند اسلامی ثقافت کو جنم دیا جس کی بقا اور تحفظ کے لیے اسلامیان ہند نے پاکستان بنایا اور یوں اپنے تشخص کو محفوظ کیا۔ اسلامی عناصر کی موجودگی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ سید صاحب اسلامی مفکر اور مذہبی دانشور بھی تھے۔ تیسری وجہ ان کے ہاں اسلامی عناصر کی موجودگی یہ بنتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی نظریاتی ریاست کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ سید عبداللہ کا دعویٰ ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ، مسئلہ، سوال کیوں نہ ہو اس کے حوالے سے رہنمائی دین اسلام کے قوانین و ضوابط کی روشنی میں لی جا سکتی ہے۔ بالخصوص پاکستان کے باب میں تو اس ضمن میں اور کوئی رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ سید عبداللہ کے ہاں اسلام کے متعلق کوئی ابہام نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی مذہب یا نظام کو پاکستان کے لیے فرضاً بھی نہیں لیتے۔ وہ کسی بھی اور طرز حکومت کو بھی کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں۔ اپنے نثری سرمائے میں جا بجا لکھتے جاتے ہیں:

> ''پاکستان قومیت (بھی) دو عناصر پر قائم ہے۔ ایک کو اس کی روح کہا جا سکتا ہے دوسری کو اس کا بدن۔ اس کی روح تو اسلام اور وہ تاریخی شعور ہے۔۔۔ اور اس کا بدن وہ جغرافیہ ہے جسے اب پاکستان کہتے ہیں۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کا تحفظ قومی احساس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔''(۱)

سید عبداللہ اس حوالے سے بھی واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ دین کے نام پر حاصل ہونے والا ملک میں نفاذ اسلام نہ ہو سکا۔ پاکستان بن جانے کے بعد جن مسائل سے یہ نوزائیدہ مملکت دوچار ہوئی ان میں اسلام اور اقدار اسلام سے دوری سب سے سنگین ہے۔(۲) لہٰذا سید عبداللہ نے اپنی نثر میں اسلام اور عناصر اسلام کو پاکستان کی شناخت، پاکستانیت کی بقا، انفرادی اور اجتماعی اسلامی فکر کی تدریس، اعلیٰ اسلامی اقدار کی ترویج کی ترغیب اور اشاعت کے لیے استعمال کرنے کے خواہاں

ہیں۔(۳)سید عبد اللہ کا دعویٰ ہے کہ عوام و خواص دونوں پاکستان اور اسلام کو باہم مترادف سمجھتے ہیں اور وہ ہر شعبے زندگی میں خالص اسلام کے متمنی ہیں، اسی لیے اسلامی عناصر کی ایک طویل فہرست ہے جو ان کے ہاں ملتے ہیں کیونکہ وہ خود ایک مفکر تھے اور اسلام کو بحیثیت دین پاکستان میں نفاذ نے خواہاں بھی تھے۔ وہ اسلام کو پاکستان کا مذہب ہی نہیں نظام اخلاق، نظام سیاسیات، نظام معاشیات و سماجیات قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسلامی رجحان کی وجہ ان کا اپنا اسلامی تعلیم سے بہرہ مند ہونا بھی ہے اور وہ اسلام کو رسماًضابطہ حیات نہیں مانتے بلکہ وہ اسلام کی روح سے آگاہ تھے۔ مزید برآں وہ علامہ اقبال کے ویژن اور قائداعظم کی اسلام پسندانہ سوچ سے بھی مستفیض تھے۔ علامہ اقبال کے اسلامی ریاست کا منصوبہ اور پھر قائداعظم کا پاکستان کے قانون کو اسلامی قرار دینا ان کی فکری نظام کی اساس بنتا ہے اور ان کو پاکستان سے وابستہ امیدوں اور عزائم پر سوچنے کی دلیل بھی بنتا ہے۔ وہ پاکستان کے قیام کے عمل کو اسلامی ریاست کے قیام سے تعبیر کرتے ہیں اور قیام کے بعد کے معاشرے کے افراد کے کردار اور سوچ کو مسلمان کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس حوالے سے سید صاحب نے خوب محنت کی اور زبان و قلم دونوں سے مہم چلائی۔(۴) ان کے ہاں اسلامی فکری عناصر کی موجودگی ان کی اس خواہش اور خواب کا اظہار ہے کہ وہ اپنے یعنی پاکستانی معاشرے کو مدنی معاشرہ کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند ہیں لہٰذا پاکستان اور اسلام کو ان کے نظام فکر میں اساسی اہمیت حاصل ہے۔ سید عبد اللہ زندگی کے ہر معاملے میں اسلامی تعلیمات یعنی قرآن و حدیث سے رہنمائی لیتے ہیں۔ بقول ممتاز منگلوری:

> ”سید محترم۔۔۔۔ قومی کردار کی تربیت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے نزدیک قومیں جغرافیے سے نہیں عقائد سے بنا کرتی ہیں۔۔۔ پاکستانی قومیت کے دو بڑے اصول ہیں ایک تو اس خطے کی محبت جس کا نام پاکستان ہے دوسرے ان عقائد و روایات (اسلامی) کی محبت جن کے لیے پاکستان قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کے کامیاب امتزاج سے ہی پاکستانی قومیت کی جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں۔“(۵)

ڈاکٹر ممتاز منگلوری رائے صائب ہے کہ سید صاحب کا فکری نظام پاکستان اور اسلام کی اساس پر قائم ہے جس کا نتیجہ ان کی نظر میں پاکستان میں دین کا کامل نفاذ اور مدینہ جیسے ریاست کے قیام کے سوا کچھ اور نہیں۔ حق لگتی کہی جائے تو یہی وہ محرکات تھے جن کے لیے الگ وطن کے لیے تحریک چلائی گئی۔ اسلامی عناصر کا جہاں تک تعلق ہے تو سید عبد اللہ کے ہاں پائے جانے والے اسلامی عناصر کو مختلف حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا وہ پوری فکر اسلامی سے اخذ و استفاد کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سید صاحب کا فکری نظام اسلامی عقائد و نظریات کی اساس پر استوار ہے۔ وہ ہر معاملے کو اپنے اسلامی فکر کی کسوٹی پر

دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ سید عبد اللہ کا طرز عمل اس معاملے میں علمی اور منطقی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک نظام جو فعال ہے اور جس سے لوگ مانوس ہیں اس میں تبدیلی یا اس کا تبدل ایک خاص میکانکی طریق ہی طے پا سکے گا۔ سید عبد اللہ کا خیال ہے کہ پاکستان کو اس طرز پر ڈھالیں کہ جس کے لیے اس مملکت خداداد کو حاصل کیا گیا ہے وہ مقاصد اور ترجیحات بہ سہولت حاصل کی جا سکیں اور اسلامی نظام نافذ ہو سکے کیونکہ اس نظریاتی ریاست کو اسلامی بنانا وقت کا تقاضا ہی نہیں بلکہ خود اس کا تکملہ بھی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ”جب کہا جاتا ہے کہ شریعت نافذ کر دو۔۔۔ یا یہ کہ ہم شریعت نافذ کریں گے تو اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم آج تک بالکل غیر مسلمانوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے اور ہمارے قبول اسلام کا روز اول آج ہی ہے۔ (جب کہ حقیقت یہ ہے کہ) البتہ ایک شرع کا حصہ دور غلامی میں غیر مسلم حکومتوں کے تحت ساقط رہا جو حکومتی نفاذ کا طلبگار ہے۔“(٦)

سید عبد اللہ ان اسلامی شقوں، احکامات اور تعزیرات کو فعال کرنے کے خواہش مند ہیں جو انگریز عہد میں غیر فعال اور مفلوج کر دی گئی تھیں یا پھر بادشاہتی نظام میں بھی نافذ ہی نہیں کی جا سکیں۔ آج انہی قوانین کی بحالی کا نام میں نفاذ شریعت ہے اور یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اسلامی شریعت کلی طور پر کبھی بھی غیر فعال نہیں رہی ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کے روزمرہ کے معاملات میں شرعی احکامات اور تعلیمات سب سے نمایاں ہیں۔

سید عبد اللہ بھی اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کا سماجی، عمرانی، اقتصادی اور معاشی نظاموں کو فی الفور رائج کیا جانا چاہیے۔ اسلوب زندگی کو اسلامی بنانا ہر فرد کا انفرادی و اجتماعی سطح پر فرض ہے کیونکہ اسلامی طرز حکومت اسی صورت میں ممکن ہے جب حاکمیت اعلیٰ و اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہو اور یوں اس کے قوانین سے عدالتی نظام چلے اور پیش آمدہ مسائل اور معاملات کو دین اسلام کی رہنمائی سے حل کیا جائے۔ آئندہ صفحات میں سید عبد اللہ کے نثری اثاثے میں پائے جانے والے چیدہ چیدہ اسلامی عناصر کا ایک ترتیب وار مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اسلام کا تصور زندگی

سید عبد اللہ کے اسلامی عناصر میں ایک بنیادی عنصر اسلامی تصور زندگی ہے۔ وہ اسلام کے فلسفہ زیست کو فرد کی زندگی میں مکمل روح کے ساتھ اور عملی صورت میں نافذ دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں اسلامی تصور زندگی کی انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتیں ملتی ہیں۔ ان کا اسلامی تصور زندگی یہ ہے کہ ہر فرد معاشرے صرف عبادات کا مسلمان نہ ہو بلکہ افرادِ معاشرہ اپنے کردار اور رویوں اور اخلاق اور برتاؤ میں بھی مسلمان ہوں کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو معاملات زندگی کے ہر پہلو، ہر راستہ، ہر زاویہ کو متعین کرتا ہے۔ سید عبد اللہ اپنے اسلامی تصور زندگی کے خدوخال ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

> ''اسلامی تصور زندگی کی بات لمبی ہے مختصراً یوں ادا کر لیجیے کہ مسلمانوں کے ذوق حیات میں جہاں ذوق فرحت ہے وہاں ذوق علم، ذوق جہاد اور ذوق عبادت بھی شامل ہے اور ان سب کے مجموعے کا نام اسلامی رویہ زندگی ہے۔ اس رویہ زندگی کی پوری تصویر کھینچنا ممکن نہیں۔ اس سے متعلق چند الفاظ کی فہرست شاید کچھ نہ کچھ تصور دلا سکے گی مثلاً، ادب، حیاداری، پاکیزگی، طہارت، تقویٰ، تحدیث بالنعمت، عدل، شفقت، فرق مراتب، طہارت نسل، کسب حلال، کتاب اور کاغذ کی عزت، مسجد کی مرکزیت، علمی سفر وسیاحت کی فضیلت، بلا معاوضہ کار ثواب وغیرہ۔''(۷)

اس جامع و وقیع تعریف میں سید عبد اللہ کے تصور زندگی کے خدوخال واضح ہو گئے۔ سید صاحب کے نزدیک زندگی ایک عقیدہ اور لائحہ عمل کی صورت میں ہے۔ اسلام ایک مبسوط معاشرے کی بناڈالتا ہے۔ جہاں رہنے والے اپنے حفظ مراتب کے حوالے سے حقوق و فرائض کے حامل ہوتے ہیں۔ اسلام کے اعلیٰ تقاضوں کو پورا کرنے اور اللہ کے احکامات کو کما حقہٗ بجا آوری کے لیے ایک ضابطے اور دستور کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان ایک شتر مہار کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکتا جس میں اطاعت خداوندی اور اطاعت رسول کا تصور نہ ہو۔ زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے اسلامی ایک مکمل زندگی گزارنے کا منشور دیتا ہے جو اللہ کی وحدانیت کے تسلیم کر لینے سے عقیدہ یوم آخرت تک کے کئی مراحل پر مشتمل ہے۔ زندگی کے متنوع مسائل اور مختلف النوع معاملات سے احسن ترین صورت میں نبرد آزما ہونے کے لیے اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اسلام کا اسلوب حیات ایک کامیاب انفرادی اور کامران اجتماعی زندگی کو یقینی بناتا ہے۔ سید عبد اللہ اس ضمن میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"اسلام میں زندگی عبادت ہے دین اور دنیا کی یکجائی سے اور اس یکجائی کا نصب العین ہے۔ انسان کی خوشی اور خوشحالی، اس دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی۔ اب دین و دنیا کے مجتمع عمل کے لیے، جن عقائد و اعمال کی ضرورت ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ا۔ عقائد ب۔ عبادات ج۔ معاملات یہ تینوں لازم ملزوم ہیں۔"(۸)

اس مثلث پر وہ آگے چل کر خاصی بحث کرتے ہیں کہ زندگی پیدا ہونے، پلنے بڑھنے، کھانے پینے، شادی بیاہ کرنے، کمانے اور مر جانے کا نام نہیں ہے۔ انسانی حیات کا ایک اشرف مقصد ہے جس کی انجام دہی کے لیے اس فرد کو چند عقائد کو اپنانا پڑتا ہے، ان عقائد کی ظاہری صورت عبادات ہیں۔ عقائد اور عبادات کی دین یا منتہا زندگی کے معاملات کا احسن صورت میں نمٹالینا ہے۔ اسلامی تصور زندگی یہ ہے کہ ہر مسلمان معاشرے کا فعال، متحرک اور مخلص رکن بن جائے۔ معاشرتی روابط، لین دین، قرابت داری و رشتہ داری، ایثار و تعاون، صبر و برداشت، تحمل و وسیع المشربی، عالی ہمتی اور شکر گزاری، جیسی بلند انسانی صفات اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ سید عبد اللہ بھی انہی صفات حمیدہ کو اہل معاشرہ میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وطن عزیز میں رہنے والے تمام لوگ بھائی بھائی بن کر رہیں اور قرآن و سنت کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور تفرقے میں نہ پڑیں۔ سید صاحب اھدنا الصراط المستقیم کے پیرو اور داعی ہیں اور چاہتے ہیں کہ فتنہ اور فساد سے پاک معاشرہ وقوع پذیر ہو۔ بقول ڈاکٹر طاہر القادری:

"جب بھی کوئی مسافر کسی کا صحیح راستہ دریافت کرتا ہے تو اس کا راستہ دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی منزل اس کے سامنے ضرور ہے۔ سورۃ فاتحہ کی یہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ سے سیدھی راہ دکھانے کی استدعا ہے، حیات انسانی کی مقصدیت کی نشان دہی ہے۔"(۹)

سید عبد اللہ بھی اسی سیدھی راہ پر چلنا اور چلانا چاہتے ہیں اور اسی آیت کریمہ کو وہ اسلامی تصور زندگی کی اساس قرار دیتے ہیں کہ یہی آیت کریمہ در حقیقت اس معاشرہ کی شکل کو دیتی ہے جس میں الا الہ الا اللہ کا اسم اعظم چلتا ہو اور اہل معاشرہ اللہ کے احکامات سے زندگی گزار سکیں جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے عہد زریں میں ہوا تھا۔

سید عبد اللہ انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک مثالی نظم و ضبط اور ترتیب پر اصرار کرتے ہیں جن کے لیے وہ اسوۂ رسول کو ایک فقید المثال سیرت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں نمونہ سیرت کے بغیر اس طرح کی مثالی زندگی کا تصور خاصا مشکل ہے۔ اس ضمن میں ان کا ماننا ہے کہ مسلم معاشرہ کے ہر فرد کا ہر عمل اور فعل، ہر سوچ اور ہر فکر کا حقیقی معیار وہی ہے جو معیار سیرت رسول اللہ ﷺ نے متعین کیا ہے۔ نبی اکرم نے اپنے اسوہ کی صورت میں

ایک قابل تقلید اور قابل بھروسہ نمونہ دیا ہے جس کا اللہ نے اپنی کتاب القرآن میں بہانگ دہل اعلان بھی کر دیا ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ”اسلامی (تہذیب) زندگی کا ایک اصل الاصول اس کی کمیت ہے کہ وہ خدا اور انسان اور کائنات اور دین اور دنیا کو ہم رشتہ بنا کر چلتی ہے یعنی زندگی میں نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے وقت خدا اور قیامت کے دن کو فراموش نہیں کرتی۔“(۱۰)

'خدا اور قیامت کو فراموش نہ کرنے' کا مطلب ہے کہ اللہ کی نعمتوں اور مہربانیوں سے حظ اندوزی کے ساتھ ساتھ اس کے احکامات براری بھی کرنی چاہیے اور اللہ کے مقرر کردہ اصول ہائے حیات کو اپنی زندگیوں میں لاگو کریں ہے بالفاظ دیگر نبی اکرم ﷺ کے طریقوں پر زندگی کو گزاریں کیونکہ یہی اسلامی تصور زندگی کا عملی نمونہ ہے۔(۱۱) جس سے ہر مسلمان نے رہبری حاصل کرنی ہے۔

غرض سید عبداللہ کا اسلامی زندگی کا تصور ہے کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں پر آنے والی روح ایک خاص مقصد حیات لے کر پیدا ہوتی ہے اور وہ مقصد ہے اللہ کے احکامات کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جہاں حاکمیت اعلیٰ اللہ کو حاصل ہو اور تمام معاملات زندگی اور مسائل کا حل دین اسلام سے لیا جائے۔ اسلام اپنے اندر ایک مکمل کامیاب زندگی کا ضامن ہے اور جو معاشرہ اسلام کی مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر استوار ہو گا وہی ایک کامل اسلامی طرز حیات کے مواقع اپنے باسیوں کو فراہم کرے گا۔ ایسا معاشرہ کہ جس میں اسلام کی روح شامل ہو اور جہاں طہارت نسل سے لے کر روزگار، افزائش نسل، قرابت داری، معاشی مساوات، تعلیم و تربیت، عقائد کی ترویج اور نظریاتی ترسیل، فکر و اظہار کی آزادی جیسی اعلیٰ انفرادی خوبیاں افراد معاشرہ میں پنپ سکیں اور دین پر عمل کرنا کے لیے نہایت خوشگوار ماحول کی نگہداشت کی جائے تاکہ ایک معتدل، مربیانہ، مشفقانہ اور دوستانہ مزاج رکھنے والا معاشرہ متشکل ہو پائے۔

اسلامی اقدار و روایات کا فروغ

سید عبداللہ کے اسلامی عناصر کے مطالعہ میں ایک خاص عنصر مشرق اقدار کا احیا ہے۔ سید عبداللہ کے ہاں پاکستان میں تشکیل پانے والے معاشرے میں مشرقی اور اسلامی اقدار کو مغربی یا انگریزی اقدار اثرات بد ڈال رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے

بعد ہندوستان کے مجموعی کلچر پر بالعموم اور مسلمانوں کی ثقافت پر بالخصوص اثر انداز ہوا ہے۔ اور یہ ایک مسلمہ اصول بھی ہے کہ حکمران طبقے کی برتری ان کے رسم و رواج و ثقافت سماجی اقدار کی پیروی کراتی ہے۔(۱۲) ثقافت و سماج پر ہی کیا موقوف فنون لطیفہ غرض ہر شعبہ حیات میں حاکم قوم کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ہم اکبر الہ آبادی کے واویلا کو بطور ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ جنھوں نے مسلمان قوم کی انگریزی اقدار روایات کی اندھا دھند تقلید پر خوب اعتراض اور تنقید کی۔(۱۳) سید عبد اللہ نے مشرقی اقدار کے احیا اور مغرب کی پیروی سے قوم کو روکنے کے لیے کام کیا۔ سید عبد اللہ مغرب کی تہذیب کے گرویدہ لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "بعض (لوگ) اسلامی آداب زندگی کے تصور سے خوفزدہ ہیں۔ اس کا باعث دو مغالطے ہیں۔ ایک مغالطہ تو یہ ہے کہ اسلامی زندگی میں فرحت اور تفریح کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا دور چلا گیا اب ایک اور تہذیب (مغربی) موجود ہے جس کو کاملاً اپنا لینے کے باوجود ایک مسلمان کا کچھ (بھی) نہیں بگڑتا۔"(۱۴)

سید عبد اللہ کی رائے صد فی صد صائب ہے کہ ایک طبقہ بالکل اسی فکر کا حامل ہے۔ ان کم عقلوں کے خیال میں اسلام کو ایک قدامت پسند مذہب ہے۔ اور اسلام ایک سخت ضبط رکھنے والا دین ہے لہذا اس میں سہولیات و آسائشوں پر پابندی ہے جبکہ یہ ایک صریح غلط فہمی ہے۔ یہ غلط فہمی عوام الناس کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی لاحق ہے اور یہ فکر مغرب زدگی کے فروغ اور مشرقی واسلامی اقدار سے دوری کا موجب بن رہی ہے۔ ان کو اسلامی اقدار روایات میں فرسودگی اور رجعت نظر آتی ہے۔ ان کے نزدیک جدید عہد کے انداز زندگی کے لیے خالصتاً مغربی فکر اور اخلاقیات کی ضرورت ہے۔ ۱۹۴۷ء کے جہاں پاکستان معرض وجود میں آیا تو کچھ ناگہانی وجوہات اور کم فہمی کے سبب چند مسائل نے اس وطن عزیز کو آلیا اس میں ایک کلیدی مسئلہ ضابطہ حیات کے طے کرنے میں ردو کد اور فرضی تاویلات سے کام لیا جاتا تھا۔ قرار داد مقاصد کے طے پاجانے کے بعد بھی ہمارے کم فہم دانش وروں اور کم بصیرت مفکرین نے اس ضمن میں ضرورت بھر توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے بہت سے مسائل نے جنم لیا۔ قرار دار مقاصد کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محمد دین لکھتے ہیں:

> "قرار دار مقاصد، اس لحاظ سے خصوصی اہمیت وافادیت کی حامل ہے کہ اس میں اس امر کی موثر و جامع وضاحت کر دی گئی ہے کہ پاکستان میں نظام حکومت و سیاست احکام الٰہی اور قرآن و سنت پر مبنی قوانین کی روشنی میں چلایا جائے گا تا کہ قیام پاکستان کے مقاصد پایہ تکمیل کو پہنچیں۔"(۱۵)

گو اس قرار داد کا مقصد براہ راست سیاسی معاملات سے تھا لیکن اسلامی قوانین اور شعائر کی ترویج ایک واضح دلیل ضرور تھا جس کے بین السطور یہی پیغام تھا کہ اسلامی اور مشرقی اقدار کو اس سر زمین پر اشاعت اور رواج دیا جائے گا۔ اب ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ اہل فکر حضرات اور معاشی و عمرانی ماہرین اس مطلوبہ ضابطہ حیات اور اسلامی ثقافتی معاملات اور مسائل کو زیر بحث لاتے اور اسلامی معاشرت اور سماجی نظام کی جدید ترین توضیحات کو موضوع بناتے۔ مغرب زدگی کی رو کے سامنے مضبوط پشتہ باندھنے کی تجویز کرتے ہیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور ایک بڑی تعداد میں لوگ اسی رو میں بہہ گئے۔ نتیجتاً مغرب زدگی کا منہ زور ریلا ہماری معاشرت میں در آیا ہے جو اسلامی اور مشرقی اقدار سے متحارب ہے۔ اس مغرب زدگی کے مارے گروہ کے بارے میں سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ”جو لوگ اسلامی زندگی کو مشکل سمجھتے ہیں وہ دراصل مغربی تہذیب اور مغربی مصنفوں سے متاثر ہیں۔ ہر شے کو حکمائے مغرب کے اقوال کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور موجودہ مغربی، امریکی طرز حیات سے اس درجہ مرعوب و مسحور ہیں کہ انہیں ہر وہ شے اجنبی معلوم ہوتی ہے جو مغرب کے طریقے کے مطابق نہ ہو اسے کہتے ہیں اغیار کے غلبے کا احساس، اسے کہتے ہیں، اپنی معاشرت کے بارے میں بے یقینی، اسے کہتے ہیں خود باختگی، اسے کہتے ہیں ذہنی، فکری اور عملی غلامی۔“(۱۶)

اس سارے بحث کے بعد وہ ان مغرب کے دلدادگان کی کج فہمی پر ماتم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اعتدال ہر شعبہ زندگی میں لازم ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن سے استفادہ نہایت ضروری ہے لیکن کوئی معقول ترکیب ہونی چاہیے نہ کہ خود کو کم تر گردان کر ان کی ہر بد اطواری کو اپنا لینا کہاں کی عقل مندی ہو گی۔ اسلام کے نام پر بننے والا ملک اسلامی ضابطوں کو چاہے گا، اسلامی معاشرت میں ایک اعتدال اور میانہ روی ہے جہاں فرحت و تفریح کے مواقع ہیں وہیں کچھ انسانی طینت کے پیش نظر قدغنیں بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں وہ فنون لطیفہ اور موسیقی کے میدان میں مسلمانوں کی دلچسپی اور کارہائے نمایاں کا ذکر کر کے اسلامی مذاق کا حوالہ دیتے ہیں کہ مسجد قرطبہ، الحمرا، تاج محل، قطب مینار، شالیمار باغ اور ان بادشاہوں کے ہاں میلے ٹھیلوں، محافل موسیقی، عرس اور قوالیوں کی رونقوں سے یہ بات استناد پاتی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں بھی تفریح کے مواقع ہیں۔ ان کہنا یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ذوقیات کی تسکین کے لیے کوئی قدغن نہیں ہاں البتہ کچھ فنون کو اسلام نے پسندیدہ قرار دیا ہے اور کچھ کو ناپسند ضرور کیا ہے۔ اس ضمن محمد مارماڈیوک پکتھال کی رائے سید عبد اللہ کے بیانیہ کی تائید کرتی ہے:

"اسلامی تہذیب کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی فوز و اصلاح اور ترقی و آراستگی خارجی سے زیادہ باطنی ہے کیونکہ اسلام رسمی لوازمات سے زیادہ خود زندگی کو حسین و جمیل دیکھنے کا عادی ہے گویا باطنی پاکیزگی، روحانی ترفع اور معاشرتی حسن و جمال نام نہاد فنون لطیفہ کی پرستش سے کہیں زیادہ اہم اور ناگزیر ہے۔ علامہ اقبال کی بھی یہی رائے ہے فن کا مطلوب زندگی کو حسین و توانا بنانا ہے نہ کی سفلی جذبات کے ذریعے اسے کھوکھلا اور کمزور کرنا۔"(۱۷)

اسلام کا اسلوب حیات محمد مارماڈیوک پکتھال نے خلاصتاً بیان کر دیا ہے کہ اسلامی معاشرہ ان اقدار و روایات کی پرورش اور پرداخت کو یقینی بناتا ہے جو اہل معاشرہ کی روحانی ترفع اور بالیدگی کا موجب بنیں ۔ دوم اسلامی معاشرہ ایسی ہی حمیدہ روایات دیگر تہذیب و ثقافت سے قبول بھی کرتا ہے۔ اسلامی معاشرت اپنے خاص مذاق سے ردو قبول کرتی ہے مثلاً اسلام میں بت تراشی، مجسمہ سازی حرام ہیں اس ممانعت نے اسلامی معاشرے میں خطاطی اور نقاشی اور اقلیدسی نقش و نگار اشکال کے فن کو جنم دیا کیونکہ اسلام نے احساس جمال اور حسن جمال کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے کیونکہ یہ فطرت انسانی کا لازمہ ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"یہ الزام کہ مشرقی اقدار اور اسلام میں تفریح اور جمالیات کا فقدان ہے نہ صرف سراسر غلط ہے اور جو یہ الزام عائد کرتے ہیں وہ اسلام اور مشرقیات سے ناواقف اور ناآشنا ہیں۔"(۱۸)

سید عبداللہ بھی یہی مانتے ہیں کہ اسلام ایک جامع اور اعتدال پسند ضابطہ حیات ہے جس پر ناسمجھ ناقدین نے مغرب زدگی کے رو میں بھونڈے اور جھوٹے الزامات لگا کر اپنی مرضی کرنے کے لیے سہولت حاصل کرنا چاہی ہے۔

سید عبداللہ کا خیال ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اب یہ پاکستان کے عوام و خواص کا فرض ہے کہ وہ اپنی معاشرتی، معاشی، سماجی، ثقافتی، عمرانی و تمدنی نظامات کا غیر متعصبانہ اور ناقدانہ انداز میں معروضی مطالعہ کریں اور مغرب کے اثرات بد کی نشان دہی کر کے ان کے خاتمے کی سعی کریں، ساتھ ہی مشرقی اور اسلامی اقدار کی ترویج کے لیے سنجیدہ اقدامات بروئے کار لائیں۔ مغرب میں عورت کا مقام اور اس کی برہنگی، مردوزن کا اختلاط، تعلیم نسواں کی فریب کاریاں، سودی نظام کی بنکاری، میڈیا کی آزادروی، اظہار رائے کی آزادی کی اوٹ میں نئی نسل کو گمراہی کی جانب دھکیلنا جیسے ہتھکنڈوں کو نہایت اخلاص سے قابو کرنا ضروری ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"ازبسکہ اسلام پاکستان کی حقیقی بنیاد ہے۔ اس لیے یہ لازمی ہے کہ اس کا تحفظ کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ تحفظ اس کے سرچشموں کے تحفظ ہی سے ممکن ہے۔ اس کے سرچشمے قرآن و سنت ہیں جن سے

> کل زندگی کے اصول مستنبط ہو سکتے ہیں۔ اگر اس غرض کے لیے ایک باشعور اور ذمے دار نظام اجتہاد قائم کر دیا جائے تو جدید ترین مظاہر زندگی کا حل اس کے ذریعے دستیاب ہو سکتا ہے۔"(۱۹)

یہ ایک قابل عمل اور سنجیدہ تجویز ہے جس میں مغربی معاشرے رواج پذیر روایات کا توڑ بھی ہے اور مزید گمراہ کن اثرات کا تدارک بھی ہے۔ اس سے بھلا انکار ممکن ہے کہ مغربی معاشرت کی بے راہروی، بے دینی، خود اختیاری مذہب سے بیزاری مشرقی اقدار کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ خاندان جیسی مضبوط اور کلیدی اکائی تباہی کے دھانے پر ہے۔(۲۰) سید عبداللہ کا اصرار ہے کہ اسلام کے سرچشموں سے رشد و ہدایت لی جائے اور اہل معاشرہ کی فکری بالیدگی اور ذہنی بلوغت کو بڑھایا جائے اور ان ظاہری چمک رکھنے والے عناصر کو رد کیا جائے اور اسلامی اقدار کو رائج کرنے کی سعی کی جائے۔

اسلامی فکر اور پاکستانی مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ نئی نسل کو مشرقی اقدار سے متعارف کرایا جائے اور ان اقدار کی وقعت اور قدر سے آگاہ کیا جائے۔ اپنی نئی نسل کو اپنے اسلامی نظریہ معاشرت کا عاقل اور بالغ عامل بنایا جائے اور ان کو اپنی مشرقی اقدار پر فخر اور ناز کرنا سکھایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ پاکستانی نسل کو اپنی مشرقی اقدار سے مزین اسلامی تعلیم اور ضابطہ حیات سے روشناس کرایا جائے، اپنی اقدار اور روایات کی قدر کرنا سیکھیں اور اس پر متفخر رہیں کیونکہ آج کل کا پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا ایک شتر بے مہار کی مثال ہماری اس نسل کو گمراہی کی جانب ہانکنے لیے جا رہا ہے اور ہم خود بھی ہانکے جانے پر برضا و رغبت تیار ہیں۔ جہاں مغربی اور ایک پڑوسی ملک کی ثقافتی یلغار نے بے حیائی، بے غیرتی، برہنگی، جنسی اشتعال کے ایسے نمونے لا رکھے ہیں کہ یہ نوخیز اور ناسمجھ نسل اسی کو اصل اور مثالی زندگی جان کر پیروی شروع کر دیتی ہے اور اپنی اچھائی اور برائی کی تمیز اور پابندیوں سے دل برا کر بیٹھتی ہے۔ سید عبداللہ ایسی بے حیائی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "دانتوں کے برش مرد بھی استعمال کرتے ہیں اور عورتیں بھی مگر اشتہار پر صرف عورت، بلیڈ جہاں تک مجھے معلوم ہے مردوں کے استعمال کی چیز ہے مگر اس کے فلیپ پر عورت دنگل کے اشتہاروں پر عورت اور مٹھائی کے اشتہار پر تو عورت کو ہونا ہی چاہیے کیوں کہ اس کی باتیں مٹھائی کی طرح میٹھی ہوتی ہیں مگر حد سے زیادہ جنسی ترغیب و تحریص یورپ کا تحفہ ہے۔ جس کی آج کل بڑی مانگ ہے۔"(۲۱)

سید عبد اللہ اسلامی معاشرت میں اس بے حیائی اور ڈھٹائی پر سخت احتجاج کرتے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اپنے کلچر میں ان غیر ملکی، غیر اسلامی اقدار و روایات کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔ ان اقدار و روایات کے وکیلوں اور پسند کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ضروری ہے ساتھ ہی اپنی اسلامی اور مشرقی اقدار کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی ہے کہ مغرب کی ساری اقدار ثقافت و معاشرت مذموم نہیں مستحسن بھی ہیں لہٰذا اچھائیاں کو قبول کرنا اور خامیاں رد کرنی ہو گا۔ اس حوالے سے عارفہ فرید کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> ''پاکستانی معاشرتی اقدار تیزی سے مغربی اقدار میں بدل رہی ہیں جن قدروں نے مغرب میں محبت اور انسانیت کا سینہ چاک کیا۔ وہ اب پاکستانی معاشرے میں اپنے لیے جگہ بنا رہی ہیں۔ معاشی بد حالی کی وجہ سے لوگوں کا اپنی معاشرتی قدروں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو صرف اقتصادی معاملات میں ہی مغرب کے دست نگر نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ترقی اقدار کو بھی اپنے مسائل کا حل سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے اسلاف کے مزاج سے دن بدن دور ہوتے جا رہے ہیں۔''(۲۲)

سید عبد اللہ کی فکر مندی کا حوالہ اور زاویہ بھی یہی ہے اسلامی اقدار اور مشرقی روایات دم توڑ رہی ہیں لہٰذا اسلام کا علم تھامنا ہو گا اور اہل معاشرہ کو مغرب زدگی کے اثرات بد سے اعتماد میں لینا ہو گا اور ان کو ان سے مامون کرنا ہو گا اور پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہو گا کیونکہ وطن عزیز کو اور اس کے باسیوں کو فلاح اور عظیم سرخ روئی کی راہ پر چلانا ہو گا۔ اسلام کی ہدایت اور مشرقی اقدار کو اپنانا ہو گا تبھی وطن عزیز اسلام کا قلعہ بن پائے گا۔ وہ یہی جہاد ساری عمر کرتے رہے۔ بقول راجا رشید محمد:

> ''مغربی تہذیب سے متاثر ہوتے ہوئے اس معاشرے میں ہمیں بہت کم آدمی ایسے ملتے اور بلا شبہ ایسے آدمی عظیم ہیں جو مغربی علوم و افکار کے مطالعہ کی حوصلہ شکنی نہیں کرتے، لیکن فلسفہِ نفع، روایت شکنی، جسمانی لذات کی دلدادگی، روحانی لذتوں سے انکار اور یورپ کے مادر پدر آزاد تصور کے خلاف مصروف جہاد ہوں اور سید صاحب ایسے لوگوں میں سر فہرست ہیں۔''(۲۳)

اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کیوں کہ سید عبد اللہ واقعتاً اسلامی اور مشرقی اقدار کے دلدادہ اور مبلغ تھے ان کے ہاں یہ تصور ملتا ہے کہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ کی تشکیل ممکن ہے جب اس قوم کی خاص روایت کو مروج کیا جائے اور ان اقدار کی اشاعت کی جائے جو اس قوم کے تشخص کی ضامن ہیں۔ اس حقیقت سے کسے مفر ہو گا کہ پاکستان کے تناظر میں یہ پہلو اور بھی اہمیت حاصل کر لیتا کہ پاکستان اسی ثقافت اور تمدن کے تحفظ کے لیے معرض وجود میں آیا ہے جس نے

اسلامیانِ ہند کی انفرادی شناخت بخشی ہے جس کی بقااور دوام کی ذمہ داری پاکستان نے اپنے سر لی ہے۔ اس مملکت خداداد میں مشرقی اقدار کی ترویج اور اشاعت نہایت اخلاص سے کرنا ہوں گی اور اگلی نسل کو اس باب میں تربیت دینی ہو گی اور ان کو ان اقدار کا متفخر وارث اور جان نشین بنانا ہو گا یوں اسلام اور پاکستان کا مستقبل محفوظ اور روشن ہو پائے گا۔

اسلامی تصوف

تصوف، عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ''صوف'' سے مشتق ہے اور اس کا اسم فاعل 'صوفی' ہے۔ اس سے مراد خود کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کے لیے وقف کر دینا ہے اور اس فلسفہ سے تزکیہ نفس اور روحانی بالیدگی حاصل کی جاتی ہے۔ اس تصور سے اہل اسلام نے کئی فوائد بھی حاصل کیے اور کئی مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔ لیکن اکابرین اسلام کے ہاں اس فلسفے کے لیے ایک نرم گوشہ ہمیشہ رہا ہے۔ فلسفہ تصوف میں دو مکتبہ فکر ملتے ہیں اول ہمہ اوست یعنی فلسفہ وحدت الوجود کہ سب کچھ خدا ہی ہے اور دوسرا ہمہ از اوست یعنی وحدت الشہود ہے۔(۲۴) اس تصوف پر اہل عجم و یونان کے اثرات خاصے گہرے ہیں لیکن اس کی مقبولیت اور شہرت بھی خاصی ہے۔ فارسی شاعری سے شروع ہونے والی تصوف کی روایت نے اردو شاعری میں بھی حسن کاری کے بے مثال جلوے دکھائے ہیں۔ لفظ تصوف کا تعارف کراتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> ''مسلم اور غیر مسلم'' محقق زیادہ تر اس پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ یہ لفظ ''صوفی'' سے مشتق ہے۔ درویش، خدا سے لو لگانے والا اور تنعم دنیوی سے گریز کرنے والا زاہد، رسول کریم ﷺ کی طرح کملی والا ہوتا ہے۔ یہ کملی عام طور پر صوف ہی کی ہوتی ہے۔ جو کہ ایک کھردری قسم کی اون کی بافت تھی۔ مسلمانوں میں صوفیہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ وہ طرز فکر اور طرز زندگی جسے تصوف کہتے ہیں اسلام میں کہیں خارج ہے۔''(۲۵)

کہا جا سکتا ہے تصوف ایک اسلوب حیات ہے کہ جس کے تحت صوفی زندگی کے مشاغل، عمومی حاجات، ضرورتوں سے خود کو دور رکھ کر ایک خاص طرز میں زندگی گزارتا ہے اور اس کا مقصود اللہ سے لو لگانا اور روحانی ترفع حاصل کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تصوف ایک نظام حیات ہے جو مخلوق اور خالق کی حقیقت اور ان ے روابط کی ماہیت پر غور کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ اور دو پیرایوں کا عامل ہے، ایک نظریہ کے مطابق تصوف حقیقی صورت میں مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے اور شرع میں اس کا نام احسان ہے دوسرے نظریے کی رو سے یہ ایک فلسفہ ہے۔ جو مختلف تصورات کا مجموعہ اور اسلامی تعلیمات میں بڑی حد تک موثر ہے۔''(۲۶)

تصوف کی کوئی ایک متعین تعریف ممکن نہیں صوفیا اور اولیا نے بھی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ نفس کو پاک کرنا اعلی اخلاق کو اپنانا، دنیا کی آلائشوں سے دل کو دور رکھنا، حرص و طمع اور دنیا میں دل لگانے سے باز رہنا تصوف ہے۔ بالفاظ دیگر ایک نظام فکر ہے جس میں صوفی نہ صرف اپنے تزکیہ نفس کا سامان کرتا ہے بلکہ اپنے متعلقین اور مریدین کے لیے بھی روحانی بالیدگی اور کردار سازی کا اہتمام کرتا ہے۔(۲۷)ہندوستان کی سرزمین پر تصوف کے ثمرات کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس فلسفہ زندگی کو عملی زندگی میں بھی لوگوں نے خوب برتا ہے اور اس فلسفہ کو شعرا اور ادبا نے بھی اپنے ہاں ایک خاص مقام دیا اس لیے تصوف اردو شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔(۲۸) اسلامیان ہند کے ہاں فکری وادبی سطح کے علاوہ معاملات زندگی میں تصوف کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہندوستان میں یہ اصطلاح ہمیشہ سے مقبول خاص وعام رہی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قدر مقبولیت کے باوجود اس پر اعتراضات بھی وارد ہوتے رہے ہیں مثلاً صوفی کا انداز تفکر غیر سائنسی ہوتا ہے، اس شعبہ میں تجربہ وجدانی اور الہامی ہے جس کی نوعیت ذاتی ہے، یہ تجربہ استدراکی اور استدلالی ہر گز نہیں وغیرہ۔ تاہم ان اعتراضات نے اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> '' اگر تصوف میں کوتاہیاں ہوں تب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں۔ ہمارا ادب، فلسفہ، مذہب تصوف کی گود میں پلا ہے۔ اگر ہم تصوف کا قلع قمع کریں (گے) تو بہت سی قیمتی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی یعنی احسان اور اخلاق فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی اور رہے گی۔''(۲۹)

تصوف کے بارے میں دو رائے بہر حال موجود ہیں لیکن مجموعی طور پر تصوف کو عام معاملات حیات اور ادب میں خاص، متعبر اور مستند مقام حاصل ہے اور تصوف کو عوام وخواص میں پسندیدگی بھی حاصل ہے۔ ادب میں بھی اس کا عمل دخل خاصا مقبول ہے۔

سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں ان کے متصوفانہ خیالات و افکار کسی ایک نظام فکر کی صورت میں نہیں ملتے بلکہ مختلف جگہوں میں مختلف مباحث کے دوران متصوف خیالات و افکار کا اظہار ملتا ہے۔ ادب شناس اور ادیب ہونے کی صورت میں تصوف سے ایک گونہ رغبت یا بے زاری لازمی ہے۔ سید عبد اللہ کے ہاں تصوف کے حوالے سے صحت مندانہ رجحان ملتا ہے اور وہ تصوف کو صرف ادب کے ساتھ وابستہ نہیں دیکھتے بلکہ تصوف کی عملی صورت پر بھی یقین رکھتے ہیں کیونکہ وہ تصوف میں شیخ احمد سرہندی کے مسلک کے قائل ہیں بقول عبد الماجد دریا آبادی:

> "شیخ موصوفؒ کے مکتوبات کے ضخیم دفتر ملک میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک، مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں صرف ایک ہی دعویٰ کی تکرار، صرف ایک دعوت کا اعادہ ہے اور وہ یہی ہے کہ صوفیہ کو عقائد و اعمال ہر شے میں کتاب و سنت ہی کو اپنا دلیل راہ بنانا چاہیے۔ اور اس کے خلاف جس کسی کے بھی اقوال ہوں انہیں مردود سمجھنا چاہیے۔"(۳۰)

سید عبد اللہ بھی ایسے ہی تصوف یعنی اسلامی تصوف کے ماننے والے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف کو ادب کا حصہ ہونا چاہیے اور اسلامی تصوف سے وہی مقاصد حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے کہ جن کے لیے اس فلسفہ کی شہرت ہے۔ سید عبد اللہ ادب میں تصوف کی نری روایت پرستی کے خلاف ہیں اور ان کے نزدیک اسلامی تصوف ادب میں انہی اعلیٰ مقاصد کے حصول کو یقینی بنائے جن سے معاشرے میں مثبت اور مستحسن اسلامی اقدار پروان چڑھ سکیں۔ سید عبد اللہ خود لکھتے ہیں:

> "انسانی زندگی عبارت ہے دین و دل کے مجموعے سے یا اس کی مناسب ترکیب وارتباط سے۔۔۔ دین و دل وہ کہسار ہیں جن کو صرف محبت کے ذریعے سر کیا جا سکتا ہے، یہ وہ قلزم ہیں جنہیں محبت کی کشتی کے ذریعے ہی عبور کیا جا سکتا ہے اور یہ کشتی ادب ہے جس کا اولین موضوع محبت ہے جس سے خدا کی محبت خارج نہیں۔ اس خدائی محبت کا دوسرا نام دین ہے۔ ادب وسیلہ کیمیائے محبت ہے جو کہ زندگی پر محیط ہے۔"(۳۱)

سید عبد اللہ اسلامی تصوف کے طرف دار ہیں اور اسلامی تصوف کو زندگی اور ادب دونوں کے لیے لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ وہ صوفیا کے قدر دان ہیں اور صوفیا کے وکیل بھی ہیں۔ سید عبد اللہ اسلامی تصوف کے حق میں لکھتے ہیں۔ تصوف کے بعض منفعل پہلوؤں سے اجتناب بھی تجویز کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اسلامی تصوف کی فعالیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ غیر اسلامی تصوف ایک یاس اور زندگی کو ایک بے عملی سے بھی دوچار کرتا ہے(۳۲) جبکہ سید عبد اللہ کے ہاں تصوف کی دو بڑی غایتیں ہیں:

"تصوف کی دو غایتیں ہیں ایک تو وصال خداوندی اور قرب خداوندی کہ انسان کو اس جسمانی وجود کے باوجود خداوند تعالیٰ کا ادراک ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ دل کی صفائی اور روحانی تزکیہ کے ذریعے ایسی علمی تجلیات حاصل ہوتی ہیں جو عقل و حواس ظاہری کے ذریعے ممکن نہیں رہی۔"(۳۳)

سید عبداللہ کا خیال ہے کہ صوفیائے کرام ہند نے ہند اسلامی معاشرے میں ایک ہمہ جہت کردار ادا کیا ہے۔ صوفیائے کرام کی وسیع المشربی، رواداری، تبلیغ اور مساوات کے درس سے اسلامی اقدار اور روایت سے غیر مسلم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے دائرے میں جوق در جوق شامل ہوئے۔ سید عبداللہ کے نزدیک آج بھی ان صوفیا اور اولیا کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جاسکے اور تبلیغ اسلام کا کام بھی بطریق احسن انجام پائے اور مسلمانوں کی کردار سازی بھی ہو سکے۔ بقول شیخ محمد اکرام:

"ہندوستان میں اسلام صوفیا کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا۔۔۔۔ ہندوستان میں تصوف نے بڑا فروغ حاصل کیا۔۔۔ آج تصوف کے انحطاط اور بعض وقتی اثرات سے تصوف کا پانسہ بہت ہلکا ہو گیا ہے لیکن پچھلی صدی تک کسی ہندوستانی مسلمان کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ کسی صوفی سلسلے میں منسلک ہوئے سوا اور کسی مرشد کامل کے بغیر اسلام کی روحانی زندگی سے کوئی حصہ لیا جاسکتا ہے۔"(۳۴)

صوفیا نے عموماً معاشرے میں ایک اعلیٰ کردار ادا کیا ہے۔ عوام الناس کو اعلیٰ اقدار، رواداری، لحاظ، ایثار و مساوات اور بھائی چارے کا سبق دیا ہے سید عبداللہ کا ایک "نظریہ باز بافت" دراصل ان کے تصوف کے مسلک پر کامل ایمان اور پختہ یقین کا ثبوت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ تصور باز یافت سیاسی اور جارحانہ نہیں بلکہ اس تصور محبت سے وابستہ ہے جس کے سب سے بڑے مبلغ حضرت داتا گنج بخش الہجویریؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت معین الدین اجمیریؒ تھے۔"(۳۵)

نظریہ باز یافت میں وہ اولیا اور صوفیا کے ذمے یہ کام لگاتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ اور فروغ کا مشن آج بھی انہی کے سر ہے۔ یہاں تک کہ وہ لکھتے ہیں اولیا اور صوفیا کی درگاہیں اور زیارات کو بھی اپنے حصہ کام آج بھی سر انجام دینا چاہیے۔ ایک اور جگہ وہ یوں لکھتے ہیں:

"میں کچھ اس طرح سوچتا ہوں جس طرح حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت معین الدین اجمیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ اور شاہ گیسو درازؒ سوچتے تھے۔ میرے تصور کی تحریک روحانی اور پیغامی ہونی چاہیے محبت کی اور دکھوں سے ہمدری کی۔ دردمندی کے اس جذبے کو زندہ رکھنا ہے اور پورے ہندوستان (بالخصوص ہندو اور سکھ آبادی) کو محبت سے مسخر کرنا ہے۔"(۳۶)

یہ اقتباس سید عبداللہ کے متصوفانہ خیالات کو ظاہر کر رہا ہے کہ سید صاحب کے نزدیک اولیا اللہ کا اصل منصب اور ذمہ داری محبت کو پھیلانا ہے اور اس محبت کا عملی ثبوت کئی بزرگ ہستیاں دے بھی چکی ہیں۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی عوام بلا تخصیص مذہب و مسلک محبت اور دردمندی کے مستحق ہیں۔ خاص طور پر وہ غیر مسلم آبادی جو کہ روحانی اور اقتصادی تہی دستی کا شکار ہے اور وہ لوگ جو اس دنیا میں غربت اور افلاس کے دکھوں میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اہل اسلام کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسلام کی آفاقی سچائی اور بین الاقوامی مواخاۃ میں ان کو شامل کرے اور اس سلامتی کے دائرے میں ان کو لا کر ان کی دائمی سرخ روئی اور فلاح کا مستحق بنادے۔ یہی اسلام کا روحانی اور ابدی پیغام بھی ہے جس کی ترسیل کا اصل اور مستند و معتبر وسیلہ "اسلامی تصوف" ہی ہے۔

سید عبداللہ صوفیائے کرام کے مشن کے لیے رطب اللسان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صوفیائے ہند ہی اسلام کے اصل پیغام یعنی امن اور سلامتی کے علمبردار ہو سکتے ہیں۔ ذات پات میں جکڑے ہوئے ہندو کو عزت نفس اور توقیر ذات کا احساس اسلام کے ذریعے ہی دلایا جا سکتا ہے۔ سید صاحب ان دیگر مذاہب کے پیروؤں کو دائمی کامرانی دینا چاہتے ہیں اور یہ فرض انہی خانقاہوں اور درگاہوں سے انجام پائے گا کیونکہ یہاں محبت اپنائیت اور مساوات کا درس ملتا ہے کیونکہ اسلامی اسلوب حیات کا عمدہ نمونہ انہی صوفیا کی زندگی سے منعکس ہوتا ہے جو خود کو مادیت اور زندگی کی دیگر آلائشوں سے پاک رکھتے ہیں اور ماضی میں صوفیا اور ان کی درگاہوں اور خانقاہوں نے غیر مذاہب کے لوگوں کو اسلام کے دائرے میں داخل بھی کیا ہے۔ سید صاحب اسلامی تصوف کو ایک قوت اور ایک تحریک جانتے ہیں خواہ ادب میں ہو یا عملی زندگی میں ان کے نزدیک یہ فلسفہ اپنی کجیوں اور کمزوریوں کے باوجود انسانی فلاح اور تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شریعت اور طریقت کی یہ مناقشت دراصل ایک جزوی اور محدود معاملہ تھا۔ غرض مند لوگوں نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ورنہ صوفی کا دیندار ہونا اور دیندار کا صوفی ہونا بڑی حد تک معمولات میں سے تھا۔" (۳۷)

لہذا سید عبد اللہ کے نزدیک تصوف کا چلن ایک مثبت حیلہ ہے خواہ شعر میں ہو یا زندگی میں، اس کی موجودگی ایک اعلیٰ غایت کے حصول کا وسیلہ ہے۔ ان کے نزدیک تصوف کا فلسفہ فعال اور اعلیٰ اقدار کی ترویج اور اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ ہے اور اس ضمن میں اس کو مزید موثر اور زود اثر بنایا جا سکتا ہے۔ تصوف کے باب میں ان کا انداز تفکر فعال اور عملی ہے۔

اتحاد عالم اسلام

'سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی عناصر' میں اسلامی عناصر سے تشکیل پانے والے نظام فکر اپنی اٹھان اور فکری عظمت کے حوالے سے ایک الگ شان اور رعب رکھتا ہے۔ اسلام کے باب میں وہ نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھتے ہیں اور عالم اسلام کی تابناکیوں کو پھر سے بحال کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی تاریخی عظمت کے قائل ہیں اور ان کا ماننا یہ ہے کہ اسلام کی عظمت کی بازیابی میں عالم اسلام کا اتحاد ہی اساسی کردار ادا کر سکتا ہے۔ وہ اسلام کے تصور قومیت کے وکیل بھی ہیں اور اس تصور کے نمایاں آثار اور خوبیوں کی تشریح بھی کرتے ہیں ان کے مطابق اسلامی تصور قومیت دردمندی، درد کی سانجھ، ہمدردی، مساوات اور عدل پر قائم ہے۔ یہ اپنے انفرادی خصائص کی وجہ سے مسلمانوں کے اجتماعی فکر و عمل کو مستحکم کرتا ہے اور اسلام کے نام لیواؤں کو ایک برادری بنا دیتا ہے۔ مسلمانوں کی مثال ایک جسم اور دیوار کی سی ہے۔ اس جسم اور دیوار میں ہر کلمہ گو شامل ہے، چاہے وہ کسی بھی تہذیب و ثقافت زبان و نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس ضمن میں چوہدری نذیر احمد خان کا قول ہے:

> ''اسلامی معاشرہ چونکہ بشکل ایک ملت واحدہ کے ساری دنیا میں پھیلتا تھا اس لیے اخوت کا ایسا نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا گیا جس میں تمام پرانے عقائد کو ترک کر کے مسلمان برادری کو نسل، رنگ، جغرافیائی حدود، زبان منصب، طبقات کی مصنوعی حدود سے یکدم آزاد کر دیا۔۔ کالے اور گورے کی، عربی اور عجمی کی، امیر اور غریب کی، ایشیائی اور افریقیائی کی تمیز اٹھ گئی (اٹھا دی گئی)۔''(۳۸)

یعنی اسلام کا یہ نیا عقیدہ تھا کہ برادری ازم کی بنا صرف کلمہ توحید پر رکھ دی جائے اور کرہ ارض کے سارے مسلمانوں کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی رنگ، نسل، زبان تہذیب و ثقافت سے ہو ایک بنا دیا جائے اور ہر قسم کے اختلافِ ظاہری و باطنی کے باوجود اس امت محمدیہ کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے۔ اسی اخوت اور بھائی چارے کو مسلمانوں نے اپنے ہاں نہایت عزم اور سلیقہ مندی سے اپنائے رکھا اور اپنی مرکزیت کو خلافت پر مجتمع رکھا۔ اس خلافت پر پر ارتکاز کم و بیش تیرہ سو سال تک

کسی نہ کسی صورت قائم رہا لیکن جب مسلمان سے خلافت چھن گئی اور مرکزیت کا یہ شیرازہ بھی ٹوٹ گیا تو پھر زوال کا عمل اپنے تکملہ کو جا پہنچا۔ مسلمان چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہو گئے یا کر دیے گئے۔ ان کے اتحاد کو ایک منظم سازش کے تحت پارہ پارہ کر دیا گیا اور ان ممالک کی اپنی اپنی اکائیوں نے اپنی اپنی شناختیں بنا لیں اور یوں ملت اسلامیہ چھوٹی قومیتوں میں بٹ گئی۔ اس سنگین صورت حال پر مسلمان غفلت کی نیند سو نہیں گئے بلکہ کئی تحریکیں اتحاد بین المسلمین کی اٹھیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر چھوٹی بڑی کوششیں ہوتی رہیں۔ نظری اور عملی سطح پر مسلمان مفکرین اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے اور احیائے اسلامی کے لیے کام کیا کیوں کہ اتحاد عالم اسلام، اسلامی فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے ساتھ ہی یہ اسلامی حکومت کا فرض اور مسلمانوں کی شناخت اور ملی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی منصوبہ سازی اور قانون سازی کرے۔

سید عبداللہ کا اس ضمن میں نظریہ یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے اور اسلام کا قلعہ ہے لہذا قیام پاکستان کے مقاصد میں سے ایک مقصد اتحاد عالم اسلامی کا قیام بھی ہے اور اس کی تقویت کی کوششیں کرنی ہیں۔ اس استدلال میں وہ قائداعظم کی ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کی عید الفطر کے موقعے پر کی گئی تقریر پیش کرتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا:

> ''تمام اسلامی مملکتوں کو عید مبارک ہو۔ میرا عید کا پیغام سوائے دوستی اور بھائی چارے کے کیا ہو سکتا ہے۔ ہم یکساں طور پر خطرناک اور کٹھن دور سے گزر رہے ہیں سیاسی اقتدار کا جو ڈراما فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں کھیلا جا رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ہم نے اسلامی اتحاد ہی کے ذریعے دنیا کے مشورہ خانوں میں اپنی آواز کی قوت محسوس کرا سکتے ہیں۔''(۳۹)

قائداعظم کا سیاسی وجدان اور ان کا شعور اس مختصر اقتباس میں عیاں ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسمپرسی اور کمزور سیاسی حیثیت سے آگاہ ہیں۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کی بے بسی فلسطین و کشمیر میں ان کی پیش نظر تھی۔ قائداعظم کی اس تقریر میں نا امیدی اور یاس نہیں بلکہ ایک عزم کی کھنک سنائی دے رہی ہے اور یہ عزم ہے کہ ہم ''اتحاد اسلامی'' کے ذریعے ان مشورہ خانوں میں اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں اور سیاسی سطح پر بین الاقوامی حقوق کا تحفظ اور دفاع کر سکتے ہیں اور یہ بھی عالمی سیاسی منظر نامے پر مسلمانوں کے بین الاقوامی حقوق کا تحفظ اور دفاع لازمی ہوگا اور اس حوالے سے مسلمانان پاکستان خصوص سے کام کریں گے۔ سید عبداللہ کے اتحاد عالم اسلامی کی تقویت اور قیام کے باب میں خیالات و نظریات خاصے فکر انگیز اور فعال

ہیں۔ یہاں اس ضمن میں ان کے چند خیالات اہم نکات کی صورت میں دیئے جارہے ہیں جن سے ان کا تصور اتحاد نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

۱۔ پاکستان مؤتمر عالم اسلام کا رکن ہو۔
۲۔ پاکستان کو مسلم ممالک سے گہرے اور مضبوط روابط قائم کرنے ہوں گے اور سیاسی و تجارتی ارتباط کی صورتیں پیدا کرنا ہوں گی۔
۳۔ اسلامی بلاک بنانا چاہیے جو اسلام کے لیے روحانی اور تمدنی مقاصد کی ترقی کے لیے کام کرے اور اس بلاک کا مقصد اتحاد اور تبلیغ و اشاعت اسلام بھی ہو۔
۴۔ اتحاد اسلامی کے استحکام کی خاطر پاکستان اور دوسرے ممالک کے مابین وفود کا تبادلہ ہو اور تفہیم اور مفاہمت کی فضا پیدا ہو۔ کھیل، ثقافتی طائفے، اہل علم وفود کے تبادلے، کانفرنسیں اور ورکشاپیں ہوں۔
۵۔ مسلمانوں کے ایک بین الاقوامی ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جس کا واحد کام اسلام کے سلسلے میں ہر قسم کی معلومات جمع کرنا ہو اور ایک تحقیقی ادارہ بھی قائم ہو جو اسلامی مملکت کو درپیش مسائل کا مطالعہ و تجزیہ کرے۔ اس کی شاخیں تمام اسلامی ممالک میں ہوں۔ یہ ادارہ مختلف اسلامی ممالک میں کتابوں کی اشاعت اور تبادلے کا اہتمام کرے ۔ایک مشترکہ اسلامی مرکزی لائبریری قیام عمل میں لایا جائے۔
۶۔ غیر عرب ممالک میں عربی زبان کی ترویج اور تدریس کا اہتمام کیا جائے۔
۷۔ مسلم اقوام کی اپنی الگ اعلیٰ انجمن ہو، او۔ آئی۔ سی کی غیر فعال نہ ہو۔
۸۔ باہمی تکنیکی معاونت سے مختلف اسلامی ممالک کے وسائل اور ذخائر کو بروئے کار لائے جائیں۔
۹۔ عالم گیر مسلم نیوز ایجنسی، اسلامی عالمی بینک، اسلامی عالمی ہلال احمر عالمی اسلامی اور ادارہ السنہ جیسے ادارے بنائے جائیں۔
۱۰۔ مغربی علوم کو اسلامیآیا (مسلمان) جائے۔ دارالتحقیق کھولے جائیں جو مغربی کتب کو اسلامی پس منظر میں ڈھالے۔

یہ تمام تجاویز بڑی تفصیل کے ساتھ سید عبداللہ نے اپنی کتاب 'پاکستان۔ تعبیر و تعمیر' میں بیان کی ہیں۔ وہ ان تجاویز کے ساتھ خاصی وضاحت کرتے ہیں اور یہ یاد کراتے ہیں کہ اتحاد عالم اسلامی کوئی خواب نہیں بلکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے اگر اس کے لیے مخلصانہ اور ایمان دارانہ کوششیں کی جائیں تو وہ ابدی کامرانیاں اس ملت بیضا کو حاصل ہوں گی کہ جن سے عظمت رفتہ کا خواب تعبیر پائے گا۔ سید عبداللہ ان تجاویز کے بعد ایک سوال اٹھاتے ہیں:

> "ان سب باتوں کے بعد یہ بالکل واضح امر ہے کہ ایسے بڑے منصوبے حکومت یا ملک کے ارباب فکر اور باثروت حضرات کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتے۔ پس کیا یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ جمہوریہ پاکستان، جمہوری سطح پر اس کا لائحہ عمل خود تیار کر کے قائداعظم اور علامہ اقبال کے عقیدہ اتحاد اسلام کے لیے تقویت کا سامان مہیا کریں گے۔"(۴۰)

اس سوال میں در حقیقت ایک صلاح پوشیدہ ہے کہ اتحاد عالم اسلام کا خواب اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب حکومتی سطح پر اس حوالے سے پالیسی سازی کی جائے گی اور یہ بھی پاکستان ایک ریاست کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس کی معاشی وجغرافیائی (socio-economics) حالات اور محل وقوع، اس کو آنے والے وقتوں میں ایک بڑی اور کلیدی حیثیت دے گا اور اس حوالے سے اس مملکت نے اسلامی دنیا کو رہنمائی دے گا اور آج سی۔پیک کے بعد یہ سارے دعوے سچ ہوتے دکھائی دے رہے ہیں لہٰذا پاکستان کی سیاسی طاقتوں اور سیاسی قوتوں کو اس ضمن میں ذمہ دارانہ اور عقلمندانہ اقدامات سے کام لینا ہو گا اور یہی سید عبداللہ کا سوال تھا جو در حقیقت ایک مناسب اور مخلصانہ تجویز ہے۔

سید عبداللہ پاکستان کو اسلام اور اسلام کو پاکستان کے لیے لازم وملزوم گردانتے ہیں نیز وہ پاکستان کو عالمی اتحاد اسلام کا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے جو قیام پاکستان کے بعد اس مملکت کے کندھوں پر ہے۔ پاکستان نے اس ذمہ داری سے کبھی انکار بھی نہیں کیا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت پاکستان کا پہلی اسلامی جوہری طاقت ہونا ہے۔ اس حوالے سے سارے عالم اسلام کی رہبری کی ذمہ داری پاکستان کے ذمہ ہے۔ ائیر مارشل اصغر خان لکھتے ہیں:

> "پاکستان محض اس لیے وجود میں لایا گیا تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن قائم کیا جائے۔ اسلام اور صرف اسلام ہی اس کا محرک تھا اور یہی وہ مضبوط رشتہ ہے جو آئندہ چل کر اہل پاکستان کا قومی اتحاد برقرار رکھ سکتا ہے۔۔۔ اگر اسلام ہی وہ قوت ہے جس کی بدولت پاکستان بنا اور یہی اس کو متحدہ رکھنے کا بھی ضامن ہے تو اسے بین الاقوامی سیاست کے میدان میں پاکستان کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونا چاہیے۔۔۔ (اس میں شک نہیں) پاکستان بین الاقوامی تعلقات میں اسلام ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔"(۴۱)

ائیر مارشل اصغر خان کی رائے سے اختلاف ممکن نہیں پاکستان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوششیں کرے اور بین الاقوامی سیاست کے منظر نامے پر اقوام عالم اسلامیہ کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی پاکستان ہی سر

ہے۔سید عبداللہ بھی پاکستان کے اس منصب پر فائز کرتے ہیں اور یہی اتحاد عالم کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دے سکتا ہے۔

سید عبداللہ اتحاد عالم اسلامی کے باب میں نہایت منطقی اور عملی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بحث کرتے ہیں۔ اس باب میں اُن کی تمام تر بحث میں جذباتیت یا غیر منطقی جوش دکھائی نہیں دیتا بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر اسلامی ممالک کے مسائل اور حالات سے کماحقہٗ آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ملت بیضا کو ایک پلیٹ فارم پر لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے وہ اشتراکات کی تجاویز پیش کرتے ہیں جو اس اسلامی دنیا میں اتحاد کا موجب بنے۔ وہ اسلامی ممالک کو ایک عظیم مقصد کو سامنے رکھ کر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اس زوال سے دل برداشتہ نہیں وہ اس زوال کو بھی الگ زاویہ دیکھتے اور دکھاتے ہیں:

> ''ہزار سال سے دنیائے اسلام نے عملی تعاون و تناصر سے جس بے پروائی اور غفلت کو روا رکھا اور اسلام کے منشائے اصلی اور حقیقی نصب العین سے جو علیحدگی اختیار کیے رکھی اس کی سزا سے ''انحطاط'' کی صورت میں ملی۔۔۔۔۔ حالانکہ اسلام کا روح اس بات کی متقاضی تھی کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی حمایت کرے۔ اس کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں شریک ہو۔ اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے اور ان کے مقابلے کے لیے جان و مال صرف کرے۔''(۴۲)

سید عبداللہ اس معاملے میں دکھ محسوس کرتے ہیں کہ تاریخ میں ایسے شواہد موجود ہیں جب مسلمانوں نے ایک دوسرے کی جڑیں کاٹیں۔ اندرونی معاملات میں دخل اندازیاں کر کے ایک دوسرے کو زک پہنچانا تھالہٰذا ملت اسلامیہ کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور ملت اسلامیہ غلامی کے طوق میں جکڑ دی گئی۔

سید عبداللہ اسلامی اتحاد کے لیے عملی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی کوششیں جاری رکھنے کی تجویز دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب میں بھی قلم کار اسلامی اقدار اور روایات کو یوں بیان کریں کہ اسلامی اتحاد اور اسلامی روح سے عوام الناس کا تعارف ہو۔ اکبر اور اقبال کی طرح چاہتے ہیں کہ ادبا و شعرا اسلامی دنیا کو لاحق مسائل کو بھی ادب میں برتیں۔ تاہم وہ ادب کی روح کو اس مقصدیت کی بھینٹ نہیں چڑھاتے کہ اعلیٰ مقاصد کے لیے وہ ادب کی اہمیت کے قائل ہیں ان کا خیال ہے:

"گھاس کی نازک پتی اس ریت کے ننھے سے ذرے سے لے کر کہکشاں کے غبار خوش رنگ تک ہر شے ادب کا موضوع بن سکتی ہے بشر طیکہ وہ ادیب کے ذاتی جذبے کا حصہ بن چکی ہو اور اس کا طریق کار ادبی (تخیلی و تخلیقی) ہو اور حسرت بخشی و حسن کاری اس کا مدعا ہو۔ اس لحاظ سے (مذکورہ بالا) ہر موضوع ادب اور ادیب کے لیے جائز اور ممکن ہے۔ یہاں تک کہ خالص فکری حقائق بھی اگر جذبے کا رنگ اختیار کر چکے ہوں اور حسین پیرایہ ہائے اظہار میں ڈھل جائیں تو ممانعت کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ ہم اکبر اور اقبال کے معاملے میں دیکھتے ہیں۔" (۴۳)

اسلامی اتحاد اسلامی تعلیمات اور اقدار کی بذریعہ ادب ترویج کا اس سے بہتر اور معتدل اصول شاید ہی کوئی ہو۔ اسلامی اتحاد کے ضمن میں اسلامی ثقافت اور اسلامی عمرانی اصول کے ساتھ ساتھ باہمی مفاہمت کا ادب بھی تخلیق کیا جانا چاہیے اور ثقافتی بعد کو پاٹنے کے لیے اور اجتماعی سوچ کو رواج دینے کے لیے اعلیٰ ادبی روایات کی ضرورت ہے۔ سید عبداللہ نے 'پاکستان تعبیر و تعمیر' میں اتحاد عالم اسلام، ادب کے وسیلے سے باب باندھا ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ ادب:

"(اتحاد کے) وسائل میں سے ایک موثر اور اہم وسیلہ یہ بھی ہے کہ جملہ مسلم اقوام کے ادب کے مشترک عناصر کی جستجو کی جائے اور ان کے ذریعے وحدت ملی کے بنیادی جذبوں کو مستحکم کیا جائے۔" (۴۴)

اس اقتباس کے ساتھ بحث کو سمیٹتے ہوئے کہ سید عبداللہ کے اسلامی عناصر میں اتحاد عالم اسلامی کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ملی اتحاد کے لیے ہر مسلمان کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر عملی حصہ لینا چاہیے۔ اتحاد اسلامی میں حکومتوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس کا رجحان اور دباؤ بھی خاص کام آسکتا ہے۔ اتحاد اسلامی کو بامقصد اور بامعنی بنانے کی ضرورت اس کے فیوض و برکات کو عام انسان تک پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ عوام اور خواص اس عظیم کار خیر کے لیے یک سوئی سے کام کریں۔ اتحاد عالم اسلام کے متعلق چوہدری نذیر احمد خان رقم طراز ہیں:

"اتحاد عالم اسلامی کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے تعلیمات اسلامی کے مطابق امیری، غریبی، رنگ ،نسل، زبان، علاقہ، رسم و رواج اور لباس کی تمام بندشوں کو توڑ کر ایک ملت واحدہ قائم کی جائے جو صحیح معنوں میں سارے دنیا کے شہری (Citizens of the world) کہلانے کے مستحق ہوں۔" (۴۵)

سید عبد اللہ، چوہدری نذیر احمد خان سے ایک قدم آگے نکل جاتے ہیں اور ان کا اتحاد عالم کے حقیقی حکمت عملی یہ ہے کہ اتحاد عالم اسلامی کے لیے ہم پاکستان کو مضبوط کریں پاکستان کا استحکام اور مضبوط بنیادیں ہی اتحاد عالم اسلامی کی ضمانت بنیں گی۔ پاکستان کے باسی اگر استحکام پاکستان کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائیں گے تو در حقیقت یہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کے لیے بھی کام ہو رہا ہو گا۔ بحث کو ختم کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتحاد عالم اسلامی کے لیے تمام مسلمانوں کے مفادات اور تعلقات کو ایک اشتراک دینا ہو گا۔ اس اشتراک کے بعد سید عبد اللہ نے عالم اتحاد اسلامی کی چار عناصر ترکیبی کا ذکر کیا ہے:

ا۔ عربی زبان　　ب۔ اسلام اور تمیز رنگ و نسل　　ج۔ نظام حج　　د۔ خلافت

انہی عناصر کی فعال صورت نے عظمت اسلام کی وقعت اور مواخاۃ مسلم کی دھاک زمانے میں بٹھائی تھی اور آج عربی کی وقعت، حج کی اجتماعیت، رنگ و نسل کے امتیاز سے اجتناب اور خلافت کی مرکزیت کا قیام عالم اسلام کو متحد کر سکتا ہے۔ اسی کے لیے سیاسی، سماجی، ثقافی، تعلیمی، اخلاقی اور روحانی پلیٹ فارموں پر محنت اور کوشش کی ضرورت ہے اور فروعی اختلاف اور فقہی بانٹ سے بالاتر ہو کر اس اتحاد کی ذمہ داری انجام دینا ہو گا۔

فکر اقبال میں اسلامی عناصر

ڈاکٹر سید عبد اللہ کی نثر میں سب سے زیادہ ثروت مندی اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے باب میں ملتی ہے۔ سید صاحب علامہ اقبال کے حقیقی محب اور فکر اقبال کے ماہر مفسر، معروف شارح اور انتھک وکیل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ سید عبد اللہ کی اقبال شناسی کا ایک مسلمہ ثبوت ان کی کتاب ''اعجاز اقبال'' ہے۔ جس میں ان کے اقبالیات کے موضوع پر لکھے گئے تمام مقالات و مضامین یکجا کر کے شائع کر دیے گئے ہیں۔ سید صاحب کا اقبال سے خاص شغف تھا اور انھوں نے اقبال پر اپنی ندرت فکر اور فہم سے خاصے پائے کے مضامین تحریر کیے ہیں۔ محمد اکرام چغتائی ''اعجاز اقبال'' کے پیش گفتار میں سید صاحب کے ذوق اقبالیات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''اقبالیات، میں سید عبد اللہ کا منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک مثالی معلم، نقاد اور محقق ہونے کی حیثیت سے اپنے تلازمہ میں بھی اقبال کی فکر اور شخصیت سے گہرا لگاؤ پیدا کر دیتے تھے۔ اس اعتبار سے انہیں محرک اقبالیات بھی کہا جاتا ہے۔''(۴۶)

"محرک اقبالیات" کا لقب اس لیے ملا ہے کہ سید صاحب اپنے طلبا اور طالبات کے اندر اقبال شناسی کی تحریک پیدا کرتے تھے۔ سید عبد اللہ ایک سلجھے ہوئے باسلیقہ اور متوازن فکر رکھنے والے محب اقبال اور اقبال شناس کے طور پر علمی و ادبی حلقوں میں تسلیم کیے جاتے تھے۔ اقبالیات کے حوالے سے انھوں نے ایک ہمدرد شارح اور مستند مفسر کے طور پر نیک نام کمایا۔ فکر اقبال کی ترویج اور تفہیم کے لیے نثر میں اعلیٰ پائے کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور مقالات لکھے جو اپنے دور کے موقر اور معتبر جرائد میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ چند کتابیں بھی شائع کیں جن میں 'مقامات اقبال، مسائل اقبال، سہل اقبال، ولی سے لیکر اقبال تک، مقاصد اقبال، مطالعہ اقبال کے چند رخ، متعلقات اقبال اور کلیات 'اعجاز اقبال' شامل ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی مرتب کردہ لیکچروں کی کتاب 'طیف اقبال' بھی اہم ہے۔ سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے:

> "ہم دور حاضر میں اقبال کو اسلامی ادب کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دے لیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا
> کہ پاکستان، قیام پاکستان کے بعد اقبال کی آواز دبی نہیں زیادہ بلند ہوئی ہے۔"(۴۷)

سید عبد اللہ کے فکری نظام میں خصوص سے اسلامی عناصر کے حوالے سے ایک ذہنی قربت اور ہم خیالی پائی جاتی ہے۔ سید عبد اللہ گو کہ خود فلسفی اور شاعر نہ تھے لیکن اقبال کی سوچ اور فکر ان کے مزاج و منشا اور نظریہ حیات سے میل کھاتی ہے۔ وہ اقبال کے عزم اور مشن کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فلسفہ کے خوشہ چین بھی ہیں۔ سید عبد اللہ نے فکر اقبال سے خوب استفادہ کیا اور اقبال سے استفادہ کی وجوہ اسلامی تعلیمات ہیں جیسا کہ یہ مسلمہ سچ ہے کہ اقبال نے اپنی فکری نظام کو اسلامی تعلیمات وفلسفہ پر استوار کیا لہٰذا سید عبد اللہ ان اسلامی ماخذات اور تعلیمات کو اپنے نثری سرمائے میں برتتے ہیں۔ اقبالیات کے حوالہ سے سید عبد اللہ کا مستند حوالہ شارح اقبال ہونا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے اقبال کی نظم و نثر دونوں کے حوالے سے خوب کام کیا۔ میر زادیب ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "سید صاحب کا انداز نظر نہ توعقیدت مندیوں کے بوجھ سے گراں بار ہے نہ اور اپنی انتقاد کی
> زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کا واضح اور غیر مبہم نصب العین سچائی کی تلاش ہے۔"(۴۸)

سید عبد اللہ اقبال کو ایک مسلم مفکر اور فلسفی کے طور پر لیتے ہیں۔ ان کی پسندیدگی اور پیروی کی وجہ اقبال کا اسلامی احیا اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے فکر مندی اور تفکر ہے بینہ اقبال نے انفرادی مسلمان کے اذہان و کردار کی تعمیر اور اس کی روحانی بالیدگی کے لیے جو فلسفہ اور میکانزم دیا ہے وہ بھی سید صاحب کا پسندیدہ موضوع ہے۔ سید عبد اللہ کے مذاق میں اسلام اور مشرقیات کے طرف ایک ایک خاص جھکاؤ تھا۔ انھوں نے مطالعہ اقبال کے ضمن میں اسلامی عناصر کو ملحوظ رکھا

جو کہ ان ذوق اور رجحان کے عکاس تھے۔ سید عبد اللہ کا نظریہ معاشرت اور کلچر میں اسلامی عناصر کا خاص مقام ہے وہ ثقافتی عوامل و اجزا سے غیر اسلامی عناصر کے خلاف ہیں اور انہیں نکال باہر کرنے کے خواہش مند ہیں۔ دوم سید عبد اللہ پاکستانی معاشرے کو خالصتاً اسلامی معاشرت کا عکاس دیکھنے کے آرزومند ہیں لہذا وہ علامہ اقبال کے اس فلسفہ اور تصورات سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں جو فرد کی تربیت اسلامی، اسلامی تعلیم نظام اور ثقافتی عناصر اور خوشحال اسلامی معاشرہ کی تشکیل دینے میں کردار ادا کرتے ہیں۔ سوم سید عبد اللہ اقبال کے ہاں پائے جانے والے ان نظریات اور خیالات کو اپنے نثری اثاثے میں جگہ دیتے ہیں جو فرد کی خودی، علمی اور روحانی تربیت اور نگہداشت کرتے ہیں نیز وہ افکار اقبال کہ جو مسلمان کی نشاۃ ثانیہ، عظمت رفتہ کی بازیافت، جہاد، تسخیر کائنات، دین کی خدمت اور تبلیغ، غیرت و حمیت، اظہار رائے، تعلیم وغیرہ کے باب میں اصلاح و عمل کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ سید عبد اللہ علامہ اقبال کو ان تمام امور میں اپنا رہنما مانتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے:

> ''اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، وہ حکیم بھی ہے وہ کلیم بھی، وہ خودی کا پیغمبر بھی ہے اور بے خودی کا رمز شناس، وہ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور محیی الملت و دین بھی، وہ توقیر آدم کا مبلغ بھی ہے اور تحقیر انسان سے درمند بھی، اس کے کلام میں فکر و ذکر یم آغوش ہیں اور خبر و نظر آئینہ یک دگر۔''(۴۹)

سید عبد اللہ خلیفہ صاحب کے ہم خیال ہیں۔ وہ اقبال کو حکیم الامت اور شاعر مشرق سمجھتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال سے فکری تربیت حاصل کرنے اور اس کو عام کرنے کے لیے ساری عمر کام کرتے رہے۔ ان کی کتب اور ان کے مقالات اس بات کا عملی ثبوت ہیں کہ سید عبد اللہ اور اقبال کے درمیان ایک روحانی رشتہ بھی موجود تھا۔ سید عبد اللہ نے فکر اقبال کے مطالعے سے اس فکر کے سرچشموں تک رسائی کی کوشش کی، فکر اقبال کے ہم خیال فلاسفہ اور مفکرین سے استفادہ کیا۔ اسلامی فکر کی بنیادوں کو تلاش کیا۔ سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے کہ اقبال کا فکری نظام اسلامی فلسفہ کی دین ہے یعنی اقبال بھی اسلام کی فعالیت کو مانتے ہیں اور اسلام کو بطور ضابطہ حیات کے تسلیم کیا ہے اور پھر عظمت رفتہ کے کھو جانے کا احساس اور اس کو دوبارہ حاصل یا بحال کرنے کے لیے ایک عملی لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہیں۔ یہی وہ انقلابی پیغام تھا جس نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا ولولہ اور نئی روح پھونک دی۔ سید عبد اللہ بھی اسی انقلاب کے داعی ہیں وہ اقبال کی انقلابی فکر کی ترسیل کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ اسلامی انقلاب کے نقیب بن کر اقبال کے تصورات اور فکر کی شرح اور تفسیر بیان کرتے ہیں۔ سید عبد اللہ کا خیال ہے کہ اقبال کا پیغام انقلاب آفریں ہے جیسا کہ انھوں نے خود ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> "اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالے میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیر ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے جزوی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"(۵۰)

اس انقلاب سے مراد قطعاً سیاسی یا معاشی انقلاب نہیں بلکہ اس سے مراد اسلامی انقلاب ہے جو مسلمانوں کے کردار میں پیدا ہو گا اور پھر اس کے ثمرات سے معاشی، معاشرتی و عمرانی اقدار میں پھوٹیں گی اور اسلامی معاشرت میں ایک اسلامی رنگ اور ترفع جنم لے گا اور پھر ایک ایسا معاشرہ ظہور میں آئے گا جس کی اولین صورت مدینہ میں دکھائی دی تھی۔

سید عبد اللہ اقبال کے تصور قومیت سے اتفاق کرتے ہیں اور اس کو عین اسلامی تسلیم کرتے ہوئے اس تصور قومیت کو عملی اور اسلامی روح کا عکاس قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے سید صاحب کے مباحث ان کے مختلف مضامین اور مقالات میں تفصیل سے ملتے ہیں مثلاً اقبال کا سیاسی تفکر، اقبال اور قومیت، خطبات اقبال پر ایک نظر جس میں خصوص سے اقبال کے تصور قومیت کو ہی موضوع بحث بنایا ہے۔ ان مباحث میں سید اقبال کو نیشنل ازم یعنی وطن پرستی کے الزام سے بری کرتے ہیں۔ قومیت اور نیشنل ازم میں فرق کو واضح کرتے ہوئے علامہ اقبال کا اقتباس نقل کرتے ہیں جہاں اقبال نے لکھا ہے:

> "جب میں نے محسوس کیا قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے دنیائے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جا رہے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محب وطن کو میں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصل فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔"(۵۱)

اور پھر انہوں نے وطنیت یعنی وطن پرستی کو مذموم جانا اور قبیح قرار دیا لیکن اسلام کا تصور قومیت کا مفصل پرچار کیا اور کھلے کھلے بندوں اسلام کی قومیت کے تصور کو بیان کیا جو صرف اور صرف ایک کلمہ طیبہ کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے اور اس میں اسلامی بھائی چارہ میں کہیں رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کا کوئی عمل دخل نہیں۔

سید عبد اللہ نے اقبال کی فکر سے بھی اسلامی عناصر حاصل کیے اور ان کو اپنے فکری نظام میں شامل کیا ساتھ ہی اقبال کے فلسفیانہ مسائل کی تفہیم کے لیے کام کیا کیونکہ اقبال کے فلسفیانہ مسائل عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ یہاں محمد شعیب آفریدی کی رائے حسب حال معلوم ہوتی ہے:

> ''علامہ اقبال نے جو مباحث اٹھائے ہیں ان کے سمجھنے کے لیے مغربی فلسفہ اور علوم و معارف کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت پر پورا پورا عبور حاصل ہونا چاہیے۔ محض فلسفہ، علوم طبعی، تاریخ، تہذیب و تمدن یا مذاہب کا مطالعہ کافی نہیں چونکہ یہ اہلیتیں ہر شخص بہم نہیں پہنچا سکتا۔''(۵۲)

اقبال کے فکری نظریات کی تفہیم، شرح اور تعبیرات ضروری ہیں کیوں کہ عام آدمی ہی پر کیا موقوف آج کا پڑھا لکھا انسان بھی اس فکر کی تفہیم کرنے سے قاصر ہے۔ اقبال کی فکر ایک خاص لسانی، تہذیبی اور فلسفی تجربے کی دین ہے۔ اقبالیات کے جن موضوعات کو سید صاحب نے خاص طور پر چنا ان کی فہرست کا سرسری جائزہ سید صاحب کے ذوق اور توجہ طلب موضوعات سے روشناس کراتا ہے:

ا۔ اقبال کے محبوب مشرقی پیرووں سے تقابلی مطالعہ جن میں غالب، رومی، حافظ، شیخ اکبر، فخر رازی، محمود شبستری، ابن خلدون اور البیرونی نمایاں ہیں ۔

ب۔ اقبال و مغرب

ج۔ اقبال اور قومیت

د۔ اقبال کی خودی، سیاسی شعور، تصوف، نظریہ تعلیم، مرد یقین وغیرہ۔

اقبال پر اپنے کام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنی زندگی میں جب بھی لکھا ہے ضرورت واقعی کی مجبوری سے لکھا۔۔۔اقبال کے سلسلے میں بھی یہی ہوا ہے۔ مطالعہ اقبال کی وسیع الاطراف تحریک میں میرے لیے اس امر کی گنجائش زیادہ نہیں کہ بالکل اوریجنل موضوعات پر کچھ لکھا جاتا۔ ملک کے اندر اور باہر بہت سے لکھنے والے غور و تحقیق میں مصروف ہیں اور کچھ نہ کچھ ہر موضوع پر لکھا جا چکا ہے۔۔۔ میں نے زیادہ تر ان مسائل پر لکھا جن کا تعلق مشرقیات سے ہے۔''(۵۳)

سید عبداللہ نے اپنے مسلک کا اظہار اس اقتباس میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ کیسے انھوں نے اپنی مرضی اور پسند کے موضوعات چنے اور ان کو نہایت سنجیدگی اور متانت سے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا۔ سید عبداللہ چونکہ ماہر مشرقیات تھے لہذا انھوں نے اقبال کے فلسفہ کے مشرقی ماخذات اور سوتوں کو تلاش کیا اور نہایت معروضیت سے ان حوالوں کو اقبال شناسوں کے سامنے پیش کیا۔ سید عبداللہ کا اقبال شناسوں سے یہ گلہ بھی ہے کہ انہوں نے اقبال کے فلسفہ کی شرح ان کے مغربی فکری حوالوں سے کی اور مستند کھوج بھی لگائی لیکن اقبال کے اصل ماخذ مشرقی علوم اور عربی فارسی زبان کے سرچشمے ہیں ان کے فلسفہ اسلام کے افکار کے ساتھ انصاف نہیں ہو اوہ اس باب میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''قارئین اقبال کو فکر کے ان سرچشموں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جن کے بارے میں محققین اقبال زیادہ سرگرم نہیں نظر آتے۔ مثال کے طور پر۔۔۔ کسی نے محمود شبستری کو موضوع تحقیق نہیں بنایا۔۔۔ شبستری کا نظام افکار کیا ہے ؟اس کی مضرتیں کیا تھیں اور وہ کون سے پہلو تھے جو اقبال کو اچھے لگے۔۔رومی۔۔سنائی، عراقی، بیدل، غالب اور اکابر شعرا عہد مغلیہ۔۔میں نے (بھی)ان مباحث کی طرف توجہ کی اسے بھی معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔''(۵۴)

اس اقتباس کا مقصد اس استدلال کو پایہ ثبوت تک پہنچانا مقصود تھا کہ سید عبداللہ نے اقبال کے فکر سے انہی پہلوؤں کو لیا جو توجہ اور تشریح طلب تھے اور پھر ان کو سلاست اور بلاغت سے عام قاری کے لیے پیش کر دیا۔ خاص طور پر ان فکری سرچشموں کا پتا لگایا جن کا تعلق مشرقیات سے تھا۔

سید عبداللہ نے فکر اقبال کے ضمن میں خاصا کام کیا۔ انھوں نے اقبال کے نظریات کو عوام کے علاوہ طلبا تک پہنچانے کے لیے خصوصی کاوشیں کی۔ اقبال سے ذہنی قربت اور ان مخصوص حالات میں اسلامیان ہند سیاسی ابتری اور اقبال کا مردانہ لہجہ اور فکری بالیدگی سے ہر ذی شعور مسلمان متاثر ہوا ہے۔ سید صاحب استاد بھی تھے اور معاشی و سماجی دانشور بھی لہذا اقبال کے ہاں انھوں سوچ و فکر کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے اور اقبال کی فکر عام کرنے اور اپنے فکری نظام کے لیے بھی خاص مواد ان کو اقبال کے فلسفہ سے میسر آیا۔ سید عبداللہ کا اپنا نظام فکر پیچیدہ اور الجھا ہوا نہیں ہے۔ ان کی فکری اساس قرآن و سنت ہے اور ان کا انقلاب نفاذ اسلام اور ان کا نصب العین مستحکم و مضبوط پاکستان ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے خواہاں ہیں۔ اقبالیات کے جن موضوعات کو سید صاحب نے خاص طور پر چنا ان کی فہرست کا سرسری جائزہ ان کے ذوق اور توجہ طلب موضوعات سے روشناس کرائے گا۔ سید عبداللہ کا اقبالیات کے حوالے سے کام علمی اور ادبی حلقوں میں خاصا سراہا گیا ہے اور آپ کو ایک معتدل اور فہیم اقبال شناس کے طور پر جانا

گیا ہے۔ ان کو ''محرک اقبال'' کا لقب بھی ملا ہے کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کو اقبال فہمی اور اقبال شناسی سے روشناس کراتے ہیں۔ سید عبد اللہ کے مقالات و مضامین ادبی اور علمی حوالوں سے خاص قدر کے حامل ہیں۔ اقبال کے لیے وہ رطب اللسان ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا یہ پیغام اپنے اندر ہزار بصیرتیں رکھتا ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا آئین قرآن اور اس کے دیے ہوئے وہ عقیدے ہیں جو عالمگیر اخوت کے ضامن اور اعلیٰ مراتب حیات کے کفیل ہیں۔ پاکستان ان عقیدوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ زمین کا وہ قطعہ ہے جس کا اساس عقیدوں پر رکھی گئی ہے۔''(۵۵)

سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے کہ اقبال کا فلسفہ اس لیے فعال اور قابل عمل کیوں اس فلسفہ کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے اور اسی قرآن کی پاسداری اور حکمت ان کی اساس بنی۔ اس نظریے سے پاکستان وجود میں آیا تھا اور اس خطہ کو اقبال کی بصیرتوں کی مدد سے منور کرنا ہے جس کے لیے سید عبد اللہ نے قلم سے جہاد کیا۔ اقبال کے افکار بھی ان کی نثر میں ملنے والے اسلامی عناصر کا نمایاں پہلو ہے۔ اقبالیات کے باب میں سید عبد اللہ کا انداز بیان، ان کا معاشرتی نظریہ اور فرد کی عقائد کی پختگی، اعتقادات کی تعبیر، اہل پاکستان کے اذہان کی اصلاح و تربیت، نئی نسل کی کردار سازی اور فکری و نظریاتی تربیت کے تمام مباحث میں افکار اقبال کے حوالے ملتے ہیں۔ افکار اقبال اسی لیے سید عبد اللہ کے نظام فکر یعنی عناصر اسلامیہ میں بنیادی مقام رکھتے ہیں۔

اسلام کا تصور عورت

عہد حاضر میں عورت، کا مسئلہ خاصا نازک اور پیچیدہ ہوتا جا رہا، یہ کہ بھی انسانی حقوق کی ایجنسیاں اور نام نہاد حقوق نسواں کی تنظیمیں عورت کو سبز باغ دکھا کر کمزور اور اس کے کفو کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ مسلمان عورت بھی مغرب کی اس ہوا سے خام خیالی کا شکار ہو رہی ہے کہ وہ بھی جدید عہد میں زندہ رہنے کا حق رکھتی ہیں اور ان کو بھی مردوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ مغربی تعلیم کے زیر اثر مرد و زن واقعی اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ عورتوں کے ساتھ اسلامی معاشروں میں بالعموم اور پاکستانی معاشرہ میں بالخصوص زیادتی ہو رہی ہے اس لیے مختلف غیر حکومتی تنظیمیں (NGOs) بھی اس ضمن شعور آوری کی مہمات چلانے میں مصروف ہیں۔

سید عبد اللہ کا تصور عورت بھی خالصتاً اسلامی فکر پر مبنی ہے وہ عورت کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس سے قرآن و سنت نے عورت کو دیکھا ہے۔ وہی مقام عورت کو دیتے ہیں جو قرآن و سنت نے اس کو دیا۔ سید صاحب مغربی عورت کو اپنا آئیڈیل تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق اور فرائض تفویض کیے ہیں وہ اس کی جنس کے اعتبار سے بالکل موزوں ہیں اور عورت کے تحفظ فطری، حیاداری، نیک نیتی اور جسمانی نزاکت کے لحاظ سے مناسب اور معقول ہے۔ اسلام مرد وزن دونوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے جو ایک معتدل، خوشگوار اور مساوی معاشرتی زندگی کو یقینی بناتی ہیں لہٰذا پاکستانی معاشرے میں عورتوں کو اسلامی احکامات روشنی میں اپنے ثقافتی مزاج کے مطابق ماحول دینا چاہیے تاکہ ان کی زندگی اسلامی تقاضوں کے مطابق ایسے گزر سکے جو نہ صرف ان کے لیے اصولوں کا باعث ہو بلکہ معاشرے کے لیے بھی مفید اور فیض بخش ہو۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ''(پاکستان میں) عورتوں کے لیے اسلامی ماحول میں جینے کی خوشگوار صورتیں پیدا کی جائیں تاکہ مغرب پرستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آسکیں۔ فرمایا ہے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہ ولھن مثل الذی علیھن، یعنی عورتوں کے حقوق اور مفادات عورتوں کی ان ذمہ داریوں کے مطابق ہیں جو نظام خاندانی میں ان پر عائد ہوتی ہیں۔''(۵۶)

یہ اقتباس سید عبد اللہ کے تصور عورت کے اسلامی نظریہ سے مطابقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سید صاحب کا تصور نسواں فعال، عملی اور اسلامی ہے اور وہ عورت اور مرد کو الگ الگ جنس مانتے ہوئے ان پر انہی پابندیوں اور فرائض کی ادائیگی پر اصرار کرتے ہیں جو قرآن و سنت نے عائد کی ہیں۔ سید صاحب معاشرے میں بد چلنی، برہنگی اور پوری طرز اختلاط کو ناپسند کرتے ہوئے یکسر رد کرتے ہیں اور نہایت واضح الفاظ میں اس نظام اور طور طریقوں سے دور رہنے اور اسلامی طرز حیات کو اپنانے کو تجویز کرتے ہیں۔ سید عبد اللہ کا حیا کی خوبی پر بہت اصرار ہے ان کا خیال ہے مرد و عورت دونوں کو حیاداری اور لحاظ سے معاملات زندگی میں کام لینا چاہیے۔ حیاداری عورت کا وصف خاص ہے۔ حیا کی تعریف کرتے ہوئے عارفہ فرید لکھتی ہیں:

> ''حیا کی بنیادیں عفت اور پاکیزگی میں ہیں۔ یہ عورت کے مستحسن اظہار کی کسوٹی ہے خواہ وہ اظہار خیالات کا ہو، جذبات کا ہو یا ارادوں کا، فیصلوں کا، گفتگو میں نرمی اور لطافت حیا کے عنصر ہیں۔۔۔ گو پاکستان میں حیا خصوصیت کے ساتھ ایک زنانہ صفت تصور کی جاتی ہے لیکن مرد کو اس سے مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا۔''(۵۷)

سید عبد اللہ کا کہنا ہے کہ حیا مرد و عورت دونوں کے لیے لازم ہے کیوں کہ قرآن مجید بڑی وضاحت و صراحت سے اس ضمن میں حیاداری کے لیے دونوں پر اصرار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مرد اور عورت کو ایک پاکیزہ معاشرے میں نسلِ طاہر کے لیے حیا کی حدود و قیود کی پاس داری کرنی چاہیے:

"مومن عورتوں کو کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقاموں کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو اس میں (چاروناچار) کھلا رہتا ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنے دوپٹوں کا بکل مار رہیں۔"(۵۸)

اسلام ان عورتوں کو باپردہ اور مستور رکھ کر معاشرتی فرائض تفویض کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ کام اور روزگار کے ذرائع اور ان کی نوع کو مرد سے الگ کرتا ہے کہ عورت کی بناوٹ اس کی نزاکت جس کی متحمل ہو۔ چار دیواری میں وہ قید نہیں بلکہ وہ چار دیواری میں آزاد اور محفوظ ہے۔ اس حوالے سے سید عبد اللہ عورت کے چار دیواری سے باہر نکلنے پر فکر مند ہیں وہ کھلے بندوں عورت کے غیر محفوظ ہونے کا اظہار بھی کرتے ہیں:

"عورتوں کے مسائل کو اب زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ماحول میں گرگ (بھیڑیے) بڑی کثرت اور برے ارادے سے گھوم رہے ہیں۔ ان میں اپنی قوم کے اس محترم اور معصوم طبقے کو بچانے کی سخت ضرورت ہے لہذا عورتوں کے لیے اسلامی ماحول میں جینے کی خوشگوار صورتیں پیدا کی جائیں تاکہ وہ مغرب پرستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آسکیں۔"(۵۹)

اس سے کھل کر اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ آج کے عہد میں بھی عورت گھر سے باہر غیر محفوظ ہے اور اس کے بارے میں کوئی دورائے نہیں رکھتا۔ عورت کے لیے سید عبد اللہ "محترم" اور "معصوم طبقہ" استعمال کر کے مغربی فیشن اور مغرب کے نام نہاد آزادی نسواں کے مہم کی مذمت کرتے ہیں اور ان خیالات کے حامل افراد کے طرز فکر اور اسلوب عمل سے دیگر احباب کو نہایت زیرکی سے مطلع اور متنبہ کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے عورت کو چودہ سو سال قبل وہ عزت توقیر اور کفو دیا ہے کہ کسی اور مذہب میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ عورت کو "حق مہر" کا حق ملا جس کا تصور سوائے اسلام کے کسی اور دین میں نہیں ملتا۔ قرآن مجید با اصرار کہتا ہے کہ اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے ڈالو۔۔۔ پھر اگر وہ خوشی کے ساتھ اس میں (مہر سب) سے کچھ تمہیں چھوڑ دیں تو اسے کھاؤ۔(٦٠) اسی طرح اسلام عورت کو ماں باپ کی وراثت میں بھی مقدار ٹھہراتا ہے:

"ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا بہت، مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی جو اللہ تعالیٰ کا فرض کیا ہوا ہے۔" (۶۱)

اس بحث کا مقصد سید عبد اللہ کی نثر میں عورت کے مقام اور کفو کا پتا لگانا تھا اور اب جو عورت مغربی حقوق نسواں کے خواب دیکھے وہ کفران نعمت کرے گی۔ آزاد روی اور بے راہروی کے علاوہ بربادی مغربی حقوق نسواں کا لازمی حصہ ہے۔ اگر عورت نے وہ مساوات اور برابری حاصل کرنی ہے تو پھر اسلام میں اس ہٹ دھرمی اور آزادی کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی آزادی نسواں پر مشرق کے مشاہیر کا واضح موقف رہا ہے بقول پروفیسر محمد عثمان:

"یورپ نے آزادی نسواں کے نام پر اور صنعتی انقلاب کی ضرورتوں کے تحت عورت کا بڑی حد تک استحصال کیا اور اسے رفتہ رفتہ جنس تجارت بنا ڈالا۔ اس سے بے حیائی اور جنسی بے راہروی عام ہوئی۔ اقبال اس روش کے مخالف ہیں۔" (۶۲)

اسلامی نظریہ نسواں یہ ہے کہ وہ اس کے علاوہ عورت کو کسی بھی مقام اور منصب پر دیکھنے کے قائل نہیں جو اس کو اللہ اور اللہ کے رسول نے نہیں دیا۔ عبد المجید سالک اقبال کے تصور نسواں کے بابت یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"علامہ اقبال نے فرمایا عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اس کی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی ۔۔۔ عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے۔" (۶۳)

معاشرے میں عورت کا اصل مقام چار دیواری ہے جہاں وہ بحیثیت بیٹی، بیوی، ماں کے روپ میں باعزت کفو رکھتی ہے۔ مجبوراً اگر روزی کی تلاش میں گھر سے نکلنا پڑ بھی جائے تو لباس، تراش خراش اور ہر انداز باحیا خاتون والا ہونا چاہیے۔ مغرب میں جو عورت کا روپ آزادی نسواں اور حقوق نسواں کے نظریہ کے تحت سامنے آرہا ہے وہ مسلماں عورت کے لیے قطعاً مناسب نہیں۔ سید عبد اللہ اس کو برہنگی اور بے راہروی قرار دیتے ہیں۔ پاکستان ہی کیا کوئی اسلامی معاشرہ اس آزادی کو نہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی اس کا متحمل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اسلامی عقائد سے متحارب ہے۔ سید عبد اللہ کی فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہیں:

> ''اس معاشرت کی ایک روح ہے جس کی حفاظت پر وہ اصرار کرتی ہے یہ روح عبارت ہے طہارت، احترام انسانی، اخوت، مساوات، لحاظ، معاملہ حسن، اور حیا سے ۔۔۔حیا مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔اسلام مردوزن کے اختلاط پر، حیا کی قدروں کی وجہ سے کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔بے حیا، فساد انگیز نمائش کو برا سمجھتا ہے۔۔۔اور یہ تو سب پابندیاں خوش حال سماجی زندگی ، نسل کی پاکیزگی اور مردوزن کے مستقل اور الگ دائرہ ہائے حیات کی تنظیم کی خاطر ہیں۔''(۶۴)

سید عبد اللہ کا تصور عورت اسلامی تعلیمات کی دین ہے وہ اسلامی معاشرتی اقدار کے مطابق اسلامی معاشرہ میں عورت کو رہتا سہتا دیکھتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں ہمارے معاشرے میں عورت کا کردار قرآن و سنت کا آئینہ دار ہو۔اسلام نے عورت کو ''شے''یا''ملکِیت''سے نکال کر ایک بلند اور معزز مقام دیا اور عورت کو تکریم دی اور مرد سے الگ اور بڑھ کر مقام دیا۔سید عبد اللہ پاکستانی معاشرے میں بھی اس کے اسی مقام اور عزت کی مستحق ہے۔

اسلام کا نظام تعلیم

اسلامی عناصر میں تعلیم و تعلم کو نہایت کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تعلیم کی بابت سید عبد اللہ کے افکار بھی اسلامی فکر اور نظریہ کی تائید و تحسین کرتے ہیں۔اسلام کی رُو سے ہر مسلمان مرد اور عورت پر حصول تعلیم فرض ہے۔(۶۵) مدینۃ المنورہ میں باقاعدہ اس نظام کی تشکیل کی گئی اور حضرت محمد نے اپنی نگرانی میں قرآن و اسلام کی تعلیم کا اہتمام کیا تھا۔سید عبد اللہ کے تعلیمی نظریات سے متعلق ''ڈاکٹر سید عبد اللہ کے تعلیمی خطبات''مرتبہ ممتاز منگلوری کی صورت میں جامع دستاویز موجود ہے۔ان خطبات کی تدوین کی بابت ڈاکٹر ممتاز منگلوری خود لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب (تعلیمی خطبات)شائع کر دی جائے تاکہ یہ بھی معلوم ہو سکے کہ اس عظیم شخصیت(سید عبد اللہ) نے درس و تدریس تصنیف و تالیف، تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ اس عرصے میں قومی تعلیم کے مسئلوں اور اس کے نصب العین کے بارے میں کتنا غور کیا اور اتنا کچھ تعلیم کی غایتوں اور اس کی اصلاح کے لیے لکھا اور کہا۔''(۶۶)

تعلیم کے باب میں سید عبد اللہ کے افکار اور نظریات مذکورہ کتاب کے علاوہ بھی ملتے ہیں جن میں ''پاکستان-تعمیر و تعمیر'' اور ''ادب و فن''شامل ہیں۔

سید عبد اللہ نے تعلیم اور تعلیمی نظام کی اساس کے متعلق جامع ومانع نظریہ تعلیم پیش کیا ہے۔ اس باب میں ان کی سوچ بچار بھی خالصتاً اسلامی ہے۔ وہ قرآن و احادیث میں بیان کردہ تعلیم کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک حصول علم کے وسائل اور تحصیل علم کے مواقع کی فراہمی حکومت وقت کی ذمہ داری ہے۔ ان کے خیال میں ریاست اس بات کی پابند ہے کہ وہ اپنے افراد معاشرہ کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائے۔ اسی طرح سید عبد اللہ فلسفہ تعلیم کے باب میں لکھتے ہیں کہ علم کا حقیقی منصب اور فرض یہ ہے کہ وہ فرد کی روحانی بالیدگی اور ترفع اور پوشیدہ صلاحیتوں کو اس فرد پر ظاہر کرے اور پھر پیشہ ورانہ تربیت سے اس فرد کو معاشرے کے فعال اور مفید رکن بنادے۔(٦٧) سید عبد اللہ کے نزدیک تعلیم کے شعبے میں علم کا حصول اور تدریس الگ الگ شعبے نہیں وہ ان دونوں کو ایک عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تعلیم کے نظام میں اسلامی فلسفہ حیات اساس ہی حقیقی اساس ہے اور اسی کی بنیاد پر نصاب سازی ہو، اساتذہ کی کھیپ تیار کی جائے، اساتذہ موثر طریقہ ہائے تدریس سیکھیں اور استعمال کریں، ریاست ایسے تعلیمی اداروں کے قیام اور انصرام کرے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظریاتی تسلسل کو علی الدوام بخشے اور نئی نسل اس نظریہ سے آشنا کرے اور ایسا مکمل خامیوں سے پاک نظام امتحانات ہو کہ وہ قوم کی ضروریات کو پورا کرے۔

سید عبد اللہ کی نثر میں ملنے والے تعلیمی نظریات کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تعلیمی میدان میں ترقی ایک قوم کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہے۔ تعلیمی میدان کے مسائل اور معاملات کی طرف سنجیدہ اور خاص توجہ درکار ہے اور سید عبد اللہ اس ضمن میں بہت اصرار بھی کرتے ہیں۔ ان کے نظریہ تعلیم کا خلاصہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے کچھ یوں مرتب کیا ہے:

> ''اگر ہم پاکستان کے مخصوص حالات کی روشنی میں اپنے مقاصد تعلیم کی تعین کرنا چاہیں تو (بحوالہ سید عبد اللہ) ان کی فہرست اس طرح بنے گی:
>
> ا۔ فرد کو کامیاب دنیاوی اور دینی زندگی کے لیے تیار کرنا۔
> ۲۔ پاکستانی قوم کے بنیادی اعتقادات میں یقین پیدا کرنا۔
> ۳۔ تربیت یافتہ افراد کے ذریعے ایسے معاشرے کی تشکیل وغیرہ کرنا کہ جو اسلامی اخلاق و آداب سے آراستہ ہونے کے علاوہ اخلاقی اور مادی قوت اور عدل و دیانت کا نمونہ ہو۔
> ۴۔ پاکستانی کی حفاظت اور ترقی کے لیے افراد کو ایسے علوم سے آراستہ کرنا جن کی مدد سے مادی ذرائع کی تسخیر اور بہم رسانی ممکن ہو۔''(٦٨)

یہ تو طے ہے کہ سید عبد اللہ کا نظریہ تعلیم اسلامی عناصر سے متشکل ہوتا ہے، اُن کا نظریہ تعلیم کی غایت اولیٰ فرد کی مذہبی اور دینی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلام کی اکمل و احسن تفہیم ہو اور فرد دینی اور دنیوی معاملات بطریق احسن نمٹا سکے۔ دوم یہ کہ متعلمین میں پاکستان اور پاکستان سے محبت اور پاکستان کی بقا کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ سوم پاکستانیت اور پاکستانی کلچر کی ترویج کی جائے۔ وہ اپنی کتاب 'پاکستان۔ تعبیر و تعمیر' میں "پاکستانی تعلیم: آزاد، اسلامی اور قومی" کی سرخی کے تحت فلسفہ تعلیم کی بنیادوں کا تعین کرے ہوئے لکھتے ہیں:

> "قدرتی اصول کے تحت ہمارے تعلیمی فلسفے کی چند بنیادیں یہ ہونی چاہیں:
> ۱۔ نظام تعلیم کو قومی مزاج کے مطابق ہونا چاہیے۔
> ۲۔ نظام تعلیم کو ملکی وسائل کے مطابق ہونا چاہیے۔
> ۳۔ نظام تعلیم کو قوم کے عملی فوائد کے نقطہ نظر سے منظم کرنا چاہیے۔
> ۴۔ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو 'پاکیزہ اور شریف انسان' کا کردار پیدا کرے۔
> مزید براں اجتماعیت کا ذوق پیدا کرے۔ انسانی مساوات وعدل کے تصور کو ابھارے، جو محنت و شوق پیدا کرے۔ ذمہ داری کا احساس پیدا کرے اور ایجاد و اختراع کا ذوق ابھارے۔ ان شریفانہ خصلتوں کی تکریم کرنے جن کا تصور مجلس زندگی کے سلسلے میں اسلام نے دیا ہے۔"(۶۹)

ان نکات سے عبد اللہ نظریہ تعلیم کے خدوخال کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ سید عبد اللہ کا نظریہ تعلیم اسلام تصورات کی اساس پر قائم ہے اور وہ اسلامی مشاہیر سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور ان کا فلسفہ تعلیم اسلامی ہے اور وہ اسی تعلیم کے ذریعے اسلامی سوچ اور فکر پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔

پاکستان، ہندی مسلمان کے لیے صرف وطن نہیں بلکہ ایک خواب اور ایک مثالی ریاست ہے جہاں مسلمانوں نے اپنے دین کے مطابق زندگیاں گزارنی ہیں لہذا پاکستان اور پاکستانی قومیت کے عقیدے کو سید عبدللہ اپنی قوم اور بالخصوص نوجوان نسل کے دلوں میں تعلیم کے ذریعے سے راسخ کرنا چاہتے ہیں۔ سید عبد اللہ اپنی اس خواہش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پاکستانی قومیت کے مرکزی عقیدے کو یعنی اسلامی تخیل کو محکم بنانا ہے اور محفوظ رکھنا لازمی ہے۔ اس طرح اس تخیل کو اس کے جغرافیائی تخیل سے وابستہ رکھنا بھی لازمی ہے۔ اس لحاظ سے پاکستانی قومیت کا دوسرا بڑا اعنصر وطن یا وطنیت ہے۔"(۷۰)

سید عبد اللہ پاکستان کو اسلام اور پاکستانیت کو اسلامیت کا مترادف جانتے ہیں وہ اپنے نظام تعلیم کو اسلامی اصول و قواعد اور دائرہ میں رکھتے ہوئے تشکیل دینا تجویز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی فکر سے دور رکھنے والی تعلیم پاکستان کی روح کے منافی ہے۔

سید عبد اللہ کا تصور تعلیم خاص جامع ہے۔ وہ اس نظریے کو بڑی جامعیت اور صراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے نظام فکر میں ان کا نظریہ تعلیم ایک مضبوط حوالہ ہے۔ وہ اس تعلیمی نظام کے داعی ہیں جو اسلامی اقدار کی ترویج اور پاکستانی سوچ کو فروغ دے۔ سید عبد اللہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک نظام تعلیم کو انگریزوں کا ترتیب دیا ہوا قرار دے کر رد کرتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ مسلمانان ہند نے اس نظام تعلیم کو بادل نخواستہ تسلیم کیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستانی قوم اپنے دو قومی نظریہ، نظریہ پاکستان، قرارداد مقاصد اور اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ نظام تعلیم مرتب کرے اور اس کو نافذ کرے۔ اپنے نظریہ تعلیم میں پاکستان کے رائج نظام تعلیم کے نقائص پر بھی روشنی ڈالتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ”پاکستان کی تعلیم، پاکستانی معاشرہ کی طرح اس وقت ایک تصادم اور تضاد میں مبتلا ہے یہ ذہنی تضاد تاریخی حالات کی پیداوار ہے۔ ہم ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک سالم تہذیب کے علم بردار تھے۔ جو اپنی کمزوریوں کے باوجود مرکزی فکر کے لحاظ سے سالم اور خود آشنا تھی۔۔ اب ہم مغلوب قوم بن گئے۔“(۷۱)

لہذا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد نہ صرف جغرافیائی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی بلکہ اس کے بعد مسلمانان ہند کی شناخت کا ہر حوالہ بدل گیا۔ ان کی ذمہ داریاں، معاملات، تہذیبی و ثقافتی حوالے، سماجی اقدار کا تشخص، معاشرتی و معاشی تنظیمات، تعلیمی تقاضے، ادب کے مقاصد، قومیت کے اساسی مباحث غرض ہر چیز نے نیا تشخص اور نیا روپ اور نیا مقام پالیا ہے لہذا یہ امر خاص طور پر لائق اعتنا ہے کہ تعلیم کے نظام کو سنجیدگی اور ایمانداری سے نوزائیدہ مملکت کے تقاضوں، مقاصد اور غایتوں کے مطابق تشکیل دیا جانا چاہیے تاکہ ذہنی غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا سکے۔ ذہنی غلامی کے حوالے میں ڈاکٹر سید عبد اللہ یوں رقم طراز ہیں:

> ”ذہنی غلامی تب پیدا ہوتی ہے جب ہم ملکی و قومی تقاضوں سے زیادہ، دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں پر انحصار کر لیتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ وہ نمونے دنیا کہ بعض یا اقتدار اور غالب اقوام سے منسوب ہیں۔ ہم انھیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں یہ دیکھے بغیر کہ وہ ہمارے حالات اور مزاجوں کے لیے ساز گار بھی ہیں یا نہیں۔ ذہنی غلامی یہی ہے ورنہ علمی و عملی استفادے کے

> معاملے میں مشرق و مغرب کی کوئی قید نہیں۔۔۔ ہر ملک اور ہر قوم کے رویے اور نظریے اپنے اپنے ہوتے ہیں اور ان میں فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو نہ جاننے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ابھی تک کسی واضح اور قطعی فلسفے سے محروم ہے۔"(۷۲)

اس ذہنی غلامی سے نجات کا ذریعہ اور وسیلہ صرف اور صرف تعلیم ہے۔ وہ تعلیم جو اسلامی ذہن کو پیدا کرے، اسلامی تقاضوں کے مطابق سیرت سازی کرے، اسلامی اقدار کو رواج دینے والا معاشرہ تشکیل دے اور اسلامی تہذیبی ورثہ سے لگن کو جنم دے، اسلامی نشاۃ ثانیہ کے فکر کو نئی نسل کے قلوب واذہان میں پیدا کرے اور ان میں اس کے لیے آمادگی پیدا کرے۔ پاکستان کے وجود کی دلیل اول دو قومی نظریہ ہے اس حقیقت کو نئی نسل کو باور کرائے اور اس کو عقیدہ کے طور پر تسلیم کرائے۔ تعلیم پاکستانی اقدار اور روایت کے احیا کرے اور ان کی ترویج کے لیے کام کرنے والے رضاکار اس تعلیم کی دین ہوں۔ سید عبداللہ نے تعلیم کے نظام کا فرض یہ ہو کہ فرد کی انفرادی ذہنی، روحانی اور فکری نگہداشت بھی قرار دیا ہے۔ سید عبداللہ کا نظریہ تعلیم کا نصب العین یہ ہے کہ یہ پاکستانی تعلیمی نظام پاکستان کو فہیم و بالغ ماہرین اقتصادیات، اساتذہ، وکلا، بینک کار، صنعت کار، انجنیئر، ڈاکٹر، منتظمین، صحافی، مصور و موسیقار، دانشور و مفکرین، ادیب و شعرا میسر آئیں۔ اس تعلیم کے فیض یافتہ افراد ہر شعبہ زندگی میں اپنے فرائض منصبی بطریق احسن بجالائیں اور پاکستانی قومیت کا شعور کا عملی نمونہ پیش کریں۔ ان کا قومیت کا کلیہ یوں ہے:

> "پاکستانی قومیت کے دو بڑے اصول ہیں۔ ایک تو اس خطے کی محبت جس کا نام پاکستان ہے دوسرے عقائد اور روایات کی محبت، جن کے لیے پاکستان قائم ہوا تھا۔۔۔۔ ان دونوں کے کامیاب امتزاج ہی سے پاکستان قومیت کی جڑیں مستقلاً مضبوط رہ سکتی ہیں لہٰذا ان دونوں اصولوں کو ملک کے شعور تعلیم کے اندر جذب کر دینے کی بے حد ضرورت ہے۔"(۷۳)

اس قومیت کے تصور کو دلوں اور ذہنوں میں راسخ کرنے کی ذمہ داری وہ نظام تعلیم کو سونپتے ہیں تاکہ تعلیمی اداروں میں اس پاکستانی کردار کے حامل افراد کی ایسی کھیپ تیار ہو جو پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ سید عبداللہ اپنے تعلیمی مقاصد میں قومی ارتباط اور اخوت کے احساس کے بھی پر چارک رہے ہیں اور وہ ایسے نصاب کے خواہاں تھے جو اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کام کرے:

> "بہر حال پاکستان کو شعوری سطح پر مستحکم کرنے کے لیے ہمیں اپنے نصابات کی کڑی تنقید کر کے انھیں قومی مقاصد سے ہم آہنگ کرنا چاہیے تاکہ ملک کی درس گاہوں سے جو آدمی (مرد وزن)

> بہرہ یاب ہو کر نکلے سچا مسلمان، سچا پاکستانی اور اچھا شہری بن کر نکلے اور ملک کو عملی طور ہر لحاظ سے مستحکم کر سکے۔"(۷۴)

سید عبداللہ کا نظام تعلیم فکری اعتبار سے اسلامی اور انتظامی حوالے سے فعال ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یا اس کی دین ایک ''سچا محب وطن یا پاکستانی مسلمان'' ہے یہ دونوں آپس میں مترادف ہیں اور جس کا اجتماعی نتیجہ ایک اسلامی ریاست کا قیام اور اسلامی معاشرے کی تشکیل ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق پاکستانی نظام تعلیم کا واحد مقصد یہ ہے:

> ''ہم اپنی تعلیم سے اس تصور زندگی کو زندہ کریں گے جس سے وہ منفرد قسم کی اخلاقیات ظہور میں آئیں جو اسلام کے مد نظر تھا۔ اس کے تحت اس کا بھی حالات وماحول کے مطابق احیا چاہتے ہیں۔ یہ وہ اخلاقیات ہے جس کا مقصد، پاکیزگی، حسن عمل اور جمال حیات کو فروغ دینا ہے۔ اور انسان کو انسان کے معاملے میں شفیق اور خوش اخلاق بنانا ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں جبر سے نہیں آزاد تبلیغ و تربیت کے ذریعے پہلے ایک تصور زندگی پیدا کرنا ہو گا پھر اس کے مطابق طور طریقوں اور اوضاع زندگی میں حسن و خیر کی شان پیدا کرنی ہو گی۔"(۷۵)

پاکستانی نظام تعلیم کا کلی منشور اور لائحہ عمل اس اقتباس میں بیان کر دیا گیا یعنی سید عبداللہ کے تعلیمی فکر کا اصرار افراد معاشرہ کو اسلامی اخلاق و آداب سے آراستہ کرنا ہے۔ ان کو دینی و دنیاوی تعلیم دینا، اسلامی اقدار سے روشناس کرنا غرض اسلامی کردار سازی کرنا تاکہ پاکستانی معاشرہ نمونے کا اسلامی معاشرہ بن جائے۔ سید عبداللہ کا یہ نظریہ ان سے پہلے بھی کئی مفکرین اسلام کے ہاں ملتا ہے۔ مثلاً قاضی ابن جماعہ کے مطابق:

> ''طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کو ہر قسم کی کھوٹ کپٹ، عداوت، کینہ، بد خلقی، اور بد عقیدگی سے پاک رکھیں تاکہ اس میں علم کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔۔۔۔ وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنا علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں اگر نیک نیتی سے علم حاصل نہ کیا گیا تو اس علم سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔"(۷۶)

سید صاحب کا اصرار بھی انہی شرائط کی ادائیگی پر ہے۔ وہ اس حوالے سے مثبت نتائج کے لیے اپنے اداروں میں اسلامی مزاج کے نصابات تعلیم کی تشکیل و ترتیب دینا، تجویز کرتے ہیں اور دین اسلام کو ضابطہ حیات کے طور پر تعلیمی اداروں

میں متعارف کرائے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری سید عبداللہ کے تعلیمی نظریہ پر بات کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ سید صاحب درج ذیل خوبیوں کو اپنے تعلیمی نظام میں دیکھنے کے خواہاں تھے:

> ''رفاہیت، مفیدیت، جمہوریت، پاکستانیت اسلامیت یا انسانیت یا آسان الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ نظام تعلیم کو قومی مزاج، ملکی وسائل کے مطابق قوم کے عملی خواہشات کے نقطہ نظر سے منظم اور برتر انسان کا کردار پیدا کرنے کا ذریعہ ہونا چاہیے۔''(۷۷)

سید عبداللہ ایک ایسے نظام تعلیم کے خواہاں تھے جس کی اساس اسلامی عقائد پر ہو، جس کے نمایاں خدوخال پاکستانیت کا مظہر ہوں اور اس کے علاوہ وہ ان سب علوم جدیدہ و مفیدہ کے حمایتی ہیں جو فرد و معاشرہ ہر دو کی بہبود کے ضامن ہوں۔ اُن کے مطابق یہ تعلیم معاشرے میں اسلامی جمہوری اقدار کے حامل، مثبت سوچ رکھنے والے باعمل مسلمان پیدا کرے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کو اسلامی بنانے کا مطالب یہ ہے کہ تعلیم کا ماحول اسلامی بنایا جائے۔ ماحول کے اسلامی بنانے کا یہ ہے کہ (۱) نصابوں میں دینی علوم اور عربی و فارسی کو ایک خاص حیثیت دی جائے (۲) علوم کی کتابوں میں یہ بھی بتایا جائے کہ کسی خاص علم میں مسلمانوں نے کیا کیا اضافے کے لیے اور (۳) مدرسوں اور کالجوں کے ماحول سے ہی پتا چل سکے کہ یہ مدرسے مسلمانوں کے ہیں یا ہندوؤں یا فرنگیوں کے ہیں۔''(۷۸)

ماحول تعلیمی اداروں میں نہایت اہم عوامل میں سے ایک ہے۔ ماحول کے رنگ سے سیرت سازی میں سہولت ملتی ہے۔ جہاں نصاب اسلامی اور پاکستانی ہو گا وہاں تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم تو ہو گی لیکن اسلامی اقدار اور پاکستان کے معاشرتی تقاضوں کے پیش نظر ماحول تخلیق پائے گا اور یوں تو تعلیمی اداروں میں اچھے برے کی تمیز کا کلیہ اللہ اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق ہو گا۔ تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے متوازن اور مستند نصاب ساری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سید عبداللہ کا اصرار ہے کہ ایسا نصاب جو روحانی اور جسمانی دونوں ضروریات کی تکمیل میں توازن رکھتا ہو۔ ایسا نصاب ہو جو قومی ضرورتوں اور ثقافتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ نصاب ساز اسلامی تعلیمات قرآن مجید و احادیث سے براہ راست استفادہ کریں جس سے ایک مکمل، جامع اور فعالیت رکھنے والے نصاب کی صورت پذیری ممکن ہے۔

سید عبداللہ کے نظریہ تعلیم کا خلاصہ کچھ ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے نظام تعلیم کے خواہاں ہیں جو فعال و منظم ہو اور نئی پود کی جذباتی، ذہنی، جسمانی اور روحانی ضرورت کو پورا کرنے اور ان کی ہمہ جہت نشو و نما کا ضامن ہو۔ سید صاحب ایسے نصاب کی تشکیل چاہتے ہیں جو قائد اعظم کے پاکستان کو حقیقی معنوں میں اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ بنادے۔ نفاذ اسلام کی راہ ہموار کرے اور اس مثالی ریاست کو جنم دے جس نے مدینہ میں قیام پایا تھا۔ تعلیم میں پاکستانیت پر اصرار کرتے ہیں نیز وہ تعلیم کے ذریعے سے اہل پاکستان میں یگانگت، فکری ہم آہنگی، یک جہتی، مواخاۃ اور حب دین اور حب الوطنی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مقامی زبانوں اور ثقافتوں کی ترویج کے حامی ہیں لیکن علاقائیت کے مخالف ہیں۔ وہ اہل وطن میں لسانی، نسلی، لونی تعصبات کا قلع قمع چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا ماننا یہی ہے کہ ایک اعلیٰ، معتبر اور معتدل نصاب ہی ہمارے ان قومی مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ فکری اور عملی وحدت اور یک جہتی کو پروان چڑھانے کے لیے نصاب سازی پر اصرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "خدا کا شکر ہے کہ ہمارے تعلیمی نصابوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو از خود ضروری قرار دیا گیا ہے مگر یہ سب کچھ رسمی اور معلوماتی ہے۔ ہمیں اس کے ہمراہ کسی ایسے عمل کی بھی ضرورت ہے جو دل کو پگھلا کر نیکی لیے طبیعت میں ایک خود رو آمادگی پیدا کر سکے۔" (۷۹)

بالفاظ دیگر ان کے نزدیک مذہبی اور اخلاقی تعلیم نصاب کا حصہ ہونی چاہیے اور ساتھ میں نیکی کے فروغ کے لیے بھی نئی نسل میں ایک گونہ آمادگی پیدا کی جانی چاہیے اور وہ اس کو تعلیم کی اصلی روح قرار دیتے ہیں۔ سید عبداللہ کا تجویز کردہ نظام تعلیم اسلامی بنیادوں پر استوار ہے اور اس کا حقیقی وظیفہ اور ذمہ داری اسلام کے قلعہ (پاکستان) کو مضبوط کرنا اور اسلامی تجربہ گاہ کو فعال اور مستحکم کرنا ہے۔

اسلامی معاشی نظام

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سید عبداللہ نے اسلامی عناصر کا مطالعہ ایک علمی تجربہ ہے۔ سید عبداللہ کے نظریات اور طرز فکر خالصتاً اسلامی اسلوب رکھتا ہے۔ ان کے اسلامی مذاق کی تعمیر و تشکیل میں ابتدائی گھریلو تربیت کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں تعلیم کا حاصل کرنا بھی ایک بنیادی وجہ ہے۔ گھر میں مذہبی ماحول تھا والدین باعمل مسلمان تھے۔ مدرسہ میں اسلامی عقائد اور فلسفہ حیات کے بارے میں تعلیم حاصل کی۔ اسلامی تعلیمات اور مدرسہ کی فضا نے سید عبداللہ کی شخصیت کو

مذہبی رنگ اور سوچ کو اسلامی آہنگ دیا۔ غرض اس مفکر نے فکریات اسلام سے بھرپور استفادہ کیا۔ زندگی اور معاملات زندگی کو خالصتاً اسلامی انداز نظر سے دیکھا اسی لیے پاکستان اور اسلام سید عبداللہ کے ہاں مترادف کے طور پر آتے ہیں۔(۸۰)

سید عبداللہ اسلامی معاشی نظام کے داعی تھے۔ ان کے نزدیک پاکستان چونکہ اسلامی اصول وضوابط کی تجربہ گاہ ہے تو اس تجربہ گاہ کا نظام معیشت بھی اسلامی ہی ہونا چاہیے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت ایک مستحکم اور واضح صورت کا حامل ہے کہ جس میں ریاست کا ہر فرد بلا تخصیص جنس، ذات، نسل، لون، علاقہ، زبان، کلچر اور مذہب مساوی معاشی حقوق کا استحقاق رکھتا ہے اور اس کو برابری کی سطح پر معاشی وسائل اور شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ سید عبداللہ پاکستان میں جس معاشی نظام کے خواہاں ہیں وہ بقول وحید عشرت یوں ہے:

> ''معیشت کو موجودہ عہد میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کس کو مجال انکار ہے۔۔۔ جاگیرداریت، سرمایہ داریت کا نظام جو کہ خود اسلام کی راہ میں آج کے عہد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اسے ختم کیا جائے، ریاست معاشی منصوبہ بندی، محدود حق، ملکیت، نظام زکوۃ اور کسب حلال کے اسباب مہیا کرے، روزگار کا قانونی حق ہو، انفرادی آزادی اور پیشہ کے چناؤ کی آزادی اور دیگر معروف شہری آزادیوں کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاشرہ افراد کو سماج کے فعال رکن بنانے کے لیے اقدامات کرے۔''(۸۱)

سید عبداللہ ایسے ہی نظام کے آرزومند ہیں جہاں روزگار کی فراہمی، آمدن کا معقول نظام و مواقع، مزدور اور آجر کے حقوق و فرائض کا تعین ہو، دولت کی منصفانہ تقسیم ہو عوام الناس کو اچھی خوش حال زندگی کے برابر مواقع مل سکیں۔ اس تنظیم معیشت کے بارے میں اسلامی نظریات میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ اسلام روزگار کے مواقع اور ضروریات زندگی کی فراہمی، بنیادی سہولیات اور فرد کے جان اور مال و اولاد کے تحفظ کا حق ریاست کے ہر فرد کو دیتا ہے۔ سید عبداللہ اس معاشی نظام کے لیے معاشی تنظیم کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں اور اسلامی معاشی نظام ان کے الفاظ میں یوں ہے:

> ''پاکستان کی معاشی تنظیم اس طرح کی جائے کہ ملک کے ہر شخص کو زندہ رہنے کے وسائل یکساں طور پر میسر ہوں۔ کام اور آمدنی کے وسائل و مواقع سب کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ قرآن وسنت کے مثبت معاشی احکام اور ان کی بنیادی قدغنوں کا احترام کرنے کے بعد، دنیا کے دوسرے

نظاموں سے طریق کار اور منصوبہ بندی کے اصول اخذ کرلینے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیے۔"(۸۲)

اس اقتباس سے ان کے معاشی نظام کے خدوخال بالکل واضح ہو جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلامی معاشی نظام کو سہل اور غلطیوں سے پاک کرنے کے لیے اور زیادہ ثمر آور بنانے کے اسلام سے متحارب پالیسیوں سے بچاتے ہوتے دیگر نظام ہائے معاشیات سے بھی استفادہ سود مند ہو سکتا ہے تو استفادہ کیا جانا چاہیے۔ یہ معاشی خاکہ نہایت سادہ اور پیچیدگیوں سے مبرا ہے اور اسلامی تاریخ میں موجود نظام ہائے معیشت میں ایسی ہی راستی اور سادگی ملتی ہے۔ اسلام میں عوام کو معاشی تنظیم میں شامل کرنے یا خارج کر دینے کے معاملے میں کہیں بھی اور کوئی بھی شرط وجزا کا معاملہ نہیں رہا، ہاں البتہ کچھ حدود و قیود کا واضح تعین ضرور ملتا ہے۔ جس کو وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان مفکرین معاشیات نے معروضی انداز میں جانچا اور پرکھا ہے اور زمانے، علاقے، موسم، وسائل اور ذرائع کے پیش نظر اجتہاد سے اس کی قطع و برید کرتے رہے ہیں اور اپنی اپنی ضرورتوں سے ہم آہنگی کے لیے نئے نئے اصول وضوابط طے کرتے رہے ہیں۔ اسلامی ریاست میں جو بھی معاشی نظام مروج ہو گا اس میں حلال وحرام کی ایک کڑی اور بڑی شرط کا لحاظ بہر طور پر رکھنا ہو گا اور جہاں یہ نظام نافذ رہا، وہاں اس کڑی شرط کا لحاظ ہمیشہ رہا ہے۔۔ پیشوں کے چناؤ اور رزق کمانے کے ہر ہنر کے لیے ہر صورت، حلال ذریعہ اور وسیلہ مستحسن قرار دیا جائے گا۔ حلال کمائی پر زکوٰۃ یعنی اڑھائی فی صد سالانہ اور اسی طرح زمینی پیداوار پر "عشر" یعنی دس فی صد اور جانوروں پر بھی ایک خاص حد کے بعد ایسا ہی زکوۃ کا حکم لاگو ہو جاتا ہے۔ اسلامی معاشی نظام پر انسان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جتنا چاہے اتنا کما سکتا ہے بشرطیکہ طریقہ حلال ہو اور زکوۃ و عشر کی ادائیگی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہو۔

جہاں اسلامی معاشی نظام میں پیشے کے منتخب کرنے میں کچھ شرائط کو ملحوظ رکھنا لازم ہے اسی طرح اسلامی نظام معیشت آمدن اور اس کے مصارف کے متعلق بھی احکامات اور رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اسراف اور بخل دونوں کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام میں معاشی کا مقصد بیان کرتے ہوئے حکیم محمد اسحاق لکھتے ہیں:

> "اسلامی زندگی میں معاش مقصد حیات یا زندگی کا نصب العین نہیں بلکہ وسیلہ حیات ہے اور اس حیثیت سے اسلام اس کی اہمیت اور اس کے حفظ و بقا کا حامی ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے معاشی ضروریات کا مہیا ہونا ضروری ہے۔۔۔ ایک حدیث میں دنیاوی اسباب کا بنیادی مصرف واضح کیا گیا اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے مال، نماز کے قیام اور ادائیگی زکوۃ کے لیے نازل کیا ہے اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامل ہیں۔"(۸۳)

اسلام اپنے معاشی نظام کو بہت اہمیت دیتا ہے اور آغاز سے ہی اس نظام کو ایک قاعدے اور اصول کا پابند کرایا گیا تھا۔ حلال و حرام کے ساتھ اس کے ذرائع چھوڑ دیے گئے اور مال کے کمانے اور اس کے مصارف پر واضح احکامات سامنے آ گئے تھے۔ اسلامی اقتصادی نظریہ پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم فارانی نے لکھا ہے:

> ''اسلامی معاشی نظام میں محتاجوں، معذوروں، پسماندہ افراد کی امداد کے لیے جمع شدہ دولت، سرمائے اور ریوڑ سے مقررہ سالانہ زکوۃ ادا کی جائے اور زمینی پیداوار سے مقررہ عشر ادا کیا جائے اور دوسرے ناداروں، یتیموں اور بے کسوں کی اس طرح امداد کی جائے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں۔''(۸۴)

اسلام کا معاشی نظام جہاں دولت کی جمع آوری اور مصارف کے لیے احکامات رکھتا ہے وہاں وہ ایسے عناصر کا انسداد بھی چاہتا ہے جن سے معاشی نظام میں بگاڑ جنم لیے سکتا ہے۔ مثلاً سود یا ربوٰ، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، زمین داری یا سرمایہ داری، ممنوع کاروبار، زکوۃ و عشر سے دوری وغیرہ اس ضمن میں مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری کی رائے کچھ یوں ہے:

> ''اسلام کے معاشی نظام کا بنیادی نکتہ کیا ہے؟ عام معاشی نظام خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی بیشتر اس کی بنیاد لینے اور سمیٹنے پر قائم ہوا کرتی ہے لیکن اسلامی نظام معاش کی بنیاد اس کے برعکس ہے۔ اس کا اساسی اصول دینے اور بانٹنے پر ہے یعنی اُدھر نفع اندوزی ہے اور ادھر نفع رسانی، اُدھر اکتناز ہے ادھر انفاق۔۔۔ لیکن اسلامی اور غیر اسلامی نظام معاش میں ایک نازک مگر بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ وہاں خرچ ہوتا ہے حاصل کرنے کے لیے اور اسلام میں حاصل کیا جاتا ہے انفاق کرنے کے لیے۔۔۔ اس لیے یہاں (اسلام میں) کمانے پر بھی پابندیاں ہیں اور خرچ کرنے پر بھی۔''(۸۵)

اسلامی معیشت کے باب میں حلال ذرائع کو بڑی اہمیت حاصل ہے اسلامی شریعت بڑی صداقت کے ساتھ معاشی استحکام کے لیے شرائط کا یقین کراتی ہے اور ریاست و عدالت کے دونوں کو ان شرائط پر عمل در آمد کی ذمہ داری سونپتی ہے۔ سید عبداللہ بھی معیشت کے لیے متعین کردہ شرعی قیود کے حق میں ہیں وہ یہ ذمہ داری علمائے دین کو سونپتے ہیں کہ نظام معیشت میں نہیں بلکہ ہر شعبہ زندگی میں وہ اس بنیادی سرچشمہ ہدایت سے استنباط کریں جس کو مسلمان ضابطہ حیات مانتے ہیں اور اس وسیلہ رشد سے ہدایت کے حاصل کرنے کے خواہاں بھی ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''یہ فرض علمائے امت کا ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں کہ وہ جس اسلام کو پاکستان کی اساس قرار دیتے ہیں اسے وہ اس ملک میں نافذ بھی کر سکتے ہیں اور اس کے نفاذ کے لیے ایک ایسا دستور العمل

بھی دے سکتے ہیں جو قرآن وسنت کے اصولوں پر ہو اور جدید ترین مسائل زندگی میں رہنما بن سکے ان حالات میں معاشیات کے نئے پیمانوں کی ضرورت ہے (اور آئے روز یہ ضروریات بڑھتی، گھٹتی اور بدلتی رہیں گی)۔ ہمارے ملک (پاکستان) کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی معاشیات کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھ کر اور اسلامی اخلاقیات پر مبنی کار آمد نئے تجربوں کو لے سکتے ہیں۔ تاہم جزئیاتی طور پر معاشیات کا ایک پاکستانی منصوبہ بنانا لازمی ہے جو اسلامی نظریہ پاکستان کے حوالے سے اپنا جواز ثابت کر سکے اور عالمی ترقیات میں، مقابلہ و مسابقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے (گا)۔"(۸۶)

اس طویل اقتباس سے چھے نکات ہمارے سامنے آتے ہیں جو سید عبد اللہ کے تصور اسلامی معیشت سے متعارف کراتے ہیں:

۱۔ علما کی ذمہ داریاں۔

۲۔ اسلام پاکستان کی اساس ہے۔

۳۔ دستور العمل قرآن و سنت پر مشتمل ہو اور نافذ العمل بھی ہو۔

۴۔ زندگی اور حالات کی تبدیلی کا احساس۔

۵۔ معاشیات کے تقاضوں میں تبدیلی کا احساس۔

۶۔ پاکستانی معاشیاتی منصوبہ۔

مقصد ان کا یہ ہے کہ پاکستان عالمی سطح پر اپنے معاشیاتی اور اقتصادی معاملات سے نمٹ سکے اور خود کفالت کی منزلیں طے کرے۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب پاکستان اپنے ان معاملات کو معروضی انداز میں اسلامی پس منظر اور پیش منظر میں دیکھے گا۔ علمائے کرام کا کردار ہر عہد میں مسلمہ طور کلیدی اور اساسی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ علمائے دین کے ذمہ جہاں اسلامی روح سے آگاہی اور آشنائی کا باعث رہی ہے وہیں ان کا وجود اسلامی اقدار کی رواج پذیری، مقبولیت، بالادستی اور ترویج کا بھی ضامن رہا ہے گو مولانا مودودی ان علما سے گلہ مند بھی ہیں:

"اس قوم میں صرف ایک گروہ علما کا گروہ ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو عملی اور علمی حیثیت سے ان ذمہ داریں کا بار اٹھانے کے قابل بناتا جو 'خیر الامتہ اخرجت اللناس' ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ مگر افسوس اس گروہ نے خود اپنی ذمہ داریوں ہی کو نہیں سمجھا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ معاشیات کا مطالعہ کرتے دنیا کے معاشی مسائل کو سمجھتے، اسلام جس معاشی اصلاح کا داعی ہے اس کے اصولوں کا

فہم حاصل کرتے ،وہ طریقے دریافت کرتے جن سے کسی معاشی پالیسی کو روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔"(۸۷)

سید عبد اللہ بھی علمائے دین کو یہ ذمہ داری سونپتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ معاشی تنظیم کے باب میں وہ دیگر نظام ہائے معیشت اور اسلامی نظام کا بین المذاہبی مطالعہ کریں تاکہ اسلامی معیشت کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اس معاشی تنظیم میں پاکستانی اساس اور پاکستان سے وابستہ امیدوں کو ملحوظ رکھا جائے اور یہ نظام قرآن و سنت کے ابدی اصولوں پر قائم ہو اور عملی تقاضوں کے اعتبار سے بھی معیاری ہو تاکہ اس کو نافذ کیا جائے اور اسلامی معیشت کا نظام اپنی خوبو سے اپنے ہم عصر دیگر نظاموں سے تحسین بھی لے سکے۔ سید عبد اللہ ایک الگ پاکستانی معاشیاتی منصوبہ نافذ العمل ہوتے ہوئے دیکھنے کے خواہاں ہیں جن کی حدود کا تعین شریعت محمدی نے کیا ہوا ہو۔

سید عبد اللہ کے ہاں ملنے والے اسلامی معاشی نظام کی عملی صورت خالصتاً اسلامی اساس اور مزاج کی حامل ہے۔ اس لیے اسلامی عناصر میں اس نظام معاش کو اہم اور بنیادی عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ سید عبد اللہ کے تصور معاش کے تین نمایاں پہلو یہ ہیں:

۱۔ دولت کی منصفانہ تقسیم

۲۔ سرمایہ دارانہ نظام سے بریت

۳۔ قرض حسنہ کی تعریف اور سود کی مذمت

دولت کی منصفانہ تقسیم میں معاشیات کے کئی اصول اور ضابطے اہم ہیں لیکن اسلام اس ضمن میں زکوۃ، صدقات اور دیگر انفاق صورتوں کو بطور آلہ استعمال کرتا ہے۔ اسلام میں انفاق کی افادیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ دولت کو جمع کرنے کے وعید آئی ہے۔ قرآن مجید واضح اعلان کرتا ہے:

> "جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک سزا کی خبر سنا دو۔ جس دن کہ اسے آتش دوزخ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغ دی جائیں گی۔ یہ ہے کہ جو کچھ تم نے صرف اپنے لیے اکٹھا کیا تھا لہذا جو اکٹھا کیا تھا، اس کا مزہ چکھو۔"(۸۸)

اسلام کا یہ منشور ہے کہ دولت ایک ہاتھ میں جمع نہ ہو اور وہ ایک دائرہ میں حرکت کرے اور اس کے فیوض و برکات سے امیر غریب سب مستفیض ہوں۔ اسلام کے تصور معیشت سے سرمایہ دارانہ نظام کی اگر حوصلہ شکنی نہیں ہوتی تو سرمایہ دار کی حوصلہ افزائی بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک جگہ تو قرآن نے کہا ہے کہ ہر طعنہ دینے والے کے لیے بربادی ہے جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کے رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ زندہ باقی رہے گا تو وہ ضرور حطمہ (جہنم) میں ڈالا جائے گا۔(۸۹) کسی بھی معاشی نظام میں سود اور قرض کا مقام بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ سید عبداللہ قرض کے معاملے میں قرض حسنہ کے حق میں ہیں تاکہ ریاست میں غربت اور افلاس کو اس طرح ختم کیا جاسکے کہ پھر یہ کبھی بھی جنم نہ لے پائیں اور اسی نظام سے خوش حالی اور آسودگی کا دور دورہ رہے۔ قرض حسنہ سے مراد بحوالہ قرآن یوں ہے:

> ”ہے کوئی جو اللہ کو خوش دلی کے ساتھ قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کے قرض کو کئی گناہ بڑھا دے“۔(۹۰)

ڈاکٹر نوراللہ نے اس آیت کو دلیل مانتے ہوئے قرض حسنہ کا مفہوم بیان کیا ہے:

> ”قرض حسنہ سے مراد وہ قرض ہے جو ضرورت مند کو اللہ کی رضا کے لیے دیا جاتا ہے اور اس پر احسان نہیں جتایا جاتا اور نہ ہی ااس سے لوٹانے کی ضمانت لی جاتی ہے جیسا کہ سورۃ التغابن میں ہے کہ اگر تم اللہ کو خوش دلی سے قرض دو تو وہ تم کو اس کا دوگنا دے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے۔“(۹۱)

اس قرض حسنہ سے مراد معاشرے میں مواخاۃ اور باہمی محبت اور ایثار و تعاون کو فروغ دینا بھی ہے۔ باہمی درد مندی اور ہمدردی کے فروغ کے لیے بھی قرض حسنہ ایک بے مثال اور کارگر حیلہ ہے۔ قرض حسنہ کو سود کے پس منظر میں دیکھیے جہاں اس کے وقعت اور حیثیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ضرورت مند کی حاجت روائی کے لیے قرض حسنہ دیا جائے نہ کہ رقم سود یا ربُو پر دی جائے۔ اسلام نے بڑی وضاحت اور صراحت سے سود کی ہر شکل کو حرام قرار دیا ہے۔(۹۲)

ذرائع معاش کے ضمن میں بھی سید عبداللہ اسلامی مطمع نظر کے حامی ہیں ان کا کہنا ہے کہ حلال ذرائع اور حلال پیشے ہوں تاکہ حاصل شدہ آمدنی حرام نہ ہوں اور شرعی احکام کے منافی کام نہ ہو۔ اس ضمن میں سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ ہمیں پاکستان کی معاشی تنظیم اس طرح کرنی ہوگی کہ ہر فرد کو زندہ رہنے کے وسائل مثلاً روٹی، کپڑا، حفظان صحت کی سہولیات، تعلیم، ملازمت کے مواقع وغیرہ یکساں طور پر سے میسر ہوں۔ روزگار کے لیے کام اور آمدنی کے وسائل و مواقع بھی سب

کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ قرآن و سنت کے تقاضوں اور شرائط کا احترام کرتے ہوئے ایسا اسلامی، جدید، لچکدار اور معتدل نظام وضع کیا جائے بیشک مختلف عصری اور مروج نظاموں سے بھی اخذ و استفادہ کر لیا جائے مگر اسلام کے اساسی نظریات کو نقصان پہنچائے بنا ایسا کیا جائے گا۔(۹۳)

یہی تصور معاش ہے جو اسلامی تعلیمات سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ جس میں اللہ کی حدود بڑی واضح ہیں اور ان کا احترام کیا جائے گا علی الاجمال حلال و حرام، زکوۃ، قرض حسنہ، صدقات، ایثار و تعاون، معاشی عدل اور علی الخصوص سود کی حرمت کو یقینی بنایا جا سکے گا۔ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کا دعویدار ہے لہذا ایک نئی معاشی تنظیم یعنی مذکورہ بالا نظام کی ضرورت ہے تا کہ اہل پاکستان خوشحال اور پر آسائش زندگیاں گزار سکیں۔ معاشی خوشحالی ہی اسلامی معاش کا مقصد اولیٰ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

> ”اور یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے۔ معاشی طور پر کمزور اور غیر مستحکم تھے اور تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں طاقت ور لوگ تمہیں اچک کر نہ لے جائیں۔۔۔ پس اس نے تمہیں آزاد ٹھکانہ دیا اور اپنی مدد سے تمہیں تقویت بخشی اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا تا کہ تم اس کے شکر گزار بندے بن سکو۔“(۹۴)

اس آیت کریمہ کے مخاطب مدینہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام تھے جہاں پہلی اسلامی ریاست معرض وجود میں آئی تھی۔ آغاز میں مسلمان مہاجر تھے اور مالی اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے۔ اسی اسلامی ریاست نے مسلمانوں کو خوشحال کرنے کے لیے روزگار عام کرنے اور رزق میں کشادگی کے لیے مختلف کام کیے اور ایک مثال ریاست قائم ہوئی۔ مولانا طاہر القادری لکھتے ہیں:

> ”میثاق مدینہ اور مواخات مدینہ کے ذریعے انہوں نے (مسلمانوں کو) سیاسی اور معاشی طور پر آزاد اور مستحکم کر دیا۔۔۔ اسلامی حدود کے نفاذ کی طرف قدم بڑھایا اور ہر شخص کو غلبہ اسلام کی خاطر عظیم عالمی انقلاب کے لیے تیار کیا۔“(۹۵)

معاشی نظام کے نفاذ اور اس کے ثمرات سے معاشرہ کو بہرہ مند کرنے کے لیے اسلامی نظام معیشت نے قلیل عرصے میں ایسا لائحہ عمل تشکیل دیا اور اس کے مثبت اثرات اس ”مدنی معاشرہ“ پر تھوڑے ہی عرصے میں دیکھے جانے لگے۔ اسی طرح پاکستان کے لیے بھی سید عبداللہ ایسا ہی فعال، لچکدار، قابل عمل، جغرافیائی تقاضوں سے ہم آہنگ نظام معیشت کے

خواہاں ہیں جو کہ پاکستان کے وسائل اور مسائل کے پیش نظر مستحکم اور عملی صورت کا حامل ہو جس کے بارے میں سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ''دراصل پاکستان کو ایک خاص اپنا معاشی منشور تیار کرنا چاہیے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو مگر معاشیات پاکستان کی تشکیل اس طرح کرے کہ نئی ضرورتوں، نئے اصول محنت اور نئے طریق منصوبہ بندی کا اس میں پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ یہ بھی بنیادی ضروریات میں سے ہے محض اصطلاحات دینی ہوں یا غیر دینی کسی کے کام نہیں آسکتیں۔۔۔ لیکن شرط وہی ہے کہ اصطلاحات اپنی ہوں اوران کی روح اسلامی ہو۔''(۹۶)

سید عبد اللہ کا معاشی نظام کا تصور اسلامی فکر اور روح سے ہم آہنگ ہے اور وہ جس معاشی نظام کے پر چارک اور آرزو مند ہیں اس کی خوبی بس یہی ہے کہ وہ اسلامی روح رکھتا ہو۔ جس میں ریاست کے افراد کو بلا تخصیص معاشی مساوات حاصل ہو۔ روز گار کے ممکنہ مواقع بلا کسی شرط کے ہر فرد کو میسر ہوں۔ ریاست اپنے عوام و خواص کو ہر ممکن فیض کے حصول کے وسائل باہم پہنچائے۔ ایک فعال نظام معیشت جو معاشرے میں نفاق کو ختم کرے، باہمی اتحاد اور تعصبات کی دوری کو یقینی بناتا ہے۔ عوام کا معیار زندگی کی بہتری کا موجب بنتا ہے اور اس نظام کا منطقی نتیجہ فرد کی ہمہ جہت ترقی اور بقاہے اور یہی اسلامی معاشرے کی منتہاہے۔

''سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی عناصر'' کے تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ سید عبد اللہ ایک سچے اور باعلم مسلمان ہیں۔ ان کا مزاج اور مذاق دونوں کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات نے خاص کردار ادا کیا ہے۔ وہ اسلام کو صرف مذہب نہیں، دین سمجھتے ہیں۔ دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہوتا ہے سو سید عبد اللہ اپنی زندگی میں تو دین برحق سے اصلاح اور رہبری لیتے رہے ہوں گے اسی طرح انھوں نے معاشی، معاشرتی، سماجی اور عمرانی مسائل اور معاملات مین بھی قرآن و حدیث ہی کو اصل ماخذ علم جانا ہے۔ ان کے تمام خیالات اور نظریات کی اساس خالص دینی ہے اور وہ ہر معاملے میں قرآن و حدیث سے رجوع کرتے ہیں۔ ان تصورات اور افکار سے ان کی اسلامی فکر اور دین کی سنجیدہ فہم مترشح ہوتی ہے۔ وہ ہر خیال، فکر، سوچ، منصوبہ، مشورہ، تدبیر، عمل و فعل کے لیے اسلام سے فتویٰ یا حکم لیتے ہیں اور یہ امر بھی لائق لحاظ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کرئی جھجھک یا شرم ساری محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات و عبادات پر فخر کرتے ملتے ہیں

حالانکہ ان کے عہد اکا ایک بااثر طبقہ اسلام سے شرمسار ملتا ہے اور وہ اسلام کو فرسودہ قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ کے بارے میں خود سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ''میں دیکھتا ہوں کہ پاکستان کا عام انگریز خوان اب بالکل گر تا جارہا ہے وہ اپنی زبان سے نفرت کرتا ہے اور اپنا سلسلہ شاہ ولی اللہ اور امام غزالی سے ملانے کے بجائے بیکن اور سپنسر سے ملاتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔''(۹۷)

سید عبد اللہ نے جس طبقے اشارہ کیا ہے وہ واقعی اسلامی حوالوں سے کتراتے ہیں اور مغربی حوالوں کو معتبر جانتے ہیں وہ غیروں کے رواجات واقدار، اسلوب حیات کی پیروی فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔ یہ عقل کے اندھے ایک ایسی دوڑ میں شامل ہونے پر مصر ہیں جس کا انجام تباہی وگمنامی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلام سے دوری مسلمان کے لیے موت ہے۔ نقالی اور غلامانہ تقلید کو سید عبد اللہ سخت ناپسند کرتے ہیں اور اپنے نثری سرمائے میں وہ اس پہلو پر خاص زور دیتے ہیں اقبال کے افکار اور اشعار سے حوالے بھی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا تشخص پاکستان ہے اور پاکستان کی اساس اسلام اور اسلام کے بغیر اسلامیانِ ہند گمنام ہی رہ جائیں گے۔ سید عبد اللہ کا یہ تاریخی جملہ دیکھیے:

> ''پاکستان کی بنیاد کوئی دو ستونوں پر رکھے یا تین ستونوں پر، یہ واقعہ ہے کہ اسلام ہی پاکستان کی اساس ہے جس پر سارے دوسرے ستون کھڑے کیے گئے۔''(۹۸)

سید عبد اللہ اسی اساس پاکستان یعنی اسلام کو فعال اور نافذ العمل دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا تمام تر نثری سرمایہ پاکستان کو اسلامی تجربہ گاہ بنانے کی طرف راغب کرتا ہے ان کی نثر کا مقصد اہل پاکستان سچا، کھرا اور باعمل مسلمان بنانا ہے۔ وہ پاکستان کی نظریاتی جغرافیائی، ثقافتی، معاشی حدود کو اسلام کے پیمانے سے متعین کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ پاکستان میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور اسلامی قوانین کا حقیقی نفاذ چاہتے ہیں۔ وہ اسلامیان پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسوہ حسنہ کی جھلک کے آرزو مند ہیں۔ ان کا نثری سرمایہ اسلامی عناصر سے معمور ہے اور یہی اسلامی عناصر ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے اظہار اور تکملہ کے ضامن ہیں۔

حوالہ جات

۱)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، مکتبہ خیابان ادب لاہو،۱۹۷۷، ص۲۹

۲)ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، س۔ن، ص ۱۴۲

۳)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۳۰

۴)ڈاکٹر احسان الحق، انٹرویو، رہائش گاہ،مانسہرہ، ۲۱اپریل۲۰۱۸ء

۵)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، مجلس ارادتمندان سید لاہور،۱۹۶۶ء، ص۲۱

۶)سید عبداللہ، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور،۱۹۸۷ء، ص۳

۷)عطیہ سید، آجی، مشمولہ ارمغان، ڈاکٹر سید عبداللہ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور،۲۰۰۵ء، ص۷۴

۸)ڈاکٹر داؤد رہبر، کلچر کے روحانی عناصر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۱۴، ص۱۵۵

۹)ڈاکٹر طاہر القادری، اسلامی فلسفہ زندگی، مرکز ادارہ منہاج القرآن لاہور،۱۹۸۴ء، ص۱۰

۱۰)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۱۳

۱۱)خورشید احمد، مولف، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، ص۱۵۱

۱۲)ڈاکٹر اشفاق احمد خان، مذہب، مسلمان اور سیکولرازم، نگارشات لاہور،۲۰۰۰ء، ص ۲۰۲

۱۳)ڈاکٹر سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۷، ص۱۱۷

۱۴)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۱۲

۱۵)ڈاکٹر محمد دین، مرتب، مطالعہ پاکستان، پشاور ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور ۲۰۰۰ء، ص۱۲۶

۱۶)ڈاکٹر سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۱، ص ۱۳۴

۱۷)محمد مارماڈیوک پکتھال، اسلامی تہذیب و ثقافت مرتبہ عطش درانی، شاخ زریں لاہور، ص ۵۵

۱۸)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، محمود برادران و ناشران راولپنڈی،۲۰۰۸، ص ۲۰۱

۱۹)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۴۵

۲۰)وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، پاکستاں فلسفہ اکیدمی لاہور،۱۹ء، ص ۱۷

۲۱)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۷۱

۲۲)عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایات، رائل بک کمپنی کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۳۴

۲۳)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۱۴

۲۴) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱

۲۵)ڈاکٹر خلیفہ، عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۳۰۸

۲۶)ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷

۲۷)اعجاز احمد یوسف زئی، صوفی کون؟، مطبع خانہ و سن ندارد، ص۸۷

۲۸)ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو غزل کی روایت، نگارشات لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۷۷

۲۹) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ص ۵۶۴

۳۰)مولانا عبدالماجد دریابادی، تاریخ تصوف، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۶، ص ۱۰

۳۱)ڈاکٹر سید عبداللہ، ادب و فن، ص ۱۶۸

۳۲)ڈاکٹر سید عبداللہ، طیف اقبال مرتبہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹، ص ۷۶

۳۳)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۲۰۷

۳۴) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ص ۵۸۰

۳۵)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان تعبیر و تعمیر، ص ۲۰۰

۳۶)ڈاکٹر سید عبداللہ، ایضاً، ص ۱۷۰

۳۷)ڈاکٹر سید عبداللہ، ایضاً، ص ۱۵۷

۳۸)چوہدری نذیر احمد خان، افکار ملی، فیروز سنز لاہور،۱۹۷۸ء، ص ۲۳۲

۳۹) قائد اعظم محمد علی جناح، مشمولہ پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۱۷

۴۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۳۱

۴۱)ائیر مارشل اصغر خان، پاکستان کا مستقبل، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۹ء، ص ۸۰

۴۲)ڈاکٹر سید عبد اللہ، تعلیمی خطبات، ص ۱۵۶

۴۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ادب و فن، ص ۱۵۶

۴۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۳۲

۴۵)چوہدری نذیر احمد خان، افکار ملی، ص ۲۷۹

۴۶)محمد اکرام چغتائی، اعجاز اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۷

۴۷)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ادب و فن، ص ۱۶۰

۴۸)میرزا ادیب، پیش لفظ، مقامات اقبال، لاہور اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۶

۴۹)ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، فکر اقبال، ص ۲۲

۵۰)ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، پیام مشرق، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۶۰ء ص ۷

۵۱)علامہ اقبال، قول، مشمولہ اعجاز اقبال از ڈاکٹر سید عبد اللہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴، ص ۵۰۳

۵۲)محمد شعیب آفریدی، خطبات اقبال، ادارہ فکر جدید لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۶

۵۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، اعجاز اقبال، ص ۸

۵۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، دیباچہ، مسائل اقبال، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ا

۵۵)سید عبد اللہ، قول، مشمولہ سوغات (شخصیہ) مرتبہ ممتاز منگلوری مجلس ارادتمندان سید لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۸

۵۶)ڈاکٹر سید عبد اللہ پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۷۰

۵۷)عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایات، ص ۲۷۔۳۰

۵۸)سورہ نور، پارہ ۲۴ آیت،۶۰، تاج کمپنی کراچی،۱۹۹۱ء، ص ۱۳۸۰

۵۹)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۶۷

۶۰)سورہ النسا، پارہ ۴ آیت ۵، ص ۱۸۸۰

۶۱)سورہ النسا، ایضاً

۶۲)پروفیسر محمد عثمان، اقبال کا تصور ثقافت، مشمولہ اقبال شناسی کے زاویے مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۵ء ، ص ۱۲۵

۶۳)عبد المجید سالک، ذکر اقبال، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۶۰

۶۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۴۱

۶۵)خورشید احمد، مولف، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۴۵

۶۶)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، ص ۷

۶۷)پروفیسر حمید احمد خان، تعلیم و تہذیب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۶، ص ۲۷۴

۶۸)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، ص ۷

۶۹)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان کی تعبیر و تعمیر، ص ۱۵۰

۷۰)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، ص ۴۶۶

۷۱)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۵۱

۷۲)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ایضاً ص ۱۵۰

۷۳)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، ص ۱۹

۷۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۷

۷۵)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ادب و فن، ص ۳۹

۷۶)ابن جماعہ، قول، اسلامی نظام تعلیم از مولانا سید ریاست علی ندوی، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۰۳، ص ۳۴

۷۷)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، تعلیمی خطبات، ص ۲۵

۷۸)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۵٦۵

۷۹)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ایضاً ، ص۱۵۷

۸۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ایضاً ، ص۱۵۵

۸۱)وحید عشرت، پاکستان ثقافت کی تشکیل، ص۸۷

۸۲)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۴٦

۸۳)حکیم محمد اسحاق، نظریہ کسب و نفاق، ص۱۵،۱۴

۸۴)ڈاکٹر سلیم فارانی، پیمانہء باز دید، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت مرتبہ عطش درانی، شاخ زریں لاہور، ۱۹۸٦ء، ص۹۴

۸۵)مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری، اجتہادی مسائل، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۱۵

۸٦)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۴۷

۸۷)مولانا سید ابو اعلیٰ مودودی، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ص۱۰۸

۸۸)سورہ توبہ پارہ نمبر ۹، آیت نمبر ۳۵، ص۳۴۳

۸۹)الھمزہ، پارہ نمبر ۳۰، سورہ نمبر ۱۰۴، آیت نمبر ۱تا۳، ص۱۰۸۳

۹۰)سورۃ البقرا، پارہ نمبر ۲، سورہ نمبر ۱، آیت نمبر ۲۴٦، ص٦۸

۹۱)ڈاکٹر نور اللہ، انٹرویو، شعبہ اسلامیات، ایبٹ آباد پبلک سکول ایبٹ آباد، ۲۱ فروری ۲۰۱۷

۹۲)حضرت محمدؐ، حدیث، مشمولہ دنیا کے بہترین ترسیٹھ سال، ترتیب و تالیف ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد، ۲۰۱٦ء، ص۳۷

۹۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، س۱۴٦

۹۴)سورہ انفال، پارہ نمبر ۱۰، آیت ۲٦، ص۱۴۸

۹۵)مولانا طاہر القادری، اسلامی فلسفہ زندگی، ص۱۸۳

۹۶)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۴۸

۹۷)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ایضاً، ص۱۱۷

۹۸)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ایضاً، ص۸۱

باب چہارم

سید عبد اللہ کی نثر میں پاکستانی عناصر

دو قومی نظریہ: توضیح و تشریح

پاکستانی عناصر سے مراد وہ عناصر یا اجزا ہیں جو ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آنے والی ریاست کی شناخت اور حوالہ ہیں۔ یہ ریاست بر صغیر کے مسلمانوں کی الگ یعنی منفرد شناخت کو مامون کرنے کے لیے ہی بنی ہے۔ اس مملکت نے معرض وجود میں آنے کے بعد اسلامی ثقافت اور ہندی مسلمانوں کی جن خصوصیات کو پروان چڑھایا جو دیگر اسلامی تہذیب و ثقافت سے پاکستان اور اہل پاکستان کو ممتاز کرتی ہیں وہ اس کے خاص عناصر اور عوامل ''پاکستانی عناصر'' کہلاتے ہیں۔ مسلمانان ہند کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جو مسائل در پیش آئے ان میں سب سے اہم مسئلہ ہندو مسلم کا متحدہ محاذ تھا۔ اس متحدہ محاذ کے لیے دونوں قوموں کے پاس الگ الگ وجوہ تھیں۔ مثلاً قوم انگریز نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اور مسلمانوں سے خائف تھے کہ ان سے اقتدار چھیننے کی کوشش یہی کریں گے۔(۱) دوسری جانب ہندو مسلمان قوم کو دیکھ کر خوش تھے کہ ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لینے کا موقع ملا لہٰذا دونوں قوموں نے مسلمانوں کے لیے باعزت زندگی گزارنے کی تمام راہیں بند کرنے کا فیصلہ ہی نہیں کیا بلکہ اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی انفرادیت کو نشانہ بنایا۔ یہ متحدہ محاذ جانتا تھا کہ مسلمانان ہند ہمیشہ کے لیے ان کے زیر دست ہو جائیں اور ہمیشہ محکوم و مغلوب ہی رہیں گے۔ خود مسلمانوں نے بھی اپنی شکست کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔ آثار بتلاتے ہیں کہ اب مسلمانان ہند نے اپنے لیے ہمیشہ مغلوب اور غلام بن جانے کو تقدیر کا لکھا جان کر قبول کر لیا تھا۔ سر سید احمد خان کو اللہ رب العزت نے نجات دہندہ کے طور پر بھیجا۔ سر سید احمد خان نے انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا مشورہ اور موقع دیا۔ سر سید احمد خان نے دو قومی نظریہ کا تصور دیا اور یوں ایک غیر منظم تحریک کا آغاز ۱۸۵۷ء میں ہوا جو بعد میں تحریک پاکستان کی شکل میں ڈھل گئی۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ ایک تحریک ہے جس نے مسلمانوں کے تہذیبی تحفظ، اسلامی تشخص اور باہمی بھائی چارے کے لیے کام کیا۔ ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا قیام اسی سوچ اور تحریک کی سرگرمیوں کا نتیجہ نکلتا ہے۔ بقول چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ:

> ''سر سید احمد خان کی تنظیم محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجتماع ہوا تو اسی اجتماع کے موقع پر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلم لیگ کا بطور سیاسی جماعت اعلان کر دیا گیا۔''(۲)

اس سیاسی جماعت کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا، ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور ان کی بہبود کے لیے کام کرنا۔(۳) تقسیم بنگال، تنسیخ بنگال اور اردو زبان کے خلاف گاندھی کے محاذ آرائی نے اس آل انڈیا مسلم لیگ کو آزادی ہند کے بجائے تقسیم ہند کی راہ دکھائی۔ اس راہ کے سجھانے میں علامہ اقبال کا تصور پاکستان بھی کام آیا۔ بقول مولانا عبد الستار نیازی:

> ''اقبال نے ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے خطبہ دیا تھا جس میں انہوں نے تجویز کیا تھا کہ انگریزی اقتدار کے ماتحت شمال ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقے جداگانہ انتظامی صوبوں کی شکل میں تبدیل کر دیے جائیں۔''(۴)

اقبال کے اس نظریہ کو دو قومی نظریہ سے تقویت ملی جس کو ہندوستان میں اور آج پاکستان میں نظریہ پاکستان یا فلسفہ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔ مطالبہ پاکستان کی روح ہی دو قومی نظریہ ہے ورنہ تو جغرافیائی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اگر ہندوستان میں ایک قومیت آباد ہوتی۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی دو قوموں کا مسکن جان کر اپنے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ بقول جمیل جالبی:

> ''پاکستان کی تخلیق کی وجوہ یہ تھیں کہ اپنی ''ملی شخصیت'' و ''قومی انفرادیت'' کو آزادی کے ساتھ برقرار رکھ کر وحدت کے ساتھ اپنے وجود کو قائم رکھنا تا کہ ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جاسکے جس میں ہماری روایت اور ماضی بھی موجود ہو اور جدید دور کے تقاضے بھی ہوں۔''(۵)

یہ عبارت دو قومی نظریہ کا مغز ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ملی شخصیت اور قومی انفرادیت کو ہندوانہ تہذیبی اور ثقافتی اثرات سے مامون اور محفوظ کیا جاسکے۔ اسی عزم عالیشان کے لیے مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان متفقہ طور پر منظور کی اور ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کی عملی صورت لیے جتھ گئے۔ بقول میاں عبد الرشید:

> ''قرار داد پاکستان کی منظوری اس دور کی صبح کاذب اور قیام پاکستان صبح صادق تھی۔ جیسے اسلام کے دور اول سے پہلے جاہلیت کی راہ تھی اور اس کے بعد اسلام کا روشن آفتاب طلوع ہوا۔''(۶)

پاکستان کا قیام جن مقاصد کے لیے ہوا تھا ان سارے مقاصد کی فلسفیانہ اور نظریات کی عملی صورت پاکستانی عناصر قرار دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ تمام امور جو اس مملکت خداداد کو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے جدا رنگ دیتے ہیں وہ عناصر پاکستانی ہیں۔ یہ پاکستانی عناصر سید عبداللہ نے تلاش اور بیان کیے ہیں۔ یہ اجزائے ترکیبی پاکستان کو اسلامی یا ملی تشخص دیتے ہیں اور دوسری طرف اس معاشرے کو قومی تشخص سے ہمکنار کرتے ہیں۔ پاکستانی عناصر کی پاکستانیت کی اصطلاح بھی ڈاکٹر سید عبداللہ نے استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر احسان الحق بتاتے ہیں:

> ''پاکستانیت کی اصطلاح کا استعمال پاکستان اور پاکستان سے منسلک امور اور خصائص کے لیے کیا جاتا ہے۔ پاکستان کا نظریہ، پاکستان کا سماج، تاریخ و تحریک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا شناختی حوالہ پاکستانیت کہلاتا ہے۔''(۷)

بالفاظ دیگر پاکستانیت سے مراد یہ ہوئی کہ وہ خصوصیات اور حوالے کہ جو اہل پاکستان اور متعلقات پاکستان کو دیگر قوم اور قومیتوں سے الگ اور خاص کریں مثلاً پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات، پاکستانی شاعری، پاکستانی خطاطی، پاکستانی تعمیراتی نمونے، پاکستانی موسیقی، پاکستانی میڈیا اور شو بزنس، پاکستان کے نصاب ساز ادارے، پاکستانی عرس اور میلے، جن میں وہ خاص جھلک اور رنگ جو کسی اور ملک سے ان کو جدا کرکے پاکستانی رنگ اور ڈھنگ دے پاکستانیت کہلائے گی یا کہلاتی ہے۔ پاکستانیت یا پاکستانی عناصر کی ڈھونڈ اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکمرانی کرو(Divide and rule)'' کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا نہ ہی ہندوؤں کی متعصب سوچ اور عدم برداشت کی وجہ سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی کسی بڑی تبدیلی یا انقلاب (Big Bang) کا منطقی نتیجہ تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی اسباب اور علل تھے جن سب کا انتہائی معروضی نتیجہ پاکستان تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ یا جواز کیا تھا؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''(۸)

کیونکہ قائد اعظم محمد علی جناح سمجھتے تھے کہ پاکستان کی بنیاد اسی روز رکھ دی گئی تھی جس دن پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا (۹) کیونکہ وہ شخص ہی دوسری قوم کا فرد بنا تھا اور وہ دوسری قوم ہی آج الگ ریاست کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہی دو قومی نظریہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں آباد ہیں۔ بقول نسیم حسن شاہ:

> ''دو قومی نظریہ مصنوعی اور بے جان نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک آفاقی حقیقت ہے۔ تخلیق کائنات کے الوہی پلان کا حصہ ہے۔''(۱۰)

نسیم حسن شاہ کی رائے صائب ہے کہ یہ ایک مستند، قابل توجیہہ اور عملی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کی حرارت اور حرکی قوت نے ہی اکھنڈ بھارت کے مذہبی تصور کو پارہ پارہ کیا اور پھر ایک الگ ریاست نے جنم لیا۔ دو قومی نظریہ ہی وہ حد فاصل ہے جس نے اس حقیقت کو منوایا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی نہیں بلکہ دو الگ قوم سے تعلق رکھنے والے فرد ہیں۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ نہایت مسحور کن تھا مگر اسلام اور ہندو مت کی کوئی قدر بھی مشترک نہ تھی جو اس ناتا داری کو قائم کرتی۔ دوم اکابرین اسلام نے ہندوؤں کی بھائی چارے کی چال کو بھی بھانپ لیا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے ۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ہندو کیوں نہیں سمجھتے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اقلیت اور اکثریت کی بات نہیں۔ مساوی حیثیت کی قومیں ہیں۔ چھوٹی بڑی کوئی نہیں ہے۔ ہمارا فلسفہ زندگی مختلف ہے، کلچر مختلف ہے۔ ہمارا خدا ایک ہے۔ تمہارے ساتھ کروڑوں خدا ہیں۔ ہمارا کھانا پینا مختلف ہے۔ ہمارا ہیرو ان کا دشمن ہے۔ ان کا ہیرو ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے فیض کے چشمے جدا جدا ہیں تو پھر ہم ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں؟۔''(۱۱)

قائد اعظم کے اس قول نے مسلمانوں کی ہندوستان میں ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اس دو قومی نظریہ پر ایک عمومی اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے عہد حکومت میں ایسی ضرورت کیوں پیش نہیں آئی۔ اس کا سادہ اور عام فہم جواب ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ رہنا پسند کیا اور مسلمانوں کی رواداری، انسان دوستی اور لحاظ کی غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے دونوں قومیں پر سکون اور باہمی صلح سے اکٹھی رہتی رہیں۔ مسلمانوں کے زمانے میں ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اس لیے ہزار سالہ مسلم دور حکومت کے باوجود ہندوستان میں آج بھی ہندو اکثریت میں موجود ہیں۔ اس پہلو پر مفتاح الدین ظفر کی رائے دیکھیے:

"مسلمانوں کی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی جھگڑوں کے واقعات نہیں ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا اور ان کو ہر قسم کی آزادی دی بلکہ حکومت میں بھی انہیں نمایاں حصہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندو کلچر یا تہذیب کی تمام روایات و خصوصیات اور ہندو مذہب کے تمام عقائد قائم رہے۔ یہاں تک کہ زبان اور ادب اور فنون لطیفہ میں ہندوؤں کی امتیازی خصوصیات کو کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا۔"(۱۳)

مفتاح الدین کی اس رائے سے بھلا کیوں کر کلام ممکن ہے کہ تاریخ اس امر واقعی پر گواہ ہے بر صغیر پر مسلمانوں نے کم و بیش ہزار سال حکومت کی۔ اس تمام عرصے میں مسلم سلاطین نے اسلام کے تابندہ اصولوں اور تعلیمات کے تحت غیر مسلم رعایا سے مثالی رواداری اور فراخ دلی کا سلوک روا رکھا۔ مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دی۔ ان کے مذہبی معاملات میں ذرا بھر مداخلت نہیں کی۔ انگریزوں کی طرح ہندوستان کو کالونی نہیں بنایا بلکہ ہندوستان کو اپنا وطن مانا اور ہندوؤں کو بھی اپنے ساتھ حکومت میں شامل رکھا۔ ان کو جاگیریں دیں اور ریاستیں بھی دیں۔ سلاطین دہلی پر بھی کیا موقوف ہے مغل بادشاہوں کے درباروں میں بھی ہندوؤں کو خاصا رسوخ حاصل رہا ہے۔ اکبر کے عہد میں تو ہندوؤں کے نفوذ کو ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ یہاں تک کہ مسلمان حکمرانوں نے اسلام کی تبلیغ کے لیے بھی فوج کشی یا کسی بھی قسم کی طاقت کا استعمال نہیں کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"سلطان محمد تغلق اگرچہ ایک بدنام اور متشدد بادشاہ کے طور پر مشہور کیا گیا ہے مگر اس بادشاہ نے ایک مرتبہ زمانے کے مشہور صوفی عالم حضرت معین الدین عمرانی کو بلا کر کہا کہ "میں صوفیا کا خادم ہوں لیکن مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جنوبی ہندوستان میں ابھی اسلام نہیں پہنچا۔ آپ لوگ ہیں کہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔........ کہ محمد تغلق چاہتا تو فوج کشی کرکے اس ملک کو فتح کر لیتا لیکن اس نے بطریق محبت اسلام کی تبلیغ کو لشکر کشی پر ترجیح دی۔"(۱۴)

یہ طویل اقتباس دینے کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی فرماں رواؤں نے ہندوستان میں بزور تلوار اسلام پھیلانے کا کام نہیں کیا۔ ہاں یہ امر مبنی بر حق ہے کہ کثیر تعداد میں ہندوؤں نے اسلام کے دائرے میں پناہ لی اور ہندو مت کے ذات پات کے چنگل سے خود کو آزاد کیا لیکں مسلمان حکمرانوں نے جبراً یا لالچ دے کر تبلیغ اسلام کا کام نہیں کیا۔ یہاں مظفر مہدی ہاشمی کا قول دیکھیے:

> ''سلاطین دہلی اپنے سیاسی مزاج کے اعتبار سے سیکولر تھے جنہوں نے ہر ملت و مذہب کے افراد کو اپنے اپنے راستوں پر چلنے کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔ نہ ہی کسی فرد کو طاقت کے زور پر یا کسی قبیلے کو طاقت سے مسلمان کیا۔''(۱۴)

مسلمان سلاطین کا اپنا مزاج بھی اسلام کی دین تھا۔ لا اکراہ فی الدین، اس لیے مسلمان دور حکومت میں ہندو مسلمان دو قومی نظریہ کی مطلق ضرورت پیش نہیں آئی۔

دو قومی نظریہ کی ایک صورت خیر و شر کی بھی تھی یعنی کہ دو قومی نظریہ کی ابتدائی صورت اس وقت سامنے آئی جب اس نے اللہ تعالیٰ کو سجدہ آدم سے انکار کر دیا۔ دوم یہ بھی کہا جاتا ہے ''ہابیل اور قابیل'' کا واقعہ اس نظریہ کی صورت گری ہے۔ لیکن یہاں دو قومی نظریہ کی اصل بحث ہندو اور مسلم قوم کے پس منظر میں ہے اور اس دو قومی نظریے کی تعریف بزبان قائد اعظم جامع اور مانع ہے:

> ''برصغیر میں پاکستان کی بنیاد اسی روز رکھ دی گئی جس روز توحید اور بنی نوع انسان کی مساوات اور اخوت کا منشور لے کر پہلے مسلمان نے برصغیر پر قدم رکھا۔''(۱۵)

یہی وہ اولین صورت تھی جس نے دو قومی نظریے کو پیدا کیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں خیر سگالی کی خواہ کتنی ہی مثالیں مل جائیں اور اکھنڈ بھارت میں ہندو اور مسلمان کے اکٹھے رہنے کے کتنے ہی خواب سہانے دکھائے جائیں، یہ حقیقت بہر حال مسلم ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں جو ہر زاویہ اور طرز میں جداگانہ اسلوب فکر و نظر رکھتی ہیں۔ ہندوؤں کا خیال یہی تھا کہ متحدہ ہندوستان کی آزادی کی صورت میں مغربی جمہوریت کی طرز حکومت میں وہ ہمیشہ حاکم اور مسلمان ہمیشہ محکوم اقلیت کی صورت میں رہ جائیں گے۔ برہمنی ذہنیت کی مخاصمت سے مسلمان بخوبی آگاہ تھے کہ ہندو اب اقتدار کو اپنا حق جانتے تھے اور بقول چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ:

> ''کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت میں یہ بات واضح تھی کہ یوپی کی ہندو بورژوا اور سی پورے ہندوستان کے اقتدار کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی جو بقول اس کے اس کا بنیادی اور تاریخی حق تھا۔''(۱۶)

یہ عام ہندو اور کانگریس کی سوچ تھی جو اس حق کے حصول میں مسلمانوں کو سبز باغ دکھا کر ہمیشہ کے لیے زیر نگیں رکھنے کے منصوبے بنا رہے تھے جس میں ''ہندو مسلم بھائی بھائی'' کے نعرے نے بہت سے سادہ لوح مسلمانوں گمراہ کیے۔ اہل

بینش مسلمان رہنماؤں نے اس نعرے کے پس پردہ ہندو بنیے کی ذہنیت اور تعصب کو بھانپ لیا تھا۔ مسلمان رہنماؤں نے ہندوؤں کے حق اقتدار کو یکسر رد کر دیا اور خود کو اقلیت کے بجائے ایک قوم کہنا شروع کیا۔ بقول عطش درانی:

"ہندوؤں کا یہ دعویٰ تھا کہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے مغرب کے جمہوری اصولوں کی روشنی میں حکومت ان کا حق ہے جبکہ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ وہ اقلیت نہیں بلکہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ان کی قومیت کی بنیاد ان کا دین تھا۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کا مدعی ہے اور لازمی طور پر حکومت اور سیاست بھی اس ضابطہ حیات کا ناگزیر حصہ ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے رہنے کے لیے اسلام کو بطور نظام نافذ کرنے کے لیے ایک خطے کی ضرورت تھی۔"(۱۷)

بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہ اس دو قومی نظریہ کے واضح ثبوت کے لیے تاریخ ہند میں کئی مثالیں موجود ہیں جن میں سب سے بڑی مثال تقسیم بنگال پر ہندوؤں کا رد عمل ہے۔ یہ تقسیم ایک انتظامی معاملات کے لیے کیا گیا فیصلہ تھا۔(۱۸) ہندوؤں کے احتجاج سے عام مسلمان نے بھی ان کے بغض اور نفرت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو یقین ہوا کہ ہندو کبھی بھی ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام نہیں ہونے دے گا۔ کرامت علی خان لکھتے ہیں:

"برصغیر میں صوبہ بنگال رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا۔ اس لیے حکومت (انگریز) کو انتظامی معاملات میں دقت پیش آتی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں نے بڑا شور کیا، ہڑتالیں کیں، جلوس نکالے، عدم تعاون کی دھمکیاں دیں۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں برطانوی حکومت ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔"(۱۹)

جبکہ مسلمانوں کو اس فیصلے پر خوشی تھی لہٰذا ہندوؤں کا اس پر خفا ہونا فطری امر تھا کیونکہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں تھیں۔ اس تاریخی واقعہ کو تاریخ تحریک پاکستان میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے کہ اس تقسیم بنگال نے مسلمانان ہند کے سامنے دو حقیقتوں کو آشکار کیا۔ اول یہ کہ مسلمانوں کے لیے کوئی بہتری کا موقع آیا تو ہندو اس رد کرنے کو شش کریں گے۔ دوم یہ کہ انگریز بھی ہندوؤں کے سامنے مجبور محض ہیں۔ یہ واقعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے معرض وجود میں آنے کا باعث بنا ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔

دو قومی نظریہ کے لیے دوسری بڑی مثال اردو دشمنی کا اظہار ہے۔ ہندوؤں نے اردو زبان کے خلاف وہ محاذ کھولا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اردو کو ہندوستان میں لینگو فرانکا کی حیثیت حاصل تھی اور آج بھی ہے۔ متعصب

ہندوؤں نے مسلم دشمنی کی رو میں اردو زبان کے خلاف علی الاعلان جنگ شروع کر دی۔ ہندوؤں کے اس تعصب سے بھی مسلمانانِ ہند کو شدید جذباتی دھچکا لگا اور دو قومی نظریہ کا ثبوت ملا۔ بقول ممتاز منگلوری:

"ہندوؤں کی اردو دشمنی ۱۸۶۷ء میں اعلانیہ طور پر بنارس میں کھل کر سامنے آگئی اور ہندی کے حق میں ہندو تحریکیں اٹھنے لگیں۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے ہندوؤں کے تعصب کو بھانپتے ہوئے اسلامی ثقافت اور اردو کے تحفظ کے لیے مسلمانانِ ہند کے علمی، تہذیبی اور مذہبی ورثے کی امین تھی، مناسب اقدامات شروع کیے۔"(۲۰)

اگر یوں کہا جائے کہ اردو کو ہندوستانی یا ہندی سے بدلنے کی انگریز اور ہندو قوم کی یہ بھونڈی کوشش ہندوستان کی تقسیم کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تو غلط نہ ہو گا۔ اس اردو دشمنی نے مسلمانوں کو باور کرایا کہ ہندو انگریز دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و ترقی تو درکنار ان کے تشخص کے بھی درپے ہیں لہٰذا اب مسلمانوں کے پاس ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا دو قومی نظریہ پر کامل ایمان لانا اور پاکستان کے قیام کے لیے راہ ہموار کرنا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریروں میں پاکستانی عناصر کی تلاش اور مطالعہ میں دو قومی نظریہ کے صحت مند اور فعال صورت میں ملتا ہے اور ان کے پاکستان کے حوالے سے فکری نظام کی اساس بھی ہے۔ وہ دو قومی نظریہ کو صرف ایک تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا خیال ہے اسلامی تشخص اور اسلامی روح سے مزین پاکستانی معاشرہ تبھی تشکیل پا سکے گا جب ہم من حیث القوم دو قومی نظریہ کو اپنے ضابطہ زندگی کی اساس بنائیں گے اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں بسنے والی ساری قومیتیں اور پاکستانی کی زندگی کی تمام روایات و اقدار و رسم و رواج کو اسی نظریہ سے ہم آہنگ اور مطابقت دینے کی ضرورت ہے۔ اس طرح ہم اپنی شناخت اور جداگانہ قومیت کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ باالفاظ دیگر اسلامی اقدار اور اسلام دوست روایات سے پاکستانی معاشرہ کی تشکیل میں پاکستانی قوم کی فلاح اور فوزاً عظیما کا راز مضمر ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اہل پاکستان دو قومی نظریہ کو راسخ عقیدہ کے طور پر لیں کیونکہ اس فکری سوتے کی عملی صورت نظریہ پاکستان اور مملکت پاکستان ہے۔ بقول سید عبداللہ:

"مسلمان از ابتدا ہندوؤں سے مختلف تھے۔ صرف عقائد و مذہب ہی کا فرق انفرادیت کا باعث نہ تھا۔ صرف توحید، رسالت اور ارکان خمسہ کی بنا پر ہی مسلمان ہندوؤں سے جدا قوم نہ تھے بلکہ ان کی کل معاشرت اور کل فلسفہ حیات ان سے مختلف تھا۔"(۲۱)

سید عبد اللہ کے ہاں ہمیں دو قومی نظریہ اور اس کی پاسداری اور پاکستان کا مستقبل ہی ان کی حب پاکستان کی لازمی شرائط کے طور پر ملتا ہے۔ وہ متحدہ بھارت سے علیحد گی کا موجب اسی نظریہ کو قرار دیتے ہیں یہی وہ نظریہ ہے جس نے مسلمانان ہند کو برہمنی ذہنیت سے متعارف کرایا اور پھر اسی نظریے نے ہندوستان میں اقلیت بننے سے مامون کیا۔ سید عبد اللہ کے نزدیک کسی بھی قوم کے لیے ایک نظریہ یا فکر اس کی شناخت یا اس کی مرکزیت کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے پاس دو قومی نظریہ ہی وہ واحد طاقت تھی جس کو بروئے کار لا کر وہ ہندوستان میں ایک نئ قوم کی تشکیل کر سکتے تھے کیونکہ ہر قوم کی قومیت کے لیے کچھ لوازم یا عناصر ہوتے ہیں۔ اسی طرح بر صغیر کے مسلمانوں کے لیے ان کی قومیت کا اسلام ہی بڑا عنصر ہے اور دو قومی نظریہ اسی اسلام کی دین ہے۔ بقول عطش درانی:

> ''ملت اسلامیہ قوم کی ہر تعریف کے مطابق ایک قوم ہے اور بہت سی قوموں کا مجموعہ بن جانے کے بعد بھی ایک قوم ہے۔ جب کوئی مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ ایک اور قوم کا فرد بن جاتا ہے جو مسلمان کہلاتا ہے۔ گویا ملت اسلامیہ ہی قوم ہے۔''(۲۲)

سید عبد اللہ دو قومی نظریہ کو پاکستان کی تخلیق کا محرک تو سمجھتے ہی ہیں بلکہ ان کے نزدیک دو قومی نظریہ ایک نئ ثقافت کی تخلیق بھی ہے۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ دو قومی نظریہ پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد ایک نئ ثقافت کا باعث بھی بنا وہ ثقافت و دیگر اسلامی ثقافتوں کا ایک منجھا اور نتھرا ہوا نمونہ (Version) ہے جس کے طفیل پاکستانیت اور پاکستانی عناصر نے تشکیلی صورت اختیار کی:

> ''پاکستانیت کسی علاقائی مزاج کا نام نہیں۔ اس سے مراد ایک مجموعی مسلم مزاج ہے جو اپنی ہزار سالہ تاریخ میں مسلمانان ہند نے ایک بین الاقوامی اسلوبیات کے تحت ڈھالا جس میں پوری تہذیب اسلامی آجاتی ہے۔ پاکستانیت کے سیدھے سادے معنی یہ ہیں کہ ادب (زندگی) کے ہر پہلو میں قومی روح منعکس کی جائے جو نظریہ پاکستان میں موجود تھی۔''(۲۳)

اس جامع تعریف کے بعد پاکستانیت کا رنگ دو قومی نظریہ ہی کی دین ہے کہ مسلمان اس ارض پاک پر اپنی اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی گزاریں گے۔ مسلمانوں کی تہذیب، تمدن و ثقافت، سماجی روایات، معاشرتی اقدار، معاشی اور اقتصادی امور، نظام عدل و مساوات غرض ہر پہلو اسلامی ہو گا تو اس وطن میں پاکستانیت پنپے گی جو اس قوم کو تہذیبی دائرے اور شناختی حوالے سے جدا کرے گی جس کو مورخین ''ہندی مسلمان'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہم اب پاکستانی مسلمان ہیں کیونکہ پاکستان میں طرز بود و باش، رسم و رواج، علم کے ڈانڈے، ادب کے استعارے اور

تشبیہات، کلچر، اسلوب فکر، فلسفہ حیات سبھی اسلامی ہے اور ہوگا کیونکہ پاکستان میں حاکمیت اعلیٰ کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔

سید عبداللہ دو قومی نظریہ کی ہمہ جہتی پر بڑا اصرار کرتے ہیں۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ دو قومی نظریہ پر ایک ہندی مسلمان اس لیے بھی ایمان لاتا ہے کہ یہ نظریہ ایک پورا فکری نظام ہے اور ایک حرکی قوت ہے جس کا عملی ثبوت قیام پاکستان کی صورت میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یاد رہے اس قیام پاکستان کے بعد دو قومی نظریہ غیر فعال نہیں ہوا بلکہ اس کی عملی صورت نے کئی نئے چیلنجوں اور عزائم کو جنم دیا ہے۔ سید عبداللہ نے اس ضمن میں خاصا کام کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی کتاب "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر" ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انہوں نے کئی مباحث کو تفصیل سے موضوع بحث بنایا۔ "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر" میں سید عبداللہ نے مسلمان قوم اور اسلامی قومیت کے تصور کی مفصل گفتگو کی ہے۔ تحریک پاکستان کے محرکات، عوامل اور نتائج کا معروضی انداز میں تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے(۲۴)۔ دو قومی نظریہ کو خاصی محنت کے ساتھ بیان کیا اور نظریہ پاکستان کے جو اسی نظریہ کے بطون سے جنم لیتا ہے زیر بحث لاتے ہیں۔ پاکستان میں بننے والی قوموں اور علاقوں کی ثقافتی تنوع اور ثقافتی عناصر کے اسلامی اور مقامیت کے حوالے سے مباحث چھیڑے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے پاکستان مقام اور کفو کو بحث کے لیے چنا اور انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد عالم اسلام کو تقویت ملی۔ یہ کتاب پاکستان اور پاکستان سے جڑی کئی امیدوں کے نقش واضح کرتی ہے۔ اس کتاب کا موضوع ماضی اور کل ہندوستان میں مسلمانوں کے مقام کی بازیابی ہے۔ ساتھ ہی نئی نسل کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی خبر بھی دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان:

> "سید صاحب تحریک آزادی اور پاکستان کے ایک سرگرم رکن رہے ہیں۔ ان کی پاکستان کی وابستگی رسمی نہیں تھی بلکہ ایک جذباتی رشتہ تھا۔ اس جذباتی تعلق کے آثار ان کی ساری تحریروں میں پاکستانی عناصر کی صورت میں بکھرے دکھائی ملتے ہیں لیکن سید صاحب کی یہ "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر" اپنی نوع کی کتاب ہے۔ جہاں انہوں نے پاکستان کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی، ثقافتی، تاریخی اور تہذیبی عناصر زیر مطالعہ لائے اور شیرازہ بند کیے بلکہ انہوں نے نئی نسل کو اس نعمت غیر مترقبہ کی قدر اور فلاح کے لیے راہیں سمجھائی ہیں کیونکہ وہ خود ایک سچے محب پاکستان تھے۔"(۲۵)

"پاکستان۔ تعبیر و تعمیر" ایک اعلیٰ پائے کی پاکستان پر لکھی گئی کتاب ہے اور اس کا کام بھی خاصا وقیع ہے کیونکہ پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد ہی اصل کہانی شروع ہوتی ہے کہ اس مملکت خداداد کو اس راہ پر چلانا اور ڈالنا تھا جس کے لیے اس کا حصول کیا گیا۔ اس لیے یہ امر لائق تحسین تھا کہ پاکستانیت اور پاکستانی عناصر کی نشان دہی کی جائے اور پاکستانیت کو فروغ دیا جائے تاکہ نئی نسل کو پاکستان اور نظریہ پاکستان کے ساتھ اس لیے محبت ہو کہ یہ اسلامی سوچ اور فکر کی تجسیم ہیں۔ دو قومی نظریہ کی تعریف و توضیح کا اہتمام اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگلی پود جان سکے کہ ہمارے آبا نے کن اختلافات پر الگ ریاست کے لیے محنت کی اور متحدہ ہندوستان جو ہماری ہزار سالہ حکومتی اور شاندار ماضی کا امین ہے ہم ان سے کیونکر الگ ہوئے اور ہم نے کیسے ان خطرات اور اپنے اندرونی و بیرونی دشمنوں سے خود کو اور آنے والی نسلوں کو مامون رکھنا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "میں سمجھتا ہوں مطالبہ پاکستان کی ظاہری اور وقتی وجہ کچھ بھی ہو، اس کی اصولی اور مستقل اور گہری وجہ یہی معاشرے کو ناقابل حل اختلاف تھا جس کے زیر اثر سب دوسرے مسئلے مثلاً معاشی و سیاسی اختلافات پیدا ہوئے۔ ان کے حل ہوتے ہوئے سیاسی مسئلہ بھی حل ہو جاتا تو بھی معاشرتی اور معاشی مسئلہ برقرار رہتا اور بالآخر یہ معاشی اور معاشرتی مسئلہ ایک شدید تحریک پاکستان کو جنم دیتا۔"(۲۶)

سید عبداللہ دو قومی نظریہ کے پیش منظر اور پس منظر دونوں کو خاصی تفصیل اور نہایت معروضی انداز سے موضوع بحث بناتے ہیں۔ سید عبداللہ دو قومی نظریہ کے دو رخوں کے قائل ہیں۔ اول یہ کہ یہ نظریہ پاکستان کے بننے کی خاص اور واحد وجہ ہے۔ دوم یہ پاکستان کے تمام مقاصد اور عزائم کو رخ اور سمت دینے والا ہے یعنی دو قومی نظریہ جہاں وجہ تخلیق پاکستان ہے وہیں یہ اتحاد پاکستان کی ضمانت بھی ہے۔ دو قومی نظریہ کے اجزائے ترکیبی وہی خوبیاں اور خصائص ہیں جو ایک مسلمان کو دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے منفرد کرتی ہیں۔ اسلامی عقائد اور اسلامی طرز عمل و فکر دو قومی نظریہ کی پہچان ہے یعنی وہ شخص جو مسلمان ہو جاتا ہے اس کی ایک الگ پہچان جن وجوہ سے سامنے آتی ہے وہ دو قومی نظریہ کے اجزائے ترکیبی ہے۔ بقول ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان:

> "دو قومی نظریہ خیر و شر کا نظریہ ہے۔ آدم و ابلیس اور ہابیل و قابیل کا نظریہ ہے۔ روز اول سے روز ابد تک اسی نظریے کا چلن رہے گا۔ سچ، عدل، ایمانداری و خلوص، مہر و محبت، صلہ رحمی یہ خیر والوں کا مسلک ہے اور شر اس کے متضاد۔ ہند کے تناظر میں مسلمان اور ہندو دو الگ قومیتیں تھیں

> اور ہیں کیونکہ یہ دو قومیں ہر لحاظ ہر زاویے سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔یہی دو قومی نظریہ ہے۔"(۲۷)

ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کی رائے صائب ہے کہ دو قومی نظریہ صرف مسلمانان برصغیر میں واقع نہیں ہوا بلکہ تاریخ کا تسلسل اس نظریہ کا امین ہے۔ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے حملے سے قبل بھی ہندوستان میں عرب مسلمانوں کے آثار ملتے ہیں۔راجہ داہر اور اس کے بیٹے کی شکست فاش کے بعد پہلی مسلمان حکومت سندھ اور موجودہ ملتان تک قائم ہوئی(۲۸)۔ محمد بن قاسم نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور یوں ہندوستان میں ہندو قوم کے ساتھ ایک دوسری قومیت نے جنم لیا۔دو قومی نظریہ کا اظہار سر سید احمد خان نے کیا۔بقول مفتاح الدین ظفر:

> "سر سید احمد خان نے کانگریس اور ہندوؤں کے اس رویے کو بھانپ لیا تھاچنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے روکنے کی کوشش کی تھی کیونکہ کانگریس اور ہندوؤں کا طرز عمل ایسا رہا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہو،ان کی تہذیب و تمدن پر حملہ ہو اور ان کی زندگی کے ہر شعبے میں رکاوٹیں پیدا ہوں۔"(۲۹)

دو قومی نظریہ کے ارتقا کے لیے ہندوؤں نے کسر اٹھا نہ رکھی۔۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو جب مکمل اقتدار مل گیا تو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر انگریزوں سے آزادی جدوجہد کا فیصلہ کیا تھااور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جانے لگا لیکن ہندوؤں کو یہ بات معلوم تھی کہ انگریزوں کے رخصت ہو جانے پر اقتدار کی منتقلی از روئے مغربی جمہوریت اکثریت کو ہو گی اور وہ اکثریت رکھتے تھے۔ دوم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں سے مفاہمت بھی پیدا کر لی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندو تجارت،صنعت اور تعلیم و سیاست میں مسلمانوں سے خاصے آگے نکل گئے تھے۔ ان ساری وجوہ نے ان کے اندر ہندو مت کے احیا کے خیال کو بھی پیدا کیا اور وہ انگریزوں کے بعد بلا شرکت غیرے ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھنے لگے۔ اپنے خیالات اور ہندو مت کے احیا کے تحت انہوں نے شدھی، سنگٹھن اور ہندومہاسبھا کی تحریکیں شروع کیں۔ہندوؤں کی ذہنیت کے عکاس یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک متحد،مضبوط اور گرد و پیش سے باخبر فعال سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے جو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کر سکے اور ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔"(۳۰)

آگے چل کر سوامی ستیادیو کی تقریر سے ایک اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

> ”جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے:
>
> ا: قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔ ۲: محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔ ۳: مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔ ۴: سعدی اور رومی کے بجائے کبیر اور تلسی داس پڑھو۔ ۵۔ اسلامی تقریبات کے بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔ ۶: وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق راما، کرشنا اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔“(۳۱)

ان تحریکات اور ہندو عزائم کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا، ساتھ ہی ہندی زبان کو رائج کرنا بھی تھا۔ اصل مقصد یہی تھا کہ ہندو مت کا احیا کیا جائے اور ہندوستان پر مکمل اقتدار حاصل کیا جا سکے۔ جب ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سرکردہ ہندو رہنماؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سرکاری علاقوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کیا جائے اور اس کے بجائے بھاشا(ہندی) زبان رائج کی جائے اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے(۳۲)۔ اردو زبان کی یوں مخالفت مسلمانوں کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ مسلمانوں کے سان گمان میں نہ تھا کہ ہندو اس اردو کو رد کریں گے۔ یہ تو مشترکہ زبان تھی۔ ہندوؤں کی اردو دشمنی نے بھی دو قومی نظریہ کو مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر سرفراز حسین لکھتے ہیں کہ جب اردو دشمنی سامنے آئی تو:

> ”سر سید احمد خان جو ہندو مسلم اتحاد کے ایک مشہور داعی تھے۔ پہلے پہل ہندوؤں کے اردو کے خلاف ہندی لانے کے مطالبے کو سن کر کہا اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی راہیں الگ الگ ہو رہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اختلافات کی یہ خلیج وسیع تر ہوتی جائے گی۔“(۳۲)

دو قومی نظریہ میں اردو دشمنی نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ اردو دشمنی اور ہندی کے حق میں چلائی گئی ہندوؤں کی تحریک کا مسلمانان برصغیر کے ذہنوں پر زبردست رد عمل ہوا اور مسلمان لیڈروں نے آزادی ہند کے ساتھ ساتھ مستقبل میں مسلمانوں کی صورت حال کا بھی سنجیدگی سے اندازہ لگانا شروع کر دیا(۳۴)۔ ہندوؤں کی احیا اور ہندو دشمنی کے رد عمل میں مسلمانوں کے اندر بھی احیائے اسلامی اور اردو سے محبت کا جذبہ نمایاں ہونے لگا اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی اپنی تہذیب، ثقافت اور دین کے لیے فکر مند ہونے لگے۔

سید عبد اللہ اردو زبان کو دو قومی نظریہ کا ایک لازمی جزو قرار دیتے ہیں جس نے عوام اور خواص دونوں کو یہ باور کرایا کہ اردو زبان کی دشمنی اور ہندی زبان کے رائج کی تحریک بھی دو الگ قوموں کا منشور ہے اور ہندوستان میں یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں کیونکہ اردو زبان ہندوستان میں مسلم ثقافت کی امین ہے اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کا نمونہ ہے۔ مسلمان اس زبان کو اسی لیے بہت عزیز رکھتے ہیں۔

دو قومی نظریہ کی توضیح و تشریح کی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہ سید عبد اللہ دو قومی نظریہ کو پاکستان کے قیام کا اصل محرک جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک دو قومی نظریہ ہندوستانی مسلمانوں کے قد کاٹھ اور عظیم الشان تاریخ کا ثبوت ہے۔ دو قومی نظریہ حق اور باطل کے درمیان حد فاصل قائم کرنے والا ہے۔ دو قومی نظریہ پاکستان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ حق کے قیام اور نظریاتی ریاست کا باعث بنا۔ دو قومی نظریہ پاکستان بن جانے کے بعد معطل نہیں ہو گیا۔ سید عبد اللہ مانتے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا اصل تکنیکی نظام یہ ہے کہ پاکستان کو اصل روح کے ساتھ ساتھ مضبوط اسلام کا قلعہ بنایا جائے۔ سید عبد اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دو قومی نظریہ ہی بعد از قیام پاکستان، قرارداد مقاصد بنا ہے۔ دو قومی نظریہ کا اصل مقصد اقتدار اعلیٰ اللہ کا ماننا ہے اور اس کی حاکمیت کے تحت زندگیاں بسر کرنی ہیں اور پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کو مضبوط کرنا ہے۔ اگر سید عبد اللہ کے لفظوں میں بحث کو ختم کیا جائے تو:

> "ماحصل یہ ہے کہ قائداعظم نے ایک علیحدہ ملک کا جو مطالبہ کیا اس کی بنیاد مذہب بنی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم پاکستان کو اسلامی عقیدوں کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔"(۳۵)

یہ تجربہ گاہ ہی اسلامی اصولوں کی ہے جو دو قومی نظریہ کو لے کر حاصل کی گئی۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ الگ قوم، الگ دین اور الگ ثقافت کی نمود و نمائش اور نمونے کے لیے اس ریاست کو حاصل کیا گیا۔

پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر

سید عبد اللہ کے ہاں پائے جانے والے پاکستانی عناصر میں سب سے نمایاں عنصر پاکستانی ثقافت ہے۔ انھوں نے 'پاکستانی کلچر یا ثقافت' کے باب میں خاصی محنت اور تحقیق کی ہے اور ایک کتاب خصوص سے اسی موضوع پر لکھی ہے جس کا نام 'کلچر کا مسئلہ' ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر ان کی تقاریر اور مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہے اور ان کی کتاب

'پاکستان تو تعبیر و تعمیر'، 'تحریک نفاذ اردو' شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان میں بھی پاکستانی کلچر کے حوالے سے پر مغز مقالات ملتے ہیں۔

ثقافت کی اصطلاح کی توضیح

پاکستانی عناصر میں پاکستانی ثقافت یا کلچر کو سید عبد اللہ کا پسندیدہ موضوع بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ سید عبد اللہ کے خیالات سے براہ راست استفادہ کرنے سے قبل تعریف دیکھ لیتے ہیں۔ ثقافت یا کلچر کی کوئی ایک جامع یا متفقہ تعریف ممکن نہیں۔ ماہرین علم نے اس کی کئی تعریفیں کیں۔ اردو زبان میں بالخصوص ثقافت کے مترادفات نے بھی اس کی تعریف کی قطعیت اور جامعیت کی تعریف کو نقصان پہنچایا۔ بہر طور ثقافت کے لیے اردو میں تہذیب و تمدن کی اصطلاحیں بھی مستعمل رہی ہیں۔ ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

> "اول وہ عقیدے، قدریں، افکار، تجزیے، امنگیں ی آدرش جنھیں کوئی انسانی گروہ یا برادری عزیز رکھتی ہے۔ دوم وہ عادات، رسوم و طور اطوار جو اس گروہ میں رائج اور مقبول ہوتے ہیں۔ سوم وہ فنون مثلاً ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری اور دستکاریاں جن میں یہی باطنی تجزیے، قدریں، عقائد، افکار اور ظاہری طور اطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔"(۳۶)

بالفاظ دیگر فیض صاحب کی تعریف کے مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ ثقافت سے مراد کسی انسانی گروہ کا طرز رہن سہن، ان کی اجتماعی زندگی کے آداب اور اسلوب، روزہ مرہ کے معاملات جن میں لین دین، رشتہ داری کے تقاضے، شادی بیاہ کے رسم و رواج، غمی، خوشی، تہوار، سیاسی، اقتصادی، معاشی مسائل و وسائل شامل ہیں۔ کلچر یا ثقافت کی ایک اور تعریف دیکھیے جو سید عبد اللہ کرتے ہیں:

> "وہ طرز زندگی جو کسی قانونی جبر کے بغیر، رضاکارانہ معاشرے کے سب افراد میں کم و بیش مشترک حیثیت رکھتا ہے اور حسن کی شان رکھتا ہے جس سے زندگی زیادہ بامعنی اور پر راحت بن جاتی ہے، یہ کلچر ہے۔"(۳۷)

سید عبداللہ نے کلچر کے لفظ یا اصطلاح کو ثقافت کے ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کلچر اس کل کا نام ہے جس میں مذہب و عقائد،علوم و اخلاقیات،معاملات اور معاشرت،فنون و ہنر،رسم و رواج،افعال ارادی اور قانون،صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسانی معاشرے کے لیے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے اور جن کے برتنے سے معاشرے کے متضاد و مختلف افراد اور طبقوں میں اشتراک و مماثلت،وحدت و یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔''(۳۸)

جالبی صاحب کی تعریف جامع و مانع ہے کہ زندگی کی رنگارنگی کا ہر رخ جس طور اظہار چاہتا ہے اور ظہور پاتا ہے وہ ثقافت ہے۔ایک تعریف اور دیکھتے ہیں۔بقول منشی عبدالرحمان:

> ''انگریزی لفظ 'کلچر' کو سب سے پہلے بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان نے ثقافت کے معنوں کا جامہ پہنایا اور یہ لفظ دنیائے علم اور ادب میں بہت جلد رواج پا تا گیا۔ثقافت پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔یہ زندگی کی کلیت،تہذیب و تمدن،معاشرت،معاملات اور طرز زندگی کا نام ہے۔اس میں رہن سہن سب شامل ہے۔''(۳۹)

مذکورہ تمام تعریفوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ثقافت یا کلچر انسان کے معاشرتی رویوں اور اخلاق کا نام ہے۔انسان ایک گروہ یعنی معاشرہ میں رہتا ہے تو اس کے ملنے ملانے،رہنے سہنے،لین دین،معاملات،مہر و محبت،شادی ماتم،خوشی غمی، قانون،رسم و رواج،معاشی مسائل و اطوار و آداب،خرد و نوش غرض ہر وہ زاویہ جو اجتماعی زندگی میں صورت پذیر ہوتا ہے اس کے ایک معیاری عمل و رد عمل کو ثقافت کہتے ہیں۔انسانی زندگی کی اظہاری صورت کلچر کہلاتی ہے۔سر سید احمد خان کی تعریف اس دعویٰ کی تائید کرے گی:

> ''(ثقافت سے) مراد انسان کے تمام افعال ارادی،اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی و تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔''(۴۰)

سر سید احمد خان کی تعریف تمام دیگر تعریفوں سے اپنی جامعیت کے حوالے میں بڑھ کر ہے اور سر سید احمد خان بھی انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو کے ربط واختلاط کے ہر پہلو کو کلچر اور ثقافت میں شمار کرتے ہیں۔

اردو زبان میں ثقافت، تہذیب اور انگریزی کا لفظ کلچر باہم ایک معنوں میں مستعمل ہیں بلکہ بعض ماہرین فن کے نزدیک ایک کلچر کی اصطلاح مذکورہ بالا تمام اصطلاحات سے خاص وقیع ہے۔ اس ضمن میں مفہوم میں کچھ فرق بعض ماہرین نے رکھا بھی ہے۔ مثلاً فیض احمد فیض کہتے ہیں:

> ''میں ثقافت کے بجائے پرانا لفظ تہذیب استعمال کروں گا۔ تہذیب سے ہماری مراد وہی لفظ ہے جو لفظ کلچر کا ہے۔ اردو میں کلچر کے ہم معنی لفظ موجود نہ ہونے پر ہمیں حیران نہ ہونا چاہیے۔''(۴۱)

اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ثقافت، تہذیب اور کلچر کو فیض احمد فیض ایک معنوں میں گردانتے اور برتتے ہیں جو کہ اکثریتی ماہرین علوم کا اسلوب ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی کلچر اور تہذیب کو ہم معنی قرار دیتے ہیں:

> ''انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے 'کلچر' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ کلچر لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپیوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا۔ جسمانی یا ذہنی اصلاح وترقی، کھیتی باڑی کرنا۔ اردو، عربی اور فارسی میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔''(۴۲)

اسی طرح شان الحق حقی بھی اپنے ایک مضمون میں ثقافت، کلچر اور تہذیب کو ہم معنی اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتے ہیں(۴۳)۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ابھی تک تو (ہم سے) کلچر کے لیے صحیح متبادل لفظ بھی نہیں تلاش کیا جاسکا۔ باقی توجیحات تو بعد کی ہیں۔ ویسے کلچر کے مفہوم میں ثقافت یا تمدن کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ کوئی انہیں درست کہتا ہے تو کوئی غلط۔ ثقافت کا لفظ اپنے محدود معنوں میں فنون لطیفہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔''(۴۴)

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس رائے کو رد کرنا مشکل ہے۔ واقعی آج بھی ماہرین علم مندرجہ بالا اصطلاحات کے استعمال پر ایک دوسرے پر جرح کرتے ہیں۔ ماہرین کا تاحال اتفاق نہیں ہوا۔ اس حقیقت کو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر بھی ان الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں:

''کلچر بھی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی اہل علم و دانش نے مختلف قسم کی بیسیوں تعریفیں کی ہیں۔
کلچر کے لیے عربی اور اردو میں ثقافت کی اصطلاح عصر حاضر کی پیداوار ہے۔''(۴۵)

مندرجہ بالا ساری تعریفات میں جو بات مشترک ہے وہ یہی ہے کہ تاحال ماہرین علم کسی ایک بات پر اتفاق نہیں کر پائے تاہم ثقافت، کلچر، تہذیب اور تمدن مترادفات کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں اور یہی بات ہے کہ کلچر اور ثقافت کے مترادف کے طور پر یہاں مراد لیا ہے۔اب یہاں ڈاکٹر سید عبد اللہ کی تعریف کو محاکماتی طور پر لیتے ہیں:

''کلچر کا مقبول ترین اردو ترجمہ ثقافت ہے۔اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے لیے تہذیب اور بے خیالی میں تمدن کا لفظ بھی استعمال ہو جاتا ہے میں نے اس کتاب میں کلچر کی اصطلاح اختیار کی ہے۔''(۴۶)

یاد رہے کہ سید عبد اللہ خود بعض جگہوں پر ثقافت کے لی تہذیب کی اصطلاح بھی برت جاتے ہیں خیر یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔بحث کو آگے بڑھاتے ہیں کہ سید عبد اللہ نے کلچر اور ثقافت کو ایک معنوں میں برتا ہے۔اسی لیے پاکستانی کلچر یعنی پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کی تلاش مقصود ہے۔

اسلامی ثقافت کی تعریف

اسلامی ثقافت سے مراد وہ ثقافت ہو گی جو مسلمانوں کے معاشرہ میں پھلے پھولے اور جو اسلامی معاشرت کی دین یا اسلامی طرز حیات کا نتیجہ ہو۔اسلامی ثقافت ان اقدار و روایات کی امین ہو گی جو قرآن و سنت کے احکامات اور تعلیمات سے تشکیل پائیں گی۔دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ وہ اسلامی ثقافت وہ ہو گی جو دین اسلام کے ضابطوں سے متشکل ہونے والے معاشرے میں ظہور پذیر ہو۔اسلامی ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے محمد مارماڈیوک پکتھال لکھتے ہیں:

''اسلامی ثقافت تو دینی کلمہ پر مبنی ہے۔خالص حقیقی عمل، مکمل دینی نظام جس کی تمام اوقات میں پیروی ضروری اور لابدی ہے اور محض عبادت کے اوقات میں اتباع کا تو شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔''(۴۷)

اس عبارت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلامی ثقافت اسلامی تعلیمات کی دین ہے اور اسلامی معاشرہ کا اعزاز ہے یعنی مسلمانوں کے معاشرے کی مستحسن اور اسلامی نظریہ سے ہم آہنگ اقدار و روایات، عادات و اطوار، رسوم و رواج، اسلامی

ثقافت کہلاتے ہیں۔افراد، معاشرہ کے سماجی معاملات، معاشی اطوار، تمدن، فنون لطیفہ، فلسفہ و حکمت، عقائد و عبادات، اخلاق غرض ہر زاویہ زندگی اسلامی اصول و آئین اور قرآن و سنت سے مطابقت رکھتا ہو گا تو اسلامی ثقافت ظہور پذیر ہو گی۔اسلامی ثقافت کی اصطلاح سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ثقافت یا کلچر کے لیے مذہب ضروری ہے؟ کیا مذہب میں کسی ثقافت کے تشخص کا حوالہ بنتا ہے؟ یوں کہا جائے کہ کچھ مستشرقین نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اسلامی ثقافت ایک مذہبی اصطلاح ہے جو مسلمانوں کی اختراع کردہ ہے ثقافت کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس سوال اور اعتراض کا جواب سید عبد اللہ کچھ یوں دیتے ہیں:

"اسلامی کلچر ایک خاص معاشرے سے ابھرا جس کا آغاز اسلام کے ابتدائی کارکنوں اور علمبرداروں کی طرز زندگی سے ہوا۔ آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ اور صحابہؓ کے عمل و تعامل سے اس کے بنیادی نشانات قائم ہوئے۔ آنے والے مسلمانوں نے تقریباً ہر دور میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ کسی خاص معاملے میں آنحضرتؐ اور صحابہؓ کا تعامل کیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ تجسس ان کے تہذیبی مزاج کا ایک داخلی عنصر بن گیا۔ مسلمانوں کا کلچر اپنے مزاج کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو عناصر کا حامل تھا۔ اولاً یہ کہ اس کے مرکزی نقوش دین سے حاصل کیے گئے تھے اور دین اسلام عقائد و عبادات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ ایک مجلسی نظام اور طریقہ زندگی بھی تھا، دوم یہ کلچر خالصتاً قومی اور یک قومی نہ تھا۔"(۴۸)

اس اقتباس سے یہ جواب واضح طور پر مل گیا کہ ثقافت کے لیے عقیدہ یا نظریہ حیات لازمی ہے۔ عقائد ہی نظام زندگی اور طرز حیات کو ایک سمت اور حدود مہیا کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسلام سے قبل عرب معاشرے ایک شتر بے مہار کی طرح تھا اور اسلامی نظام حیات نے اس معاشرت کو تیئیس سال کے قلیل عرصے میں ایک ضابطہ حیات دے دیا اور اس ضابطے کے بعد جو کلچر یا ثقافت وہاں مروج ہوئی اسلامی ثقافت کہلائی۔ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ ثقافت اہل معاشرہ کے رجحانات، افکار اور اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ تینوں ہی مذہب یا عقائد کی دین ہوتے ہیں۔ لہٰذا مذہب اور عقیدہ ہی اس ثقافت کا اصل تعارف اور تشخص ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے دیکھیے:

"پاکستان میں ثقافت نہ صرف معاشرت اور کلچر کا بنیادی عمل ہے بلکہ یہ معاشرے میں ایک موثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب کلچر کی سطح پر آئے بغیر ایک علم کتابی ہے۔"(۴۹)

پاکستانی معاشرہ کو یہ تخصیص نہیں حاصل ہر اسلامی معاشرہ میں دین اسلام کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔اس بحث کو سید عبد اللہ کے قول سے ختم کرتے ہیں کہ میرے نزدیک مذہب کلچر کا حصہ نہیں کلچر کا سرچشمہ ہے۔(۵۰)پس ثابت ہوا کہ مذہب ہی کسی کلچر یا ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے۔سید عبد اللہ اسلامی کلچر یا ثقافت کے ساتھ ساتھ مسلم کلچر کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت / کلچر تعارف و تعریف

پاکستانی ثقافت اسلامی کلچر ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔پاکستانی ثقافت کے باب میں سید عبد اللہ کا خاصا کام ہے اور وہ اس حوالے ان کی کتاب کلچر کا مسئلہ نے نیک نام بھی کمایا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے پاکستانی ثقافت کو بڑی تفصیل اور مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور ان کے خیالات معتدل اور معروضی ہیں۔پاکستانی ثقافت کے باب میں وہ لکھتے ہیں:

> ”میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی کلچر کے تشخص کے بارے میں موجودہ غوغا اور تجہیل و تجاہل محض اس غرض سے ہے کہ ہمارے بعض احباب مسلم کلچر کی اصطلاح یا اس کے اطلاق سے بچنا چاہتے ہیں حالانکہ پاکستان و ہندوستان کی کشمکش کے پس منظر میں اس کے اختیار کر لینے میں ہزار آسانیاں تھیں یعنی ہم کہہ سکتے تھے کہ ہندوستان میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لیے اس کا غالب کلچر رنگ ہندوانہ ہے اور پاکستان میں اکثریت چونکہ مسلمانوں کی ہے اس لیے اس کا غالب کلچر رنگ مسلم کلچر اور تاریخ سے پیدا شدہ ہے۔“(۵۱)

پاکستان میں پاکستانی کلچر یا ثقافت اور ہندوستان میں ہندو کلچر یا ثقافت ہے۔اس باب میں پاکستانی کلچر یا ثقافت کے تشکیلی عناصر کی تلاش مقصود ہے تاکہ یہ پرکھا جاسکے کہ پاکستانی ثقافت کے خدوخال کیا ہیں۔اس بات سے کسے کلام ہو سکتا ہے کہ ہر نسل اور قوم اپنے عقائد، اپنی ثقافت اور تمدن اور تہذیب کی بقا اور ترویج کا حق رکھتی ہے لہٰذا ہندی مسلمانوں نے بھی پاکستان کا مطالبہ انہی اسباب کے موجب کیا تھا۔

محمد بن قاسم (۷۱۲ء) کا قائم کردہ اسلامی معاشرہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے ثقافتی تشخص اور بقا کے لیے پاکستان میں ڈھلتا ہے۔ان بارہ سو سالوں میں اس ثقافت اور کلچر نے خود کو مامون رکھا کیونکہ مسلمان برسر اقتدار رہے کیونکہ مسلمان ہمیشہ اسی اصول اور نظریہ پر کاربند رہے ہیں۔بقول خورشید احمد ندیم:

> ''کسی خطہ زمین پر اگر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے تو بحیثیت مسلمان وہ اس بات کے پابند ہیں کہ اس سر زمین پر شریعت اسلامی کی حکومت ہو اور مسلمان اہل اقتدار محض اس کے احکام نافذ کرنے والے ہوں۔''(۵۲)

اس تصور کے لیے مسلمانوں نے جتنی بھی توسیع سلطنت اسلامی کے لیے کام کیا تو ان علاقوں میں قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کو ترقی بھی دی اور ان اقدار کی خاص طور پر سرپرستی کی جو اسلامی کلچر کی نمایاں شناخت تھیں۔ ان ثقافتی اثرات کے نشان آج بھی ان معاشروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ فتوحات صرف زمینی نہیں تھیں بلکہ روحانی اور ثقافتی بھی تھیں۔ مسلمان حکمران طبقہ نے دنیا میں کہیں بھی اسلام کے نفاذ کے لیے جبر سے کام نہیں لیا۔ ہندوستان میں خاص طور پر تبلیغ اسلام میں کوئی زور زبردستی نہیں کی گئی یعنی حکمران طبقے نے ہندوؤں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اسلام کی تبلیغ کے ضمن میں سلطان التمش (۱۲۱۰ء۔۱۲۳۶ء) کا ایک واقعہ قابل لحاظ ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں:

> ''ابتدائی دور کے علمانے اشاعت اسلام کو اپنا فرض اولین سمجھ کر اس سلسلے میں اس دور کے سلطان التمش سے اجازت چاہی لیکن سلطان جسے خدارسیدہ اور مذہبی مسلمان نے بھی اس معاملے میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔''(۵۳)

اس اقتباس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان حکمران سیکولر تھے جنھوں نے اپنے اقتدار میں جبر سے کام بالکل بھی نہیں لیا بلکہ مذہبی رواداری کو اپنایا اور دیگر مذاہب بالخصوص ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ اس مذہبی رواداری نے مقامی ثقافتوں اور دیگر مذہبی کلچروں کو بھی نشو و نما پانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے۔ مسلمانوں کی ثقافت بھی اس عرصے میں پلی بڑھی۔ حکمران جماعت نے اپنے مذہبی سرچشمہ سے فیض یابی حاصل کی اور اپنی ثقافت کو اسلامی مزاج اور اسلامی تقاضوں کے عین مطابق پروان چڑھایا۔ اسلامی کلچر کو پرورش کے لیے خاصا خوشگوار ماحول میسر رہا ہے۔ ساتھ ہی ہندو مسلم کلچر نے باہم لین دین میں بھی بغض و بخیلی نہیں کی۔ ہر دو ثقافتوں کا مجموعی ڈھانچہ اور مزاج اپنے اپنے مذہبی عقائد کی چھوٹ اور حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ بھی کرتا رہا ہے۔ بقول منشی عبد الرحمان:

> ''کسی قوم کی ثقافت بنیادی طور پر اس کے مذہب کی تجسیم ہوتی ہے۔ اس لیے اسلامی ثقافت کے تمام سرچشمے قرآن و حدیث سے پھوٹتے ہیں۔ کتاب و سنت کے مطابق صحیح اسلامی زندگی ہی

اسلامی ثقافت کاامتیاز ہے اور اسلامی ثقافت کی روح وہ قومی روایات ہیں جو عہد رسالت، عہد
خلفائے راشدین، عہد صحابہ کرامؓ، عہد تابعین اور تبع تابعین کی یاد گار ہیں۔"(۵۴)

اسی اسلامی ثقافت یا کلچر کے لیے سید عبد اللہ نے اپنے ہاں پاکستانی ثقافت یا پاکستانی کلچر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ بر صغیر پاک و ہند میں دو کلچر موجود ہیں ۔ ایک پاکستانی اور دوسرا ہندوستانی ،بر صغیر میں پاکستانی کلچر کی اصطلاح ظاہر ہے ۱۴اگست ۱۹۴۷ء سے بعد وجود میں آئی ہے لیکن اب یہ اصطلاح ہندی مسلمانوں کے تشخص، فکری استحکام اور حق خود ارادیت کا نشان بن چکی ہے۔

پاکستانی کلچر کے تشکیلی عناصر کی بحث اس صورت میں پیدا ہوئی کہ تقسیم کے بعد اہل فکر و نظر نے فلسفہ اسلام کی عملی صورت اور نفاذ اسلام کے لیے اقدام پر اصرار کیا تو بہت سے دیگر بنیادی سوالوں کے ساتھ پاکستانی ثقافت کے عناصر کے تعین، پہچان اور تلاش کا کام بھی شروع ہوا۔ پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر پر کام کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا:

''ہم پاکستان کے سب باشندے اس ''ہند مسلم ثقافت '' کے وارث اور جانشین ہیں جو اس بر صغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں یہاں کی فضا، مزاج، آب و ہوا اور میل جول کے زیر اثر پروان چڑھی جس میں عربی کا مذہبی جوش اور آدرش شامل ہے اور افغانیوں، ایرانیوں، ترکمانیوں اور مغلوں کا مزاج اور روح بھی، نہ صرف یہ بلکہ جس کی روح نے بر صغیر پاک وہند کی روح کو اپنے مزاج میں سمو کر تہذیب کا ایسا نمونہ پیدا کیا جو کم و بیش آج بر صغیر کی زندہ تہذیب کی بنیاد ہے۔"(۵۵)

پاکستانی ثقافت کے تاریخی حقائق اس اقتباس میں بیان ہو گئے اور عناصر جن سے تشکیل ہوئی، ان کی نشان دہی بھی کر دی گئی یعنی پاکستانی ثقافت پر عربی معاشرت ،ایرانی تہذیب اور دیگر اقوام کے اثرات بیک وقت دیکھے جاسکتے ہیں جن کے مطالعہ سے پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر سے ہمارا تعارف ہو گا۔بقول سید عبد اللہ، پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کی ایک غیر رسمی ترتیب یونہی بنتی ہے جس کا بنیادی کلیہ یہ ہو گا۔سید عبد اللہ رقم طراز ہیں:

"(ہمارے) طرز زندگی میں وہ طریقے اور تصورات بھی شامل تھے جو دین سے براہ راست حاصل کیے گئے تھے اور کچھ ایسے طریقے بھی تھے جن سے دین نے تعرض نہیں کیا۔اس لیے نہیں کیا کہ وہ دین سے متصادم نہ تھے۔اسلام کا تمدنی عمل ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اس نے مفتوحہ ملکوں کے اس تمدن کو نہیں چھیڑا جو اسلام کی تمدنی روح کے مخالف نہ تھے۔"(۵۶)

اس کلیہ سے پاکستانی ثقافت کے عناصر کی تلاش خاصی آسان اور سہل ہو گئی کہ پاکستانی کلچر کے عناصر دو طرح کے ہیں کہ وہ جو دین اسلام نے دیے جیسے نظریہ حیات ،مذہبی رواداری، اعتدال پسندی ا، زبان،فنون لطیفہ ،فلسفہ تطہیر حیات وغیرہ۔دوسرے وہ جو سرزمین ہند سے پاکستانی ثقافت پر اثر انداز ہوئے یا دستیاب ہوئے جیسے میلے،شادی بیاہ کی رسمیں،خوراک اور طبی معاملات ، فنون لطیفہ ، مجسمہ سازی، مصوری، مکانات کے انداز ، مساجد کی ہندسی اشکال، موسیقی و قوالی وغیرہ۔

ثقافت اور مذہب کا رشتہ

پاکستانی ثقافت کا کلیدی اور اساسی تشکیلی عنصر مذہب اسلام ہی ہے جس نے کلمہ گویان کو الگ شناخت دے کر اقوام عالم میں معزز و ممتاز کیا۔اس کے ماننے والے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو مانتے ہیں اور مسلمان کہلاتے ہیں ۔ اپنی زندگی کا کلی مقتدر اللہ عز و جل کو تسلیم کرتے ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی حاکمیت بھی قائم کرتا ہے۔ان کا عقیدہ توحید یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے اور اس کی حاکمیت سارے جہانوں پر قائم ہے ۔(۵۷)وحدانیت کا یہ تصور عام آدمی کے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔بحیثیت قوم و ملت ایک تشکیلی طاقت رکھتا ہے لہذا معاشرتی زندگی میں بھی اس کا کردار نمایاں ہے۔عقیدہ توحید ہی وہ بنیادی عقیدہ ہے جو پاکستانی ثقافت کو الگ اور منفرد صورت دیتا ہے۔ بقول وحید عشرت:

> "کسی قوم کی ثقافت کا تعین اس کا وہ نظریہ کرتا ہے جسے کوئی قوم قبول کر کے اپنا قومی تشخص قائم کرتی ہے۔اس نظریہ کی روشنی میں وہ قوم اپنی علاقائی ثقافتوں میں حذف و قبول کا رویہ اختیار کرتی ہے ۔وہ ان اجزا کو رد کر دیتی ہے جو اس نظام یا نظریہ سے متصادم ہوتے ہیں اور ان کو قبول کرتی اور پروان چڑھاتی ہے جو کہ اس نظریہ کے معاون یا کم از کم اس کو زک پہنچانے والے عناصر نہیں ہوتے۔"(۵۸)

وحید عشرت کی اس عبارت کی روشنی میں عقیدہ توحید کے اثرات اور ثمرات کو اسلامی معاشرہ میں با آسانی پرکھ سکتے ہیں کیونکہ اسلام کی شناخت اور اساس ہی عقیدہ توحید ہے۔عقیدہ توحید کے معاشرہ پر اثرات کے متعلق ڈاکٹر سلیم فارانی لکھتے ہیں:

> ”اسلامی ثقافت کے خدوخال میں سب سے زیادہ نمایاں چیز توحید ہے اور شرک سے بیزاری ہے۔اس کی فضا ایسی ہے جس میں اس تحریک کے جراثیم ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان ے پنپنے اور بڑھنے کے امکانات بالکل صفر ہیں۔ یہاں صرف مرکزی توجہ توحید الہٰی اور معرفت ربانی ہے۔اس مطمح نظر کے تابع دیگر افعال اور سرگرمیاں ہیں۔“(۵۹)

سید عبد اللہ کا عقیدہ اور خیال بھی اس باب میں ڈاکٹر سلیم فارانی سے ملتا ہے کہ عقیدہ توحید سے منور اذہان کی زندگیاں اپنے تمام معاملات میں اسی وحدانیت کے عقیدہ سے اثرات قبول کرتی ہیں اور شرک و کفر دونوں سے بیزار رہتی ہیں۔اسی لیے اس کے اثرات ثقافت میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔پاکستانی ثقافت میں اس عقیدہ کے اثرات نمایاں اور واضح ہیں۔سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ”اسلامی ثقافت یا کلچر کا اہم اصل الاصول اس کی کلیت ہے کہ وہ خدا اور انسان اور دین و دنیا کو ہم رشتہ بنا کر چلتی ہے یعنی زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے وقت اور قیامت کے دن کو فراموش نہیں کرتی۔“(۶۰)

یہاں خدا سے مراد یہی نظریہ وحدانیت ہے۔اللہ کو یکتا مان کر زندگی گزارنا اور نفع و نقصان کو اسی کی ذات سے جوڑ دینا عقیدہ توحید ہے۔اسی نظریہ کو مان لینے والوں کی ثقافت اور کلچر میں حرص و ہوس، خیانت واقرباپروری، ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری جیسی لعنتیں اپنی موت آپ مر جاتی ہیں اور ان کی جگہ ایثار و قربانی، سچ اور ایمانداری، بھروسا اور اعتماد جیسی آفاقی خصوصیات معاشرے مین پروان چڑھنے لگتی ہیں۔کیونکہ اللہ کی مرضی اور منشا کا معاشرہ وہیں تشکیل پائے گا جہاں اللہ کا حکم نافذ ہو گا اور اللہ کا حکم وہیں نافذ العمل ہو گا جہان عقیدہ توحید کے ماننے والے رہتے ہوں گے۔لہٰذا سید عبد اللہ پاکستانی ثقافت میں جن عناصر کو خاص اور بنیادی اہمیت دیتے ہیں وہ عقیدہ توحید ہی ہے۔عقیدہ توحید کا ثمر ہے کہ وہ ثقافت اپنی اقدار میں خدا ترسی، صلہ رحمی، ستار العیوبی، مروت اور دلجوئی جیسے اعلیٰ انسانی اقدار کو پروان چڑھاتا ہے۔معاشرے میں مساوات، خدا خوفی، عفو در گزر، اور عدل کے ساتھ تحفظ و بقائے نسل انسانی کا عمل جاری رہتا ہے۔

قرآن مجید مسلمانوں کی الہامی کتاب ہے جو انسان کو ایک اعلیٰ معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک مستند اور مکمل فلسفہ حیات دیتی ہے۔پاکستانی ثقافت کا اعلیٰ اور معتبر ماخذ قرآن مجید ہے۔مسلمانوں کا ضابطہ حیات اور منشور قرآن مجید ہے۔قرآن اعلیٰ سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی صرف نشان دہی ہی نہیں کرتا بلکہ ان روایات کے حامل معاشروں اور

ان سے تہی ثقافتوں کی نشان دہی کراتا ہے۔ ثقافتی عنصر ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی کسوٹی پر وہ نہ صرف اپنی اقدار وروایات، رسم ورواج بلکہ پورے طرز زندگی کو پرکھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا اپنا دعویٰ ہے:

> "اس میں شک نہیں کہ یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے اور جو ایماندار اچھے اچھے کام کرتے ہیں ان کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر اور ثواب موجود ہے۔" (٦١)

قرآن میں اس طرح کی آیات کریمہ موجود ہیں جو مسلمانوں کو اس کتاب اللہ کو مستقل راہ بنانے کی صلاح دیتی ہیں۔ قرآن مجید میں اسلام کی تعلیمات کو اللہ نے روشن اور واضح دلیلیوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کتاب کو "ھدی اللمتقین" (٦٢) قرار دیا ہے یعنی نیک اور صالح لوگ اس کتاب سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں گے۔ حدیث میں قرآن مجید کی اہمیت اور افادیت کے متعلق واضح تعلیم موجود ہے۔ (٦٣) یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی اسی کتاب کے اردگرد گھومتی ہے۔ مسلمان اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسی کتاب کو سامنے رکھتا ہے لہذا یہ بات بھی مسلم الثبوت ہے کہ اسلامی یا پاکستانی کلچر کی بنیاد قرآن پر ہے۔ بقول ڈاکٹر نصیر احمد ناصر:

> "دین اور ثقافت لازم وملزوم ہیں۔ دین کی بنیاد ہمیشہ ایک شخص نے رکھی ہے۔ پیغمبر اعظم و آخر نے مدینۃ المنورہ پہنچتے ہی سب سے پہلے مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ آپؐ نے ثقافت کی اساس قرآن مجید کے اصولوں پر رکھی جو دراصل فطرت انسانی کے سچے اصول ہیں اور اپنی سیرت کے سانچے میں اس کا ڈھانچہ تیار کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی ثقافت کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور اس کا نمونہ (ماڈل) سیرت رسولؐ ہے۔" (٦٤)

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی ثقافت اور اسلامی ثقافت دو مترادف اصطلاحیں ہیں کیونکہ اسلامی کلچر ہی نے برصغیر پاک وہند میں اپنے جداگانہ تشخص کے لیے پاکستان کے قیام کو ناگزیر سمجھا گیا یعنی اسلامی کلچر کی جداگانہ صورت نے ہی پاکستانی ثقافت کو جنم دیا اور اپنے اصل الاصول کلیت کی بنیاد اسی قرآن اور سیرت کو رکھا۔ قرآن مجید ایک مکمل ضابطہ حیات ایک الگ طرز معاشرت کا دستور العمل ہے۔ قرآن مجید ہی وہ بساط ہے جس پر پاکستانی ثقافت نے اپنی عمارت تعمیر کرنی ہے اور کسی حد تک کی بھی ہے۔

قرآن جہاں ایک معاشرتی نظام فکر رکھتا ہے وہیں آئینی دستاویز بھی ہے ۔شادی کا معاہدہ، تقسیم وراثت، حقوق و فرائض، جرم وسزا وغیرہ کے واضح احکامات درج ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد اور دیگر معاملات ومسائل زندگی کی بابت اصول، کلیے اور مواعظ درج ہیں۔اس لیے پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں قرآن کی حیثیت بنیادی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں ہر رجحان، خیال، عمل اور کام قرآن کی تعلیمات کے عین مطابق ہو گا اور اگر کچھ بھی متصادم ہے تو قابل رد اور قابل مذموم ہو گا کیونکہ ثقافت اور کلچر اس نامیاتی کل کا نام ہے جو ایک معاشرے کے افراد کے اعتقادات وایمانیات کا جوہر خاص ہوتی ہے۔ ثقافت انہی عقائد اور دینیاتی علوم کی جمالیاتی فعالیتوں کا مرکب ہے جو اس معاشرے کے افراد اپناتے ہیں۔گویا مسلمان معاشرے میں پنپنے والی ثقافت کی روح قرآن ہے کیونکہ مسلمانوں کے تمام عقائد اور ایمانیات کا سرچشمہ اور منبع یہی کتاب ہے۔بقول سید عبد اللہ:

> "قرآن مجید اور آنحضرتؐ کے پیش کردہ واضح آداب کا ہمیشہ احترام رہا۔اگرچہ معاشرت کی جزئیات مقامی بھی ہوں مگر معاشرت کا مزاج اور رجحان عموماً دینی ہی رہا۔"(۶۵)

قرآن مجید کی اساسی صورت کا عملی اثر اور نفوذ ہمیں ہر مسلمان معاشرے میں دکھائی دیتا ہے۔ قرآن کی اقدار اور اس کی مقبول روایات کو مختلف خطہ زمین پر بسنے والے افراد اپنی مقامی ضرورتوں اور قدروں کے مطابق اپنا لیتے ہیں۔اسی طرح پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں قرآن ایک مستند اور اساسی عنصر ہے جس کے نفوذ و اثر کے واضح آثار پاکستانی ثقافت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ سنت سے مراد بقول ڈاکٹر نوراللہ:

> "نبی پاکؐ کے افعال اور اعمال حسنہ کو اصطلاح میں سنت کہتے ہیں۔فقہ میں ہر وہ کام جو نبی پاکؐ نے کیا ہو سنت کہلاتا ہے۔"(۶۶)

اس تشکیلی عنصر میں ایک جز حضرت محمدؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ریاست مدینہ سے قبل ہی آپؐ کا ایک حوالہ ان کے کردار کی پاکیزگی اور پختگی کے اہل علاقہ میں معروف ہو چکا تھا اور ریاست مدینہ کے بعد تو نبی پاکؐ کا ہر قول اور فعل آئینی حیثیت رکھتا تھا۔اس ضمن میں اللہ جل شانہ بھی فرماتے ہیں:

> "وہ (محمدؐ) تو اپنی نفسانی خواہشات سے کچھ بولتے نہیں ۔یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے ان کو (محمدؐ) کو نہایت طاقت ور نے تعلیم دی ہے جو بڑا زبردست ہے۔"(۶۷)

اس تائید ربانی نے حضرت محمد کی زندگی کے ہر پہلو، ہر زاویہ، غرض ہر سکوت و کلام کو محفوظ کرا دیا لہٰذا احدیث و سنت سے رہنمائی کا وہ اجازت نامہ ملا کہ قرآن کی عملی تفسیر سرکار دو عالم کی زندگی بن کر سامنے آگئی۔ آپؐ کا بولنا، سننا، کھانا پینا، پہننا، اوڑھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، بلانا، بھیجنا، سمجھانا، پڑھانا، تربیت و تعلیم، منصوبہ بندی اور فہم و فراست کی فیصلہ سازی کو مسلمانوں نے ایک علم کے طور پر ڈھال لیا۔ قرآن نے نبی پاکؐ کے سنن کی قدر و وقعت کا جابجا اعتراف کیا ہے۔ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> ”حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر کو بھیجا وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے ہیں۔“(۶۸)

اس اثر کی وجہ سے سنت کی اثر اندازی ہر مسلمان معاشرے میں قرآن مجید کی طرح سب سے زیادہ ہے۔لہٰذا پاکستانی ثقافت میں بھی اس کا اثر نمایاں ہے۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں، پاکستانی ثقافت میں سنت نے اپنا اثر دکھایا ہے اور تشکیلی عنصر کی حیثیت سے کردار ادا کرتی ہے۔ بقول رحیم بخش شاہین:

> ”محسن انسانیت نے عقیدہ توحید کو دلوں میں راسخ کیا۔ آخرت کی جوابدہی کا عقیدہ عام کیا، قلوب و ارواح کا تزکیہ کیا، لوگوں کو اللہ کے قانون کی اطاعت پر آمادہ کیا ان کے دلوں کو نیکی اور بھلائی کی طرف مائل کیا۔ خدا کی عبادت اور اس کے بندوں کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا، ناپسندیدہ کاموں سے نفرت سکھائی ان کے ضمیروں کے اندر برائی کے خلاف مزاحمت کو ابھارا، شرم وحیا، عفت و پاکدامنی کو ایمان کا لازمی جزو قرار دیا اور اطرح ایک پاکیزہ معاشرہ کے کی تعمیر میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔“(۶۹)

مدنی معاشرہ میں جنم لینے والی ثقافت ہی پاکستان کا معیار اور منزل ہے لہٰذا پاکستانی ثقافت نے تمام ان اقدار اور روایت کی اپنایا جو قرآن و سنت سے مطابق تھیں اور ہیں اور متصادم پر قدر اور رسم کو یکسر کر دیا ہے۔ بالفرض کچھ اقدار اگر کسی بھی سبب سے معاشرہ میں موجود ہیں تو ان کی اصلاح کا کام بھی ہو رہا ہو گا اور یہ بھی کہ اہل معاشرہ کی اکثریت ان اسلام متحارب اقدار و عادات کو مکروہ اور مذموم جانتے ہیں۔

فلسفہ تطہیر زندگی

حضرت محمدؐ جب مکہ میں مبعوث کیے گئے تو ان کا حقیقی مشن تطہیر زندگی ہی تھا یعنی اہل عرب میں رواج پا چکے مشرکانہ اور ملحدانہ عقائد اور اقدار کی بیخ کنی کرنا اور ان لوگوں کے قلوب و اذہان کو توحید سے روشناس کرانا۔ اسلام نے ہمیشہ جسمانی اور روحانی طہارت کو اولین ترجیح دی ہے اسلام پاک صاف جسم و روح رکھنے والے افراد کا معاشرہ چاہتا ہے جہاں رہنے والے باہمی محبت اور اخوت کے جذبات رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ قرآن مجید اسی سب سے مسلمانوں کو ایک برتر قوم قرار دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ”یہ احساس کہ اسلام پر عمل کرنے والے مسلمان افضل ترین قوم ہیں اور خدا نے اس قوم کو دنیا کے لیے نمونہ تطہیر و تکمیل حیات کے لیے معیار نامزد کیا ہے۔“(۷۰)

تطہیر سے مراد صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے موضوع بحث چونکہ پاکستانی کلچر کے تشکیلی عناصر ہیں تو ڈاکٹر سید عبداللہ اس نظریہ کو ”تطہیر زندگی“ سے معنون کرتے ہیں مطلب جس کا یہ ہے کہ جس علاقے یا خطے میں مسلمان رہائش اختیار کریں وہاں پر زندگی میں کمزور اور اسلام سے متصادم اقدار کو زندگی سے نکال دیں تاکہ اسلام کے نظام حیات کا سلسلہ اور تسلسل جاری اور ساری رہے۔ تطہیر زندگی کی اصطلاح سے سید صاحب کی مراد یہ ہے کہ معاشرے میں اعلیٰ اسلامی اقدار و روایات کی ترویج کی جائے اور ان عوامل سے اعتراز کیا جائے جو اسلامی اقدار سے متحارب ہیں یا کسی اور عقیدہ و مذہب کے ماننے والوں کی پہچان متصور ہوں گویا وہ تمام رسم و رواج جو ہندو، عیسائیوں یا کسی اور عقیدہ کے حامل افراد کے گروہ کے ہوں گے اور اسلامی نظریات کے منافی ہوں گے ان سے پرہیز کیا جائے گا مثلاً ہندو اپنی شادیوں کے مواقع پر خوب ناچ گانا اور شراب و کباب کی محفل کا اہتمام کرتے ہیں جبکہ مسلمان اس کے ناچ گانے سے دور رہتے ہیں اور اگر کوئی ایک آدھ خاندان ایسا کچھ غیر اسلامی کرلے تو دیگر افراد معاشرہ اس کو معیوب گردانتے ہیں یعنی سید صاحب کی تطہیر زندگی کی اصطلاح کا معنی یہ ہوئے کہ معاشرے میں نیک اور معروف روایات و رواجات کی نشوونما کی جائے تاکہ معاشرے میں نیک اور صالح لوگ رہ سکیں اور ان کے اعمال صالح سے معاشرے میں نیکی کا چلن فروغ پائے اور مثالی ثقافت تشکیل ہو سکے۔ پاکستانی ثقافت میں اسلامی اقدار اور روایات کی امین ہے سید عبداللہ نے بھی ایسی ثقافت کی خواہش رکھتے ہیں جو اپنے اندر ایسی اوصاف حمیدہ رکھے جو معاشرے میں صالح افرد کو صداقت و عدالت اور شجاعت کی اقدار کو پروان چڑھانے کے مواقع فراہم کرے اور وہ ثقافت اسلامی روح کے عین مطابق ہو۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے مطابق:

"مثالی ثقافت کا معیار یہ ہے کہ اس میں صدیقین، شہدا اور صالحین پیدا کرنے کی استعداد بدرجہ اتم ہوتی ہے اور وہ انہیں پیدا بھی کرتی ہے مدینہ کی ثقافت کی اس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے بطور پاکستانی کلچر میں بھی تطہیر زندگی کے لیے علماؤمشائخ کے علاوہ تعلیمی نظام اور افراد معاشرہ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔"(۷۱)

فلسفہ تطہیر زندگی ،سید عبداللہ کی نزدیک ایک اہم عنصر ثقافت ہے۔جس کی مدد سے پاکستان کی ثقافت کی تشکیل میں مطلوبہ کام لیا جاسکتا ہے اور اسلامی رنگ بھرا جاسکتا ہے۔

نظام اخلاقیات

ہر معاشرہ میں نظام اخلاقیات کا چلن ہی اس کے معاشرتی، سماجی، سیاسی و دیگر نظامات کو چلاتا ہے اور یہ بھی کہ ہر معاشرہ اپنے مذہب اور تہذیب سے اپنی نظام اخلاقیات کی تدوین کرتا ہے۔ اخلاقیات کا اصطلاحی مفہوم ڈاکٹر محمد اشرف کمال نے کچھ یوں لکھا ہے:

"یہ فلسفہ کی وہ شاخ ہے جو اچھے برے اعمال کے معیارات سے بحث کرتی ہے۔۔۔۔یہ انسانی افعال: خیر و شر کا علم ہے جس میں خیر کی پہچان کی جاتی ہے۔ خیر کو اخلاقیات کے برابر کا درجہ دیا جاتا ہے۔"(۷۲)

بالفاظ دیگر اخلاقیات کے معنی یہ ہوئے کہ کسی معاشرے میں رہنے کے کے لیے اچھائی اور بھلائی کے معیار اور تقاضے کیا ہیں یا کیا ہو سکتے ہیں۔ اخلاقیات با قاعدہ ایک نظام حیات ہے اور اس کی تدوین کے لیے ایک مستند فلسفہ حیات کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ خاص قوم یا معاشرہ اپنی نظام اخلاقیات مستنبط کرتا ہے۔

پاکستانی ثقافت کی اخلاقیات دین اسلام ہی کی دین ہیں اور ان اخلاقیات کا اولین مظاہرہ مدنی معاشرہ میں بطور نمونہ کیا گیا اور انہی اسالیب اخلاقیات کو بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے لازم اور قابل تقلید سمجھا اور جانا گیا۔ پاکستانی ثقافت کے اس عنصر میں وہ تمام شرائط در آتی ہیں جن سے اجتماعی زندگی پر سکون ،راست بازی، راستی، دیانت داری، حق شعاری، خوش معاملگی اور خوش سلیقگی سے گزر سکتی ہے۔ اس اخلاقیات کے نظام کے فعال ہونے سے معاشرہ میں گناہ، بے ضمیری، جھوٹ، دھوکہ دہی اور تغابن جیسی برائیاں جنم ہی نہیں لے پاتیں۔ پاکستانی اخلاقیات ایسی کجیوں اور برائیوں کے قلع قمع کی ذمہ داری ہے ہر بالغ مسلمان پر عائد کرتی ہے کہ اپنے معاشرے میں اچھائی کو فروغ اور برائی کی روک کے لیے انفرادی

حصہ ڈالیں اور معاشرتی کجیوں اور خامیوں کو ختم یا کم کرنے کی مخلص کاوش کریں۔ سید عبداللہ نظریہ ثقافت میں اخلاقیات کے عنصر کی خاصی اہمیت ہے کیونکہ ان کا نظریہ ایک عملی فکر کا حامل ہے۔ جہاں وہ اپنی ثقافت کے نظام اخلاقیات سے ایک خوش حال اور مربیانہ معاشرتی ماحول چاہتے ہیں جہاں برائی کے لیے اجتماعی اور انفرادی سطح پر نفرت اور اچھائی کے لیے رغبت ہو۔ جس کا استدلال وہ قران پاک کی اس آیت سے کرتے ہیں جو پاکستانی ثقافت کی اخلاقیات کی اساس ہے، اللہ کا حکم ہے:

> ”جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے روکتے ہیں اور نیکی کے کاموں کی طرف جلدی کرتے ہیں اور وہی نیک بختوں میں سے ہیں۔“(۷۲)

یہ وہ فرض ہے جو مسلمان قوم کو تفویض ہوا ہے اس فلسفہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ نیک بنیے اور برائی سے نفرت کیجئے تاکہ معاشرے میں مثبت سوچ و عمل رواج پائے۔ یہی اسلامی معاشرے کی اخلاقیات کا خلاصہ ہے اور پاکستانی کلچر کا کلیدی عنصر ہے۔ سید عبداللہ اس باب میں بڑا واضح نظریہ رکھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پرداخت کے لیے یہی اہم ترین عنصر ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ”اسلامی تصور کی رو سے ایک مسلمان کے وہ بنیادی فریضے ہیں ایک یہ کہ مسلمان ہم وقت داعی ہوتا ہے اور دعوت الی الخیر ایک مسلمان کا بنیادی فرض ہے۔ دنیا کی تمام مخلوق کے لیے مسلمان داعی بنا کر بھیجا گیا ہے۔“(۷۴)

نظام اخلاقیات کا ایک تشکیلی عنصر 'امر و نہی' اس کی اقدار و رواجات کے لیے کسوٹی بھی ہے۔ مقامی سطح پر اسلام کا واسطہ ہندوانہ رسوم سے تھا اور ہے بھی اور جو اسلام کی روح کے منافی ہیں لہٰذا وہ رد کر دی گئیں اور انہیں مذموم قرار دیا گیا جن میں ایک رسم جہیز دینے اور جہیز لینے کی ہے گو اس رسم کا چلن ہمارے معاشرے میں ہے لیکن عمومی فضا ایسی ہے کہ جہیز لینے اور دینے دونوں کو معاشرہ حقارت کہ نظر سے دیکھتا ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ ہندوانہ رسم پاکستان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی نیز پاکستانی اخلاقیات کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ معاشرے کے افراد سے مل جل کر رہنے کے مواقع فراہم کرے اور افراد میں انفرادی سطح پر باہمی رشتوں کو قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ بھائی چارہ پروان چڑھے اور لوگوں کو قرابت داریوں میں بھی میں عدل اور توازن برتنے کا سلیقہ ملے اور معاشرے میں محبت اور ہمدردی جگہ پائے۔ حقوق العباد سے مراد ہی اپنے متعلقین کا دھیان رکھنا اور ان کی ضروریات پر اس عزیز و اقارب اور ہمسایوں کے

ساتھ ایثار کرنا ہے۔(۷۵) ہر کسی سے بھائی چارہ بنانا اور صلہ رحمی کا سلوک کرنا غربا، یتما، مساکین، بیواؤں، بے سہاروں، ضعیفوں اور معمر لوگوں سے حسن سلوک کرنا عبادات میں شامل ہے۔ یہ سب پاکستانی ثقافت کی اخلاقیات ہیں۔ سید عبد اللہ کے نزدیک یہ عنصر پاکستانی ثقافت کے تشخص کے بقا کے لیے ضروری ہے اور اس کی تشکیل کے لیے لازمی بھی ہے۔

مذہبی رواداری

پاکستانی ثقافت، ایک ایسے علاقے میں معرض وجود میں آئی ہے کہ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ایک ایسی قوم آباد رہی جو ان سے افرادی تعداد میں کئی گنا بڑی نہیں تھی بلکہ اس قوم کے پاس ایک منضبط تاریخی اور ثروت مند تہذیب، شاندار ثقافت اور الگ سماجی اقدار بھی تھیں اس قوم کا نام ہندو تھا۔(۷۶) اس کے علاوہ سکھ دھرم سے بھی اسلام کے زمینی رابطے تھے اور ہیں۔ ایسی صورت میں ان غیر مذہب اقوام پر حکومت کرنا اور اپنے دین اور اپنی شناخت کو بھی مامون رکھنا مسلمان قوم کے لیے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اسلام نے لا اکراہ فی الدین(۷۷) کر مسلمانوں کو مذہب رواداری کا واضح درس صدیوں پہلے دے دیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ بات معلوم تھی کہ انھوں نے اپنے اطوار چھوڑنے نہیں اور دیگر اقوام کے معاملات کو چھیڑنے سے روکا ہوا ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ زندگی کی ہر سطح پر دیگر اقوام کے ساتھ مذہبی روادی اور وسیع المشربی کو اپنایا ہے اور اس کی وجہ سے ہی اسلام کے مثبت اثرات نے گذشتہ ہزار سالہ ہندوستان کی تاریخ میں اسلام کے پھیلنے کو شواہد کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہندو مذہب کی ذات پات کی تقسیم نے بھی چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں کو اسلام کے دائرے کی جانب دھکیلا اور اسلامی مذاق کی وسیع المشربی اور رواداری نے ان ستم رسیدہ لوگوں کو گلے لگایا اور بے مثال مساوات اور برابری کو مقام دیا۔ پاکستانی ثقافت میں رواداری کی ظاہری صورت اس کی عبادات میں اجتماعیت کی صورت میں چھوت چھات کے ماروں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں، اسلامی عبادات کے متعلق وحید عشرت لکھتے ہیں:

> "اسلام اتنی خوبصورتی سے ہماری معاشرتی زندگی کی تدوین کرتا ہے کہ اس کی مثال کسی اور نظام یا مذہب میں نہیں ملتی اس کے علاوہ بھی نماز، روزہ، قربانی کی عبادات کے طریق ادائیگی دیگر مذاہب کے طریق عبادات سے بدرجہا اعلیٰ اور منفرد ہیں جن کی بنا پر دیگر ثقافتوں سے ہمارا تشخص خود واضح ہو کر متعین ہوتا ہے۔"(۷۸)

ان مظاہر کو دیکھ کر معاشرتی ناانصافیوں کے مارے اور ذاتوں میں منقسم افراد اسلام کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی مذہب رواداری مسلمانوں کی خوش اخلاقی اور بھائی چارہ ان زخم خوردہ لوگوں کو اسلام میں نئے کفو سے ساتھ قبول کرتا اور

یوں اسلام کی افزائش اور ترویج ہو جاتی تھی۔ یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو حکومتی اور آئینی طور پر بھی مکمل مذہبی اور تہذیب آزادی حاصل ہے۔ ہر اقلیت اپنے اپنے مذہبی تقاضوں اور ثقافتی مطالبوں کے مطابق زندگیاں گزار رہی ہے۔ مذہبی رواداری پاکستانی ثقافت کا اہم تشکیلی عنصر ہے۔

رسوم ورواجات

پاکستانی ثقافت کی تشکیلی عناصر میں ایک اہم عنصر مقامی رسم و رواج بھی ہیں۔ اسلامی تمدن کے کم و بیش ہزار سال کے اثرات نے اس ثقافت کو خاصے دلچسپ اور نادر رسم و رواج سے بھی نوازا ہے۔ یہ رسم و رواج مقامی آبادیوں، علاقوں، قومیتوں، اقتصادی حالات، موسمی اثرات اور طبعی وجغرافیائی حالات واثرات کے سبب مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ (۷۹) کہیں یہ رسومات کلی ہندی اثرات میں ہیں اور کہیں ایرانی اور افغانی رسومات کے اثرات بھی واضح دکھائی دیتے ہیں تو کہیں یہ رسم ورواج اسلامی اثرات سے خاص پاکستانی رنگ روپ میں ملتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے اس پہلو میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ان رسم ورواج میں مسلمان قوم کلی طور پر اخذ و استفادے کے لیے آزاد نہ تھی کہ اس دیار غیر میں اس کو ایک بڑی اور مضبوط ثقافت رکھنے والی قوم کا ساتھ بھی حاصل تھا پھر بھی مسلم کلچر نے اسلام کی روح کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذاق اور مزاج کی اقدار کو رواج دینے کے لیے شعوری اور لاشعوری طور پر کام بھی کیا ہے۔ ان مسلمان قبیلوں کو کہ جن کا پہلے پہل سرزمین ہند پر غیر اقوام سے سامنا ہوا ان کو لاکھ مسائل اور پریشانیاں کا سامنا ہوا ہو گا اور انھوں نے نہایت فہم اور دلیری سے ہر میدان میں ان مسائل کا سامنا کیا اس حوالے سے پروفیسر رشید الدین خان لکھتے ہیں:

> ”ہندوستان میں مسلم ذہن کی تشکیل لازماً یا مختص طور پر اسلامی اصولوں اور عقیدوں سے نہیں ہوئی۔ اس کی ساخت پرداخت میں عقیدہ، تاریخ، سیاست، ثقافتی قدریں، پیدائش واموات میں اعداد وشمار اور یوں کہیے شعور، لاشعور، جبر اور اختیار جیسے عوامل کارفرما رہے ہیں۔“(۸۰)

اس رائے سے کلی اتفاق یوں ممکن نہیں کہ مسلمانوں کو یہ تمام مسائل اور رکاوٹیں درپیش ہوئی ہوں گی مگر یہ امر بھی لائق اعتنا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی متحارب اور مخالف رسوم اور رواجات کو ضرور بالضرور رد کیا ہے۔ اس حوالے سے تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے بڑے سے بڑے جابر حکمرانوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔(۸۱)

پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں یہ عنصر نہایت خاص ہے جس میں شادی بیاہ کی رسم ورواج سے لے کر ماتم مرگ، میلے ٹھیلے اور عرس، ایک دوسرے کے ساتھ دیگر لین دین، ملنا ملانا، تہنیت اور اور تعزیت غرض ہر زاویہ حیات شامل ہے۔ یہ رسم و رواج اپنے اندر اس خاص معاشرت اور تمدن کے نمائندے بھی ہیں جن سے پاکستان کے مختلف قوم قبیلے اپنی زندگیوں کو گزار رہے ہیں۔

اعتدال پسندی اور میانہ روی

پاکستانی ثقافت کا ایک تشکیلی عنصر اس کی اعتدال پسندی بھی ہے۔ اس بات سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے کہ پاکستانی ثقافت کا مجموعی مزاج میانہ روی پر قائم ہے۔(۸۲) یہی اعتدال پسندی اسلام زندگی کے باقی سارے معاملات میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اعتدال کو زندگی کے ہر شعبے کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے اور اسلام اپنے ماننے والوں سے اصرار کرتا ہے کہ وہ اعتدال کو زندگیوں میں اپنائیں۔ قران مجید میں نہایت صراحت کے ساتھ حکم ہوا ہے:

> ''اور جو حد سے گزر جاتا ہے اور اپنے رب کی آیات پر یقین نہیں رکھتا، ہم اس کو اس طرح کا ہی بدلہ دیتے ہیں اور عذاب آخرت واقعی بڑا سخت اور دیرپا ہے۔''(۸۳)

اس طرح زندگی اور معاملات زندگی میں توازن اور اعتدال کے لیے ایک اور جگہ فرمایا:

> ''اور تم حد سے گزرنے والوں کا کہنا مانا کرو جو دنیا میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔''(۸۴)

اس کے علاوہ بھی قرآن میں جگہ جگہ اعتدال پسندوں کے لیے نویدیں اور اسراف کرنے والوں کے لیے وعیدیں ملتی ہیں۔ اسلام اپنے معاشرے کے لیے معتدل مزاج کے افراد کو پسند کرتا ہے۔ افراد معاشرہ کے دلوں، سوچوں اور عملوں میں اعتدال اور توازن کی موجودگی درحقیقت اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ بقول ڈاکٹر مشتاق احمد گورایا:

> ''میانہ روی، اسلامی تہذیب کا طرہ امتیاز ہے۔۔۔۔ جس نے مسلمانوں کے فکر و مذاق میں اعتدال و توازن پیدا کر دیا بہر حال عقل و دل، وحی و تفکر، مادہ و روح، ظاہر و باطن، دنیا و آخرت اور حال و استقبال کی یک رنگی و موانست اسلامی تہذیب کا خاص عطیہ ہے۔''(۸۵)

یہی وہ اسلوب فکر اور طرز برتاؤ تھا جس نے اسلامی معاشرت کو خلق کیا اور جس کا ثمر پاکستانی ثقافت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اسلام کے مزاج نے ہی یہاں اعتدال اور میانہ روی کو فروغ دیا۔ اعتدال ہی وہ وصف تھا کہ جس نے ہندو کلچر کے اثرات کو چھان کر ردو قبول کیا اور پاکستانی ثقافت کا رنگ نکھرتا گیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''منفرد کلچر کی وجہ سے مسلمان قوم ہندو معاشرے میں ایک ہزار سال تک شیر و شکر رہنے کے باوجود ضم نہ ہو سکی ورنہ ہندو مذہب نے متضاد عقائد کو جذب کر کے ہم آہنگی پیدا کرنے کی اتنی زبردست صلاحیت موجود ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہونے والی کوئی قوم انفردیت کو برقرار نہ رکھ سکی۔ کشان فاتح آئے اور شمال مغربی ہندوستان کو فتح کر لیا لیکن چند ہی صوبوں میں ان کی انفرادیت ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہو گئی، ہنس، گوجر، جاٹ اور راجپوتوں سے بھی یہی عمل ہوا لیکن مسلمانوں نے اپنے آدرش کی وجہ سے نہ صرف انفرادیت کو برقرار رکھا بلکہ ایسے کلچر کو جنم دیا جو آج سارے برصغیر کے کلچر کی بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ ہند مسلم ثقافت (پاکستانی ثقافت) ہی ہماری یک جہتی، روحانی اتحاد اور قومی تصور کا سرچشمہ ہے۔''(۸۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی اس رائے اتفاق کرتے ہوئے کہ اس ثقافت کی انفرادیت کے لیے اور بھی دلیلیں بھی ہیں اور یہ بھی کہ جن عناصر نے اس انفرادیت کو برقرار رکھا ان میں ایک اعتدال اور میانہ روی کا عنصر بھی خاص طور رقابل اعتنا ہے۔ اقدار اور رسم رواج کے سانجھ کے باوجود مسلمانوں نے اپنے مذہبی مذاق اور تقاضوں پر زمانے اور عہد میں عزیز رکھا۔ ہندوؤں کے کاروبار میں سود کا لین دین بہت زیادہ ہے لیکن مسلمانوں نے اس کاروبار کو درخور اعتنا نہیں جانا اور اگر کچھ کمزور ایمان حضرات نے سود کو بطور کاروبار چنا بھی ہے تو خفیہ اور رازدار نہ طور پر کیا ہے، اس طرح برصغیر میں موسیقی کی مذہبی حیثیت کے باوجود موسیقی کو مسلمانوں نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا اور گوشت خوری کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں اسلام تعلیمات کے مطابق اپنے کلچر کو پروان چڑھایا۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کی اعتدال پسندی اور میانہ روی کی تربیت نے اسلامی مزاج کو سنوار رکھا ہے۔

مشاورت اورآزادی اظہار رائے

پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں ایک عنصر آزادی اظہار رائے بھی ہے۔ آزادی رائے کی روایت اسلامی روایات کا ایک درخشندہ اور زندہ باب ہے۔ نبی پاکؐ کی حیات مقدسہ میں مشاورت اور آزادی اظہار رائے کے کئی واقعات سیرت نگاروں نے نقل کیے ہیں۔ سرکار دو عالمؐ اپنے صحابہ کرامؓ سے میں صلاح مشورہ کرتے تھے اور ان کی رائے کو تسلیم اور رد بھی کرتے تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر میدان جنگ میں بدری صحابہ نے ایک برجی بنانے کی صلاح دی جو آپؐ نے فوراًمان لی۔ اس طرح مورچوں کے لیے جگہ پسند کرنے کے معاملے میں صحابہ کرامؓ نے نبی پاکؐ سے جو مکالمہ کیا وہ بقول محمد حسین ہیکل:

> ''مسلمانوں میں حباب بن الجموعؓ وادی بدر کی مکانی حیثیت کو سمجھتے تھے انہوں نے دیکھا کہ رسولؐ یہاں مورچہ بنانا چاہتے ہیں تو آنحضرتؐ سے عرض کیا یارسول اللہ! اگر آپ نے اس مقام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پسند فرمالیا ہے تو ہم یہاں کے علاوہ ادھر ادھر مورچہ بندی نہیں چاہتے لیکن اگر آپؐ نے اپنی رائے اور موقعہ کی اہمیت اور تدبیر کے پیش نظر تجویز فرمارہے ہیں تو۔۔۔(یہ جگہ مناسب نہیں) سرکار دوعالم رسول اللہؐ نے وہ جگہ منتخب کرلی جو ان صحابی نے بتائی تھی۔''(۸۷)

اسی طرح غزوہ خندق کے موقعے پر سلمان فارسیؓ نے خندق کا مشورہ دیا تھا(۸۸) جس کو آپؐ نے پسند فرمایا۔ سیرت محمدؐ میں ان گنت ایسے مواقع آتے ہیں جہاں نبی کریمؐ نے آزادی رائے کی تربیت کے لیے صحابہ کرامؓ سے رائے لی اور اس کو من عن تسلیم بھی کیا اور یوں معاشرے میں فرد کی رائے کے احترام کو درس دیا۔ مجلس شوریٰ اس مشاورت کی ایک سلجھی ہوئی صورت ہے۔ خلفائے راشدین بھی اسی شورائی مجلس سے صلاح مشورہ لیتے تھے اور یہ مشاورت معاملات و مسائل دینی و دنیاوی دونوں میں ہوتی تھی۔ مشاورت کے باب میں قرآنِ فرقان حمید میں بھی اللہ کا حکم یوں ہے:

> ''اے نبیؐ! آپ مسلمانوں سے معاملات میں مشورہ کرو پھر جب تم عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل کرو۔''(۸۹)

ایک اور مقام پر رب العزت کا ارشاد ہے:

> ''اے نبیؐ! آپ اپنے معاملات اور متفرق امور میں امین و نیک صحابہ سے مشورہ کیا کیجئے اور جب ارادہ کرلو تو اللہ ربھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''(۹۰)

یہی وہ آیت کریمہ ہے جن کی روشنی میں خلفائے راشدین نے مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی اور معتبر صحابہ کو اس مجلس میں شامل کیا۔ جس سے یہ مجلس شوریٰ ایک آئین ساز ریاستی ادارہ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ رحیم بخش شاہین لکھتے ہیں:

> ''خلفائے راشدین نے اس کا خاص اہتمام کیا۔ بڑے بڑے مہاجر اور انصاری صحابہ اس مجلس کے ارکان ہوا کرتے تھے۔ جو تقویٰ تدبیر اور سیاسی بصیرت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور وقت ضرورت اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے تھے۔ خلیفہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ صلح و جنگ، نظم و نسق اور دیگر اہم معاملات کا فیصلہ مجلس شوریٰ میں ہی ہو تا تھا۔''(۹۱)

سید عبد اللہ بھی رحیم بخش شاہین کے ہم خیال ہیں کہ اسلام ثقافت میں بالخصوص آزادی رائے اور فرد کی منشا کا احترام خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لیے پاکستانی ثقافت میں بھی اس عنصر کا عمل دخل ہے۔ فرد کی شخصیت کی مکمل پرداخت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جس سے اس اظہار کی آزادی حاصل ہو۔ خلفائے راشدین کے عہد اور اس کے بعد تک اسلامی معاشروں میں سچ گوئی اور اپنی رائے کے اظہار کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو اسلامی معاشرت میں سچ کے ترویج پانے کا ثبوت ہیں۔ سید عبد اللہ کا کہنا ہے کہ ایک طرف جہاں آزادی رائے لازم ہے وہیں اس رائے کا احترام بھی ملزوم ہے۔ ایک اعلیٰ قدروں کے معاشرے کے لیے آزادی اظہار رائے کی گنجائش اور رواج لازمی ہے۔

مجلسی زندگی

پاکستانی ثقافت کا ایک اور خاص الخاص عنصر مجلسی زندگی ہے۔ مجلسی زندگی سے مراد یہ ہے کیسے افراد معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ، ربط و ضبط رکھتے ہیں۔ اس بات کو کسی ثبوت کی حاجت نہیں کہ اسلامی قرابت داری اور اقربا داری کا داعی ہے اور یہ بھی کہ اسلام رہبانیت کا سخت مخالف ہے۔ آپس میں مل بیٹھنا، صلاح لینا اور دینا، دعوت دینا، ایثار اور قربانی، لحاظ اور مروت، اسلام کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان سب اسلامی تقاضوں کا مقصد ایک مجلسی زندگی کو فروغ دینا ہی ہے۔ خاص طور پر مسجد کی مرکزیت کا اہتمام بھی مجلسی زندگی اور ارتباط کا حیلہ اور وسیلہ ہے۔ مجلسی زندگی کا ایک اور حوالہ ہمسائے کے حقوق ہیں۔ دیکھیے کہ ہمسائے کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے حتٰی کہ اس کو شفعہ تک کا حق دیا گیا ہے۔

پاکستانی ثقافت کا یہی عنصر ہے جو اس ثقافت کو دیگر عالم کی ثقافتوں سے جدا اور الگ شناخت دیتا ہے۔ ثقافت کی اساس نظریہ حیات پر ہوتی ہے لہٰذا اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں کہ اس کو نجی سرگرمی (Private Business) قرار دے کہ ایک طرف کر دیا جائے بلکہ اسلام تو ایک دین (Code of life) ہے جو زندگی کے ہر پہلو اور معاملے سے براہ راست متعلق ہے۔ اس ثقافت میں مجلسی زندگی تہواروں سے افراد معاشرہ کے میل میلاپ کو یقینی بناتی ہے اور اپنی ایک خاص انداز اور پر اثر ساتھ سے مسلمانوں کی زندگی میں اپنے ہونے کا پتا دیتی ہے اور پاکستانی ثقافت کے تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ وحید عشرت اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اسلام کے نظام عبادات میں اہم ترین پہلو معاشرتی ہے اسلام فرد اور جماعت کے تعلقات میں اور مختلف آزاد کے تعلقات میں قدم قدم پر عدل اور توازن کو فروغ دینے کا قائل ہے۔ مسجد اسلام میں عبادات کا مرکز نہیں بلکہ سماجی فنکشن بھی ادا کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔حج پوری ملت کے ایک ہونے اور ایک ہی نظریہ کے علمبردار ہونے اور عالمی برادری کے رکن ہونے کا احساس ابھارتا ہے اسی طرح اسلام اتنی خوبصورتی سے ہماری معاشرتی زندگی کی تدوین کرتا ہے کہ اس کی مثال کسی اور نظام یا مذہب میں نہیں ملتی اس کے علاوہ بھی نماز، روزہ اور قربانی کی عبادات کے طریق ادائیگی دیگر مذاہب کے طریق عبادات سے بدر جہا اعلیٰ اور منفرد ہیں۔ جن کی بنا دیگر ثقافتوں سے ہمارا تشخص خود واضح ہو کر متعین ہوتا ہے۔''(۹۲)

وحید عشرت کی اس بات کی تائید یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اسلام ایک مضبوط معاشرتی پہلو کا حامل دین ہے۔ اسلام اصرار کرتا ہے کہ مسلمان زندگی کے اجتماعی پہلو کو بھی ملحوظ رکھیں۔ اسلام کا یہ بھی اصرار ہے کہ عبادات کا ظاہری پہلو بھی معاشرے میں نظر آتا رہے تاکہ ایک طرح کی آمادگی اور عبادت گزاری کے رجحان کو بڑھاوا ملے۔ مفتی سعید عبداللہ:

> ''پاکستانی ثقافت کا وہ رخ جو طرز زندگی سے متعلق ہے وہ خاصا جاندار ہے کیونکہ عبادات کو ہر مذہب نے خاص مقام دیا ہے لیکن اسلام عبادات کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں اور انسانی ارتباط پر خاصا اصرار کرتا ہے۔ کھانا کھلانے اور تحفہ دینے اور لینے پر اجر و ثواب رکھ چھوڑا ہے۔ مزید براں اسلامی معاشرے جیسا کہ پاکستان کا ہے اس میں عبادات بالخصوص نماز باجماعت، زکوۃ، روزہ اور روزے میں تراویح، فطرانہ افطاری کرانا اور کرنا، عیدین، ولیمہ اور عقیقہ کی رسمیں پاکستانی ثقافت کے ظاہری نقوش ہی ہیں جو مجلسی زندگی کی صورتیں ہیں۔ اسلامی ثقافت کی مضبوط بنیادیں ہیں کیونکہ پاکستانی کلچر انہی عناصر کا تشکیل کردہ ہے۔''(۹۳)

اگر یوں کہا جائے کہ مجلسی زندگی کی رنگارنگی اور گہما گہمی ہی پاکستانی ثقافت کو ایک وہ رنگ اور صورت دیتی ہے جو اس کو اپنی متوازی موجود دیگر ثقافتوں سے الگ شناخت اور حوالہ دیتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ عبادات کے ساتھ نکاح، گود بھرائی، تجہیز و تکفین، طلاق و وراثت، حلال و حرام وغیرہ سب ایسے اجزا ہیں جو پاکستان کی ثقافت کو جداگانہ اور الگ شکل سے نوازتے ہیں اس بات کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ ثقافت پر مذہب کا اثر سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ شان الحق حقی لکھتے ہیں:

> ''تہذیب کے صرف خارجی مظاہر یا چار ہاتھ پاؤں ہی نہیں ہوتے اس کا دل و دماغ اور ایک کیریکٹر ہوتا ہے یعنی فلسفہ زندگی جس کے بغیر تہذیب محض ایک ڈھانچہ ایک ٹھاٹھر رہ جائے گی اس پر کتنے ہی رنگارنگ دوشالے منڈھ دیے جائیں یا مرقعے ٹانک دیے جائیں۔''(۹۴)

شان الحق حقی نے جس کو فلسفہ زندگی کہا ہے اس کو دین کہتے ہیں جو اسلام ہے اور یہی پاکستانی ثقافت کی اساس ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کا اس باب میں یہ خیال ہے:

> ''مسلمانوں کا کلچر اپنے مزاج کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو خاص عناصر کا حامل ہے اولاً یہ کہ اس کے مرکزی نقوش دین سے حاصل کیے گئے تھے اور دین اسلام عقائد و عبادات کا مجموعہ ہونے کے علاوہ ایک مجلسی نظام اور طریق زندگی بھی ہے لہٰذا اس کلچر پر دین اسلام چار اطراف سے از ابتدا تا انتہا حاوی رہا لہٰذا اسلامی تمدن کی داخلی روح نمایاں طور پر دینی ہی رہی۔۔۔۔۔ اسلامی کلچر کے مرکزی نقوش ایک خاص طرز احساس، ایک خاص طرز فکر، ایک خاص طرز زندگی اور ایک خاص مجلسی نظام سے مرتب ہوئے۔ جن کی بنیاد قرآن مجید کے ارشادات اور حضرت رسول کریمؐ کی طرز زندگی پر رکھی گئی۔''(۹۵)

سید عبداللہ کا کہنا بالکل درست ہے کہ پاکستانی ثقافت میں ایک عنصر مجلسی نظام بھی ہے اور یہ مجلسی زندگی ہی پاکستانی ثقافت کا تشکیلی عنصر بھی ہے۔ مجلسی زندگی معاشرتی اقدار اور روایت پر مبنی ہوتا ہے جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ مجلسی نظام کا وظیفہ یہ ہے کہ افراد معاشرہ کو ایک متعین حدود و معیار فراہم کرنا جن کو اپنا کر اہل معاشرہ خوش اور اطمینان سے اکٹھے رہیں دوم مجلسی نظام ان رسوم و رواجات اور عادات و اطوار کا مرکب ہوتا ہے جو اہل معاشرہ اکٹھے رہتے ہوئے ایک دوسرے سے اختلاط اور ارتباط کے لیے اپناتے ہیں اور وہ ان عادات و اطوار کو پسندیدگی سے دیکھتے ہیں اور کچھ عادات اور طریقوں کو مذموم جانتے ہیں اور ان کو ناپسند قرار دیتے ہیں۔

سید عبد اللہ پاکستانی ثقافت میں ایسا ہی اسلامی حدود و قیود رکھنے والی مجلسی زندگی چاہتے ہیں جہاں رشتوں کو محرم اور نا محرم میں تقسیم کیا گیا ہو، جہاں غمی اور خوشی میں انسانی اقدار کا لحاظ رکھا گیا ہو، جہاں کسی پر مصیبت آنے پر دوسروں کا ساتھ دیا جائے اور ماتم پر سوگ منایا جائے کہ خوشی کے شادیانوں میں ہمسائے کے دکھ درد غم و پریشانی کو ہر صورت ملحوظ رکھا جائے۔ معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ ملنے ملانے ،لین دین اور عاریتاً اور ادھار اور قرض حسنہ جیسی خالص اسلامی اقدار سے کام لیا جائے۔ معاشرے میں دل کی صفائی اور زبان کی نرمی کو برتا جائے۔ احترام انسانیت کے باب میں اسلام نے ہر انسان کو حسب و نسب کی قید سے آزاد کر دیا لہٰذا ہر انسان نسب کے لحاظ سے برابر ہے۔ پاکستانی مجلسی نظام میں شاہ و گدا اور آقا اور غلام میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں البتہ ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے یہاں مسلمانوں میں بھی یہ طرز فکر ملتا ہے کہ ہر ذات دوسری ذات سے خود کو برتر تصور کرتی ہے۔(۹۷) لیکن عمومی طور پر اس طرز عمل میں شدت نہیں پائی جاتی ہے۔ سید عبد اللہ پاکستانی ثقافت کے اس عنصر میں لحاظ مروت، بردباری، حیاداری، معاملہ فہمی، صبر و تحمل اور رواداری کو لازمی اجزا گردانتے ہیں۔

اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے میں شک نہیں کیونکہ اسلام نے ایک مکمل نظام آئین بصورت قرآن و حدیث اور سنن دیا ہے جن کی مدد سے ہر وہ معاشرہ جس پر اسلام نے غلبہ پایا ہے اس کی قطع و برید کی تاکہ غیر اسلامی رسومات اور روایات ختم کر دی جائیں اور ایک اسلامی مذاق کو اس میں پیدا کیا جا سکے۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی پاکستانی ثقافت کے حوالے سے بھی یہی صورت پیش آئی اور پاکستانی مجلسی زندگی پر بھی مقامی اثرات کے ساتھ ساتھ اسلامی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور یہ عملی خالصتاً فطری ہے۔ بقول شمیم احمد:

> ”ہر معاشرہ کا ایک سوال ایک بیج ایک تقاضا اور مزاج ہوتا ہے جو اس قوم کے جغرافیائی حدود اور حالات اس کی تاریخی نوعیت مذہبی طرز احساس قدرتی اور فطری کوائف اور زمین کی خاصیت اس کے مخصوص طرز فکر سے وجود میں آتا ہے ہر قوم اور اس کی ذہنی اور جذباتی شخصیت اسی طرح زمین سے اگلتی ہے جس طرح ایک مخصوص بیج سے مخصوص پودا پھول اور پھل اگلتے ہیں۔“(۹۸)

اس قول کی روشنی میں اسلامی مزاج کے پاکستانی معاشرے میں وہی اقدار مقبول اور معروف ہیں جو اسلامی عقائد سے متحارب نہیں گو ہندی اثرات بھی ہیں لیکن پاکستانی کلچر اپنے معروف اور ظاہر و باطن میں اسلامی تعلیمات کی دین ہے جن

میں سود قابل نفرین، جھوٹ، شراب نوشی، زنا، فریب و دھوکادہی، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، کمیشن، رشوت ستانی معاشرتی برائیاں اور گمراہیاں سمجھی جاتی ہیں اور ان سب کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نظام سیاست

اسلام ایک مکمل دین ہے لہذا اس کے قوانین کے نفاذ کے لیے ایک ریاست ناگزیر تھی یعنی اسلامی نظام سیاست کو ایک تجربہ گاہ کی ضرورت تھی اس لیے اس دور میں مدینۃ المنورہ اور بعد میں پاکستان کی تخلیق عمل میں لائی گئی۔ پاکستان کو قائد اعظم نے اسلامی تجربہ گاہ قرار دیا ہے۔(۹۹) جس سے مراد یہ ہے پاکستان کہ اسلامی قوانین اور تعلیمات کو سائنسی بنیادوں پر پرکھا اور آزمایا جائے گا۔

پاکستانی ثقافت کے عناصر کی تشکیل میں سیاسی نظام کا خاص دخل ہے کیونکہ جب تک سیاسی اعتبار سے اسلامی اصولوں کو نافذ نہیں کیا جائے گا تو اسلامی معاشرہ کی حقیقی تشکیل نہ ہو پائے گی اسلامی سیاسی قوانین کے لیے ایک ریاست کی ازحد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر قاضی سلطان بتاتے ہیں:

> "اسلام کو اپنے قوانین اور اصول و ضوابط کو عملی صورت میں آزمانے کے لیے ریاست ضروری ہوتی ہے جہاں مسلمان حاکمیت اعلی اللہ کو سونپتے ہیں اور اسی کے وضع کردہ آئین کے مطابق نظام سیاست ترتیب دیتے ہیں ریاست اور حکومت کے بنا اسلام اپنا معاشرہ ترتیب ہی نہیں دے سکتا ہے اور نہ ہی ثقافت تشکیل پاسکتی ہے جو اسلامی تشخص رکھتی ہو۔"(۹۹)

پاکستانی ثقافت کی تشکیلی عناصر میں اس پہلو نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے قبل تو برصغیر میں ہند اسلامی ثقافت تھی جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان ثقافت کہلانے لگی۔ مطلب یہ ہوا پاکستانی ثقافت معرض وجود میں ہی اس وقت آئی کہ جب پاکستان بن گیا یعنی ایک الگ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے سے اسلامی ثقافت وجود میں آئی اور یوں کہا جائے کہ پاکستان کے وجود میں آنا اسلامی ثقافت اور اسلامی سیاسی نظام کے تحفظ کی ضمانت بنا ہے تو بے جانہ ہو گا۔ بقول ڈاکٹر علامہ اقبال:

> "میں اسلامی قوانین کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے نفاذ سے کم از کم سب کو روٹی کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی شریعت کے نفاد کے لیے مسلمان مملکت یا مسلمان

ریاست کا قیام ضروری ہے اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ اس میں ایک یا ایک سے زیادہ مسلمان اکثریتی ریاستیں وجود میں آجائیں۔"(۱۰۰)

یہ وہ دلیل ہے جس کے نتیجے میں پاکستان حاصل ہوا اور اسلامی سیاسی نظام کے آئین نے کام کا آغاز کیا گو کہ اسلامی سیاست کا مکمل نفاذ تاحال عمل میں نہیں آیا مگر اسلامی رجحان اور اسلامیائے جانے کا کام جاری ہے اور اس کے نیک اثرات ثقافت کے لیے بھی سودمند ہیں۔ پاکستانی کلچر کے سیاسی پہلو پر یوں بھی بات کی جاسکتی ہے کہ اسلامی اصول سیاست جن کی بنا احکامات الٰہی اور سنت رسول پر قائم ہے وہ ہی پاکستانی ثقافت کو بھی اسلامی خطوط پر نشوونما دینے میں مدد دیتے ہیں۔ اسلامی قوانین کا روپ خواہ وہ عائلی قانون ہوں یا روایتی، معاشی و اقتصادی، عدل و انصاف کے قانون ہوں یہی پاکستانی ثقافت کے سیاسی عناصر ہیں جو اس ثقافت کے پنپنے اور پروان چڑھنے کے ضامن ہیں۔ بقول منور ابن صادق:

"اسلامی اصول سیاست میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو اولین اساس کی حیثیت حاصل ہے اس اساس پر جو طرز حکومت قائم ہو گا اس میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار کے مظہر قوانین و احکام یعنی قرآن و حدیث کے کما حقہٗ نفاد اور اس ضمن میں ضروری قواعد سازی اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں شورائیت سے بہتر کوئی طریق نہیں۔"(۱۰۱)

سیاسی نظام کے تشکیلی عنصر ہونے کا ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے پاس ہو گا اور زمین پر اللہ کا خلیفہ ایسا ماحول اور ایسی فضا ساز گار کرے گا جس میں اسلامی حیات کے سنہری اصولوں پر افراد معاشرہ عمل پیرا ہوں ثانیاً وہ ثقافت اور تمدن معرض وجود میں آئے جو اپنی الگ اسلامی شان رکھتا ہو۔ سید عبد اللہ کے ہاں بھی سیاسی پہلو کو خاصی وقعت حاصل ہے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیاسی استحکام اور سیاسی قوت کے حاصل کیے بغیر پاکستانی ثقافت کا نہ حال محفوظ ہے اور نہ مستقبل، اسی لیے پاکستان کا حصول کیا گیا لہٰذا وہ مسلمان قوم کو مشورہ دیتے ہیں:

"جب تک پاکستانی قوم میں خود شعوری پیدا نہیں ہوتی یعنی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم منفرد قوم ہیں یعنی دنیا میں ہمارا کوئی منفرد نصب العین ہے اور وہ ایسا ہے جو موجودہ اقوام عالم میں سے کسی کے پاس نہیں اس وقت تک محض غلامانہ طرز بود و باش سے کوئی منفرد و مخصوص کلچر پیدا نہیں ہو سکتا۔"(۱۰۲)

نظام سیاست جہاں معاشرہ کو پر امن بناتا ہے وہیں اقدار عالیہ کو ساز گار ماحول فراہم کرتا ہے، سیاسی طاقت ہی کسی عقیدہ کے اثرات کے لیے فضا بناتی ہے اور پھر ثقافتی اقدار و آثار بڑھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کا قیام ہی در حقیقت اس ماحول کا ضامن ہے جس میں اسلامی اقدار اعلیٰ اور روایات عالیہ پروان چڑھیں گی اور ایک مثالی اسلامی خصائص کی حامل معاشرت معرض وجود میں آئے گی۔

زبان

کسی بھی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں مذہب کے بعد سب سے نمایاں، مستند اور معتبر تشکیلی عنصر زبان کا ہوتا ہے۔ قومیت کی تشکیل میں بھی ایک وحدت کا شیرازہ زبان ہوتی ہے۔ قومیت کی تشکیل کلچر کی دین ہے۔ قومیت کے لیے کہیں نسب، قبیلہ، علاقہ، مذہب اور زبان حوالہ بنتا ہے۔ زبانی ایک قوم کو یگانگت، فکری ہم آہنگی، آزادی فکر و اظہار سے نوازتی ہے لہذا زبان کو کسی بھی کلچر کی تشکیل میں بنیادی مقام حاصل رہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے سہارے ایک انسان دوسرے انسان کے تجربات، خیالات، محسوسات اور جذبات میں شریک ہوتا ہے اور اس عمل سے اس کی طرز فکر و عمل میں مماثلت پیدا ہوتی ہے۔ طرز فکر و عمل کی یہی مماثلت کسی معاشرے میں تہذیبی و معاشرتی یک جہتی پیدا کر کے ایک مشترک کلچر کو جنم دیتی ہے۔''(۱۰۳)

یوں کہا جائے کہ زبان ہی وہ وسیلہ ہے جو انسان کی معاشرت پسند طبع کی تسکین کا موجب ہے تو غلط نہ ہو گا۔ زبان ہی انسان کی معاشرتی ضروریات کے تکملہ اور جذباتی تسلی کے وسیلے کے طور پر بھی کام کرتی ہے، زبان کے بغیر تو کسی قوم یا معاشرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سید عبداللہ زبان کو کلچر کا ایک کلیدی عنصر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں زبان کو کلچر میں شامل بھی نہیں کرتا کیونکہ کلچر وہ ہے جو زوال پذیر ہو سکتا ہے اور ہٹ (بدل بھی) بھی سکتا ہے مگر زبان زندہ رہتی ہے لہذا مذہب کی طرح زبان بھی کلچر نہیں، کلچر کا سرچشمہ ہے۔''(۱۰۴)

سید عبداللہ کے کلچر کی نظریہ میں زبان اور مذہب ہم مقام جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک جیسے اہم اور بنیادی عناصر تشکیل ہیں۔ سید عبداللہ نظریہ ثقافت میں کلچر کی ریڑھ کی ہڈی جہاں مذہب ہے وہیں زبان اس کلچر کا چہرہ ہے۔ اسکی شناخت اور اس کلچر کو اس خاص مٹی اور مقامیت کی خوبو اسی زبان کی رہین منت ہے۔

خاص طور پر پاکستانی کلچر کے تشکیلی عناصر کی جب بحث شروع ہوتی ہے تو اس میں بطور زبان ایک بڑے عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے برصغیر میں اسلامی عہد، اسلامی تشخص اور کلچر کی سب سے بڑی شاندار اور جاندار نشانی ہی زبان اردو ہی ہے۔ سید عبداللہ بھی اردو کو پاکستان کلچر کی کلیدی عنصر اور بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''پاکستان تعبیر و تعمیر اور کلچر کا مسئلہ ''میں نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ اردو زبان کی قدرو قیمت کا ذکر کرتے ہیں۔ ''اردو''کو پاکستانی کلچر کی پہچان تسلیم کرتے ہیں اور اس کے فروغ کو پاکستانی تشخص اور اسلامی شناخت کے پس منظر بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اردو ایک زبان ہی نہیں اسلامیان ہند کی شناخت بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آج کل بعض لوگ تحریک پاکستان میں لسانی مسئلے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ امر واقع ہے کہ اردو ہندی کی تنازع نے سب سے پہلے مسلمانوں کے دل میں شکوک پیدا کیے۔ مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ ملک میں ہندو اکثریت اس مشترک زبان کے سلسلے میں رواداری کا ثبوت نہیں دے سکتی۔۔۔۔۔اردو کا قصور صرف یہ تھا کہ اس کا رسم الخط فارسی اور اس کے کلچرل فضا مسلم نقوش کی حامل تھی۔ گاندھی نے یہاں تک کہ دیا کہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہے کیونکہ یہ قرآن کے حرفوں سے لکھی جاتی ہے۔''(۱۰۵)

یہی وہ ہندوانہ سوچ تھی جس نے اردو زبان کو دیس نکالا دینے کا اعلان کر دیا اور ہندوستان کو تقسیم کرایا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ناقابل فہم تھا کہ ہندو ایک دم سے ہماری زبان سے متنفر ہو گئے کیونکہ اردو زبان تو اہل ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی جس کا ثبوت اس زبان کا لینگوا فرینکا ہونا ہے۔ لینگوا فرینکا سے مراد بقول ابوالاعجاز حفیظ صدیقی:

> ''لینگوا فرینکا سے مراد وہ زبان ہے جو کسی وسیع و عریض اور کثیر الالسنہ علاقے میں مختلف بولیاں اور زبانیں بولنے والے لوگوں کے درمیان ذریعہ ابلاغ و اظہار کا کام دے سکے، جسے برصغیر پاک و ہند میں اردو ہے۔''(۱۰۶)

اردو جیسی لینگوا فرینکا کے ساتھ ہندوؤں کا یوں معاندانہ سلوک چہ معنی۔ الغرض اردو کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کر کے نشانہ ستم بنایا گیا تو مسلمان اکابرین نے اردو زبان کی سرپرستی اور تحفظ کا ذمہ اٹھالیا اور اس کی، مزید ترویج و ترقی کے

لیے کام شروع کر دیا اور بعد ازاں جب تحریک پاکستان شروع ہوتی ہے تو اردو اس تحریک کے منشور کا حصہ بھی بن گئی اور پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم نے اردو ہی کو پاکستان کی سرکاری و قومی زبان قرار دیا تو دشمنان اردو کے منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ اب اردو پاکستان کی ثقافت کا اہم تشکیل عنصر ہے کیونکہ ثقافت سے کسی بھی زبان کا عمل دخل خاص نمایاں ہو تا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''کلچر زبان میں ظاہر ہو تا ہے اس لیے زبان کلچر کی اہم ترین علامت ہے جیسا کلچر ہو گا ویسی ہی زبان ہو گی، جیسی زبان ہو گی ویسا ہی کلچر ہو گا۔ زندہ زبان معاشرتی تقاضوں سے وجود میں آتی ہے اور خیال و احساس کے ایک ایسے نظام کو جنم دیتی ہے جس کے ذریعے زبان کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں سے یکساں ہو جاتا ہے جس میں تعلیم یافتہ، ادنیٰ اور اعلیٰ چھوٹے اور بڑے سب یکساں طور پر اپنی اپنی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق شریک ہوتے ہیں۔''(۱۰۷)

پاکستانی ثقافت میں زبان اردو کا خاص حصہ ہے جو برصغیر میں اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کی دین (Product) ہے۔ ابھی بھی پاکستان کے چاروں صوبوں میں لینگوا فرینکا ہے۔ میڈیا، ادب اور شاعری کی زبان اردو ہے۔ اردو نے تحریک پاکستان سے لے کر عہد حاضر کے سوشل میڈیا کے انقلاب تک نہایت ذمہ داری سے اپنا منصب نبھایا اور جدت کے سبھی ریلوں کا سامنا بہادری سے کیا اور پاکستان کی ثقافت کا نمایاں عنصر بنی اور پاکستانیت کے متشخص کرنے کا سبب بنی۔

پاکستانی ثقافت اکیلی پاکستان میں مروج نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں سندھ، پنجاب، بلوچستان، خیبر پختونخوا، پوٹھوہاری، کشمیری، گوجری، چترالی، گلگتی اور بلتی زبانیں بھی ہیں اور مقامی ثقافتوں کے نام بھی ہیں۔ ان مقامی ثقافتوں اور پاکستانی ثقافت میں ایک جز بھی متحارب اور مخالف نہیں بلکہ یہ ساری ثقافتیں پاکستان کی ثقافت کے مختلف رنگ اور روپ ہیں بلکہ پاکستانی کی قومی ثقافت کے اس حوالے کا نام ہیں جو اس کو اس سرزمین کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس لیے یہ بات مسلمہ ہے کہ زبان خود اس قدر طاقت ور ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک پوری ثقافت کو جنم دے سکتی ہے۔ اس لیے جس طرح پاکستان کے ثقافتی عناصر میں اردو زبان کی اہمیت مسلم الثبوت ہے بالکل اسی طرح مقامی اور علاقائی زبانیں اپنی اپنی ثقافتوں کے لیے الگ تشخص کا باعث ہیں۔

پاکستانی ثقافت میں زبان اردو کی اہمیت کی وجہ اس کا ادبی ذخیرہ بھی ہے جس میں شعر و نثر، تاریخ، فلسفہ، فقہ، حدیث، تفاسیر، مغازی اور سیرت النبیؐ، علم فتاویٰ، عمرانیات، اسلامیات اور سائنسی علوم کا خاصا وقیع و وسیع ذخیرہ ہے۔ اسلام کی

بہترین تفسیر، تفہیم اور تشریح کا کام بھی علما اور مشائخ نے اس زبان میں کیا ہوا ہے۔ تہذیب و تاریخ اور دیگر معاشرتی علوم کے باب میں بھی اردو زبان کا ادب کسی اور زبان کے ادب سے کسی طور کم تر نہیں۔ پس یہ بات مسلمہ ہے کہ اردو زبان اور اردو ادب بر صغیر کے مسلمانوں کی شناخت کا مستند حوالہ ہے اور پاکستان ثقافت اور معاشرتی عوامل پر اثر انداز ہونے والا ایک موثر عنصر بھی ہے۔

آداب معاشرت

پاکستانی ثقافت کا ایک تشکیلی عنصر آداب معاشرت بھی ہے جن سے مراد ایک فرد کا کسی معاشرے میں رہنا سہنا، اوڑھنا بچھونا، کھانا پینا، غمی خوشی میں شرکت رسم رواج عادات، اطوار کا اظہار کہلاتا ہے دوسرے لفظوں میں مدنیت کی اصطلاح بھی بولی جا سکتی ہے۔حضارت کہیں یا مدنیت یا آداب معاشرت یہ کسی بھی معاشرے کی ذہنی ، جذباتی ، فکری اپج اور خصائص کے عکاس ہوتے ہیں۔ معاشرہ کا مزاج ٹھنڈا ہو یا گرم، ظاہری ہے کہ روحانی، غصیل ہے کہ مہر محبت والا، یہ فرق ہر معاشرہ کے ساتھ مختلف ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اس معاشرے کا اخلاقی نظام بھی آداب معاشرت یا طرز زندگی کی نمائش میں ایک خاص کردار ادا کرتا ہے اس طرح بعض معاشرے میں اخلاقی قدریں ان کی اخلاقی حسن کا پتا دیتی ہیں کیونکہ انسانی عادات ہی اخلاق میں تبدیل ہوتی ہیں۔ اس ضمن عارفہ فرید لکھتی ہیں:

> ”کلچر کے حوالے سے معاشرتی آداب جن کو لباس کی حیثیت حاصل ہے کسی قوم کے کردار کی ایک جھلک ہیں اور قوم کے مزاج کے ترجمان بھی ہیں۔“(۱۰۸)

عارفہ فرید پاکستانیوں کی ثقافت کے اس عنصر میں مہمانوازی، خلوت وجلوت کے آداب، بزرگوں کا ادب و احترام، حیا داری، مروت، لحاظ شامل کرتی ہیں آداب معاشرت کے باب ہیں سید عبد اللہ کا خیال یا نظریہ قدرِ وسیع ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ پاکستانی کلچر میں طرز زندگی میں پردہ، مرد وعورت کا کم سے کم اختلاط، مسجد کی مرکزیت، گھر ایک مکمل اکائی، مشترکہ گھر کی روایت(Joined Family)بزرگوں کا احترام، زکوۃ اور صدقہ ، ملبوسات شامل ہیں۔

آداب معاشرت میں ایک عام آدمی کی زندگی کے تمام پہلو شامل ہیں، اس طرح پاکستان کے پانچ صوبوں کی علاقائی ثقافتوں کے رنگ بھی سطح پر آجاتے ہیں جیسے پنجاب کی طرز زندگی میں شہری اور دہ کا فرق خاصا واضح ہے۔ اس کے علاوہ زرعی علاقے ہونے کے سبب ان کے کھانے اور پینے میں فرق ضروری ہے۔ گاؤں والے کرتا اور لنگوٹ تو شہر میں شلوار قمیض،

شادی بیاہ کی تقریب بھی مختلف ہیں۔ اس طرح بلوچستان کے علاقوں میں بلوچ رنگ ثقافت، سندھ سندھی تہذیب اور خیبر پختونخوا میں پٹھان اور ہندکو کلچر کے رنگ نمایاں ہیں۔ علاقائی و جغرافیائی حالات اور ضروریات کا فرق ہر جگہ بڑا نمایاں ہے۔ مکانات کی تعمیر، وسائلِ روزگار، خوراکیں، تقریبات میں فرق ایک ندرت اور نرالے پن کو معرض وجود میں لاتا ہے، یاد رہے کہ ان چاروں صوبوں کا مجموعی رنگ ثقافت وہی اسلامی ہے جو قدر مشترک بھی اور طرز زندگی میں بدعات اور غیر اسلامی اقتدار کا قاطع بھی ہے۔(۱۰۹)

فنون لطیفہ

فنون لطیفہ کو بھی ہر ثقافت میں اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ یہ کسی بھی قوم کے فلسفہ زیست کی عملی یا ظاہری صورت مانی جاتی ہے۔ فنون لطیفہ کے لیے انگریزی میں (Fine Arts) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ابولا اعجاز حفیظ فنون لطیفہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "ادب، موسیقی، مصوری (نقاشی)، رقص، سنگ تراشی اور فن تعمیر کو فنون لطیفہ یا ہنرہائے زیبا کہا جاتا ہے نیز فنون لطیفہ فنون مفیدہ کو ممیز کرنے کے لیے اصول یہ ہے کہ اگر کسی فن کا مقصد تخلیق جس کے ذریعے فرحت و مسرت مہیا کرنا ہو تو ایسا فن، فنون لطیفہ میں شمار کیا جائے گا اور اگر فن کا مقصد کسی مادی ضرورت کی فراہمی ہے تو ایسا فن فنون مفیدہ میں شمار ہو گا۔"(۱۱۰)

بالفاظ دیگر میں فنون لطیفہ وہ فنون جو انسانی حو اس کو حظ اور لطف دیں گو ان کہ حسن اور حسن کاری کا تعلق براہ راست افادیت سے ہو یا نہ ہو انسان کے احساس جمال اس کو تحسین حسن و جمال کا ذوق و شوق بخشا اور اس نے ہر فن میں خوش سلیقگی، ندرت اور جدت کے لیے خود کو کوشاں رکھا۔ اسلام نے بھی انسان کو خوبصورتی اور حسن کے ہر زاویہ کی پہچان اور تحسین کا حق دیا ہے۔ اسلام نے موسیقی، ناچ، تصویر بنانے، بت تراشی کی مخالفت ضرور کی ہے مگر مسلمانوں کی حس جمال کو آزاد چھوڑا ہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "اسلام نے عیش پسند، لہو لعب، فحش اور سوقیانہ حرکات کو ضرور منع کیا ہے لیکن احساس جمال کی لطافتوں اور نزاکتوں پر پہرے نہیں بٹھائے ہیں احساس جمال کی لطافتوں میں اتنی نزاکت اور اتنا اثر ہے کہ اسلام جیسا عالمگیر مذہب اس کو منع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ اسلام نے بت تراشی

اور تصویر کشی کی ممانعت کی ہے۔۔۔۔۔ آج موسیقی، خطاطی وغیرہ بھی ہمارے مذہب کا اتنا ہی ناگزیر جزو ہیں جتنا محراب، منبر اور مینار ہمارے کلچر کا جزو ہیں۔ اسلام نے احساس جمال اور ذوق انسانی کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ نے حدیث مبار کہ ہے: "ان اللہ جمیل ویحب الجمال۔ ترجمہ: اللہ حسین ہے اور حسن کو پسند فرماتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے بت تراشی اور مصوری کے بجائے دیگر فنون کی طرف توجہ دی۔ جن میں محلات، قلعہ جات و باغات کی فن تعمیر میں بے مثال کام ہوئے۔ مصوری شروع کے اسلام مین بالکل ممنوع تھی لیکن بعد میں مصوری میں کام ہوا لیکن ایک نیا فن "فن خطاطی" کے طور پر سامنے آیا۔ اس طرح موسیقی کے باب میں اسلامی کی تعلیمات میں ممانعت ملتی ہے لیکن موسیقی تمام اسلامی ثقافتوں میں موجود رہی ہے ہندوستان میں تو موسیقی ہندو کے مذہبی عبادات کا جزو لانیفک ہے لہذا مسلمانوں نے بھی اس باب خاصا کام کیا بلکہ ایک نہیں کئی سر اور ٹھمریاں ایجاد کیں اور قوالی تو خالصتاً اسلامی کلچر کا حصہ ہے۔"(۱۱۱)

جہاں تک پاکستانی ثقافت میں فن تعمیر کا تعلق ہے تو اسلامی ورثہ کی تعمیراتی کام پاکستانی ثقافت کا عنصر خاص ہیں عرب، ترک اور افغان و ایران کے تعمیرات ڈیزائن اور ان میں ہندی اثرات سے مغلوں کے فن تعمیر نے خاص استفادہ کیا ہے۔(۱۱۲) سارے ہندوستان میں بھی فن تعمیر میں مغل داد خواہ ہے۔ لال قلعہ، دلی ہو یا شاہی مسجد اور شاہی قلعہ لاہور، شالیمار باغ ہو مغلوں نے اسلامی کلچر کی خصوصیات کے حوالے سے ان تعمیرات میں اپنے عہد کی جدت اور کشادگی کو پیش نظر رکھا ہے اسی طرح پاکستان بننے کے بعد بھی فن تعمیر میں اسلامی رنگ اور پاکستانی طور کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اقبال پارک لاہور میں "مینار پاکستان" کو لیجے یا اسلام آباد میں "شاہ فیصل مسجد" اور کراچی میں قائد اعظم کے مقبرہ کو دیکھیے یہ چند نمائندہ تعمیرات ہیں۔ فن تعمیر کے باب میں سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی فنی سرگرمیوں کو غائر نظر ڈالنے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا عمل زیادہ تر مساجد، مقابر اور کتاب کے گرد گھومتا ہے۔ ان سے کچھ ہے تو وہ مقصدی (Functional) ہے یعنی محلات مع باغات اور قلعے ہیں۔"(۱۱۳)

اس بات میں کلام نہیں کہ مسلمانوں نے اپنی شعبوں میں تعمیرات کو خاص اہمیت دی تاج محل، جہانگیر کا مقبرہ، ہرن مینار، قطب مینار، بھی اس لڑی کی کڑیاں ہیں۔، مساجد میں بادشاہ مسجد، شاہی قلعہ، قلعہ روہتاس، مسجد وزیر خان، مسجد محبت خان، اسلامیہ کالج کی عمارت بھی مشرقی اور مغرب طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔

موسیقی میں بھی ہندی مسلمانوں کا حصہ بہر حال ہے۔ کچھ مسلم خاندانوں نے موسیقی کو بطور پیشہ اپنایا ہے مگر موسیقی سے وابستہ لوگوں کو معاشرہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہندو ہمسائیگی کے اثرات نے موسیقی کو معاشرے میں مقبول بنایا ہے قوالی بھی اس مقبولیت کا ایک نتیجہ ہے۔(۱۱۴) صوفیائے کرام نے "سماع" یعنی موسیقی کو مباح قرار دیا ہے کچھ اولیائے کرام نے اس کی ممانعت بھی کی ہے مگر موسیقی کی حرمت و حلت کے باوجود موسیقی سنی جاتی ہے اوراس کا چلن ہمارے ہاں موجود ہے۔ شادی بیاہ ہوں یا میلے ٹھیلے ہوں موسیقی ان سب تہواروں کا لازمی جزو تصور کی جاتی ہے۔ اس لیے عارفہ فرید کا یہ تبصرہ بر محل معلوم ہوتا ہے:

> "پاکستان میں ہر خاص و عام اپنے اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق یہ غذا، روح کی غذا حاصل کر رہا ہے۔ موسیقی سے لطف اندوز ہونے پر پاکستان میں کو خاص پابندی نہیں البتہ مذہبی فرقہ عام طور پر اس کا مخالف ہے۔۔۔۔۔۔ موسیقاروں (مرد و عورت) کو معاشرہ میں باعزت مقام حاصل نہیں ہے۔"(۱۱۵)

موسیقی بھی ایک پاکستانی ثقافت کا ایک تشکیلی عنصر ہے بلکہ اب مغرب پسند طبقہ اور نئی نسل میں موسیقی کے بارے میں خاصا نرم گوشہ رکھتی ہے اور اب تو اشراف کے گھرانوں کے بچے اور بچیاں بھی اس شعبے میں داخل ہو رہے ہیں لیکن عام آدمی اس موسیقی کو نہیں پسند کرتا اور اور مذہبی رجحان رکھنے والے مکاتب فکر بھی اس رجحان کو مذموم قرار دے رہے ہیں۔

پاکستانی ثقافت میں خطاطی کا فن بھی حاصل مقبول ہے اور خطاطی ایک خالص اسلامی علم اور فن تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں اموی عہد خلافت سے ہی مسلمان خطاط نے اپنے فن کا لوہا منوا لیا تھا۔ خطاطی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز راہی لکھتے ہیں:

> "عربوں کی ایجاد فن خطاطی ایران پہنچی تو ایرانیوں نے اس فن کو نہ صرف از سر تو ترتیب دیا۔ عربی کے مروجہ خطوں میں اجتہاد کیے بلکہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے لیے خط بھی ایجاد کیے۔۔۔ ۔۔۔۔ اردو رسم الخط اور خطاطی اردو زبان کے ساتھ ہی وارد ہوئی جس طرح زبان کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں اسی طرح فن خطاطی کی عمر زیادہ نہیں۔"(۱۱۶)

خطاطی کا فن خالصتاً مسلمانوں کا ہے۔ اسلامی تہذیب میں نے اس فن کو خوب ساز گار ماحول فراہم ہوا اور حکمران طبقہ نے اس فن کی ترقی کے لیے فنکاروں کی سرپرستی کی۔ اور یہ کام اب بھی جاری ہے اور اس فن میں جدت اور ندرت بھی آرہی ہے۔ سید عبد اللہ پاکستانی ثقافت میں خطاطی کو خاصی اہمیت دیتے ہیں اور اس فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے فنون میں تعمیر کے علاوہ خطاطی کو بڑا قبول حاصل ہوا۔ مسلمانوں کے فنون لطیفہ میں خطاطی ایک بڑا فن ہے اور محض مغربی ذوق سے ہٹ کر دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ یہ ایک جمالیاتی معجزہ ہے۔''(۱۱۷)

اس جمالیاتی معجزہ کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ فن خطاطی مسلمانوں کے دیگر فنون سے ہٹ کر ایک فن ہے جہاں مسلمانوں نے اقلیدس کے اصولوں اور مصوری کے قواعد سے اس فن کو ترقی دی۔ آیات قرآنی، اقوال رسولؐ کے علاوہ اشعار وغیرہ بھی اس فن میں کاغذ چمڑے اور پتھروں پر لکھے جاتے ہیں اس لکھائی کا حسن اور خوبصورتی ہی اس فن کی معراج ہے۔ عباس عالم اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''فن خطاطی ایک نہایت لطیف نازک اور پاکیزہ فن ہے جس کی رفعت و عظمت کالوہا ہر دور میں مانا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستانی معزز خطاط صاحبان ذاتی طور پر فن خطاطی کے فروغ اور اس کے تحفظ کے لیے قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں کیونکہ یہ فن ہماری ثقافت و کلچر کا امین فن ہے۔''(۱۱۸)

سید عبد اللہ بھی خطاطی کو پاکستانی ثقافت اور کلچر کا ایک خاص تشکیلی عنصر کے طور پر لیتے ہیں اور اس کو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی پہچان اور مستند حوالہ قرار دیتے ہیں۔ خطاطی کے فن پاروں کی سرکار اور غیر سرکاری ادارے، دونوں نمائش کرتے ہیں جہاں اس فن کے ماہر اپنے فن پاروں کے حوالے داد وصول کرتے ہیں۔

اردو شاعری یا ادب پاکستانی ثقافت کلچر کا امین ہے گو کہ اردو ادب کی تاریخ متحدہ ہندوستان سے شروع ہوتی ہے لیکن اسلامی پس منظر کی بنیاد پر اردو ادب و شعر بھی مسلمانوں ہی کی میراث ہے کیونکہ ہندوؤں نے اردو زبان کو ہی نہیں اپنا یا یعنی انھوں نے اردو ادب کو بھی رد کیا اور غیر ہی جانا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جس اردو ادب نے تشکیل پائی ہے اس کی روایت و سرچشمہ یہی اردو ادب ہے جو برصغیر میں تخلیق کیا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد اس ادب نے ایک نئی کروٹ لی اور پاکستانی ادب کے نام سے ترقی اور فروغ حاصل کیا۔ پاکستانی ادب پر رائے دیتے ہوئے عارفہ فرید لکھتی ہیں:

''خوش قسمتی ہے پاکستان میں ادب میں نمایاں ترقی ہوئی ہے اور ایک عام پاکستانی افسانہ، ناول اور شعری ادب کے خلاف کسی رد عمل کا اظہار نہیں کرتا نہ ہی حکومت کی طرف سے کوئی ایسی پابندی ہے۔''(۱۱۹)

پاکستانی کلچر کو ادب نے فروغ دیا ہے۔ ادب میں پاکستانیت کے عنصر نے جب پاکستانیت کو کسی حد تک اشاعت دی مگر اپنی اس حوالے سے بہت سا کام کرنا باقی ہے، ابھی پاکستانی اردو ادب کی حقیق ترویج ہونا باقی ہے، حب الوطنی کے جذبات ہی ابھارے جانا باقی ہیں۔ امت سازی کے لیے بھی اردو شعرا اور نثر نگاروں خوب نے کام کرنا ہو گا۔ سید عبد اللہ اس ادب کے خواہاں ہیں جو بقول ان کے:

''ادب میں پاکستانیت ہو۔۔۔۔ پاکستانیت کی علاقائی مزاج کا نام نہیں اس سے مراد ایک مجموعی مسلم مزاج ہے جو اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کل مسلمانان ہند نے بین الاقوامی اسلامیات کے تحت ڈھالا جس میں پوری ہند اسلامی تہذیب آجاتی ہے، پاکستانیت کے سیدھے سادے معنی یہ ہے کہ ادب میں وہ قومی روح منعکس کی جائے جو نظریہ پاکستان میں موجود ہے۔''(۱۲۰)

وہ ادب جو ملی، قومی اور پاکستانی جذبات واحسات کا حامل ہو گا اور انہی جذبات واحساسات کو تحریک بھی دے گا اور وہی پاکستانی ثقافت اور کلچر کے فروغ کا ضامن بھی ہو گا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم پاکستان ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے علاوہ بھی پاکستانی ادیب وشاعر پاکستان اور اس کے شناخت کے استحکام کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

ہندی اثرات

پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں جہاں اسلامی اقدار اور عرب وایرانی کلچر کی حسین ومقبول آمیزش تو ہے اس کے ساتھ ہندوستانی سرزمین کی اقدار اور رواج بھی اس ثقافت کا خاصہ ہیں۔ ثقافتی اقدار کی تشکیل کسی منصوبہ بندی، خواہش اور منشا کی رہین منت نہیں ہوتیں یہ تو اپنے ماحول اور علاقے کی ضرورت وصورت کے حوالے سے جنم لیتی ہیں اور تشخص کا حوالہ بن جاتی ہیں۔ اس باب میں پاکستانی ثقافت کے نمایاں تشکیلی عناصر مذکور آئے ہیں لیکن ثقافت کے ہمہ رنگ اور ہمہ گیریت کا کامل احاطہ ممکن نہیں ہو سکا ہو گا۔ اس حوالہ سے یہ امر خاص قابل لحاظ ہے کہ پاکستانی ثقافت کا مجموعی رنگ عربی وایرانی نہیں اس کا رنگ ڈھنگ خالصتاً برصغیر کی آب وفضا سے ہم آہنگ ہے۔ اسلامی رنگ نمایاں ہے

لیکن کلیتاً اسلامی رنگ نہیں ہے۔یوں کہنا قرین مصلحت ہے کہ اس ثقافت کا رنگ پاکستانی ہے۔یہی فیض احمد فیض بھی کہتے ہیں:

> ”اگر آپ پاکستانیت پر زور دیں یعنی خطۂ زمین کی تاریخ پر زور تو پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان سے مل جاتی ہیں اور اس صورت میں آپ کی تہذیب میں اسلام کا عنصر دب جاتا ہے اگر اسلامیت کو واحد بنیاد قرار دیں تو پاکستانیت کا عنصر جاتا ہے۔“(۱۲۱)

فیض احمد فیض کی رائے صائب ہے پاکستانی کلچر کی اساس اگر سرزمین ہند کو قرار دیا جائے تو پھر مسلمانوں کو اپنی ثقافت اور قومیت کے ڈانڈوں کو قدیم ہندوستان سے جوڑنا پڑے گا اور موئنجو داڑو، ہڑپہ اور گندھارا یا اباسین تہذیب کے سرچشموں سے فیض حاصل کرنا ہو گا اور دو قومی نظریہ بے جان پڑ جائے گا۔ بندے ماترم کی شاعری اور رگ وید ہمارے حوالے بن جائیں گے۔ یہ ایک غیر منصفانہ اقدام ہو گا کہ اپنی تاریخ اور اپنے تشخص کو بگاڑ لیا جائے البتہ یہ بھی صریح ناانصافی ہو گی کہ ہم اسلامی تہذیب و ثقافت کو ہندی اثرات سے مبرا قرار دیں اور جغرافیائی حقائق کو پس پشت ڈال لیں اس ساری بحث کا فیصلہ سید عبداللہ کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”پاکستانی (ثقافت) زندگی کے تین اجزائے ترکیبی ہیں اول اسلام کے آداب معاشرت جو مسلمانوں کے پرسنل لا، اعتقادات اور قرآن اخلاق اور سنت نبویؐ سے پیدا ہوئے دوم مقامی طریقے جو کچھ تورانیوں، مغلوں اور ایرانیوں کے طرز زندگی سے بچ بچا کر ہم تک پہنچتے ہیں سوم مغربی ثقافت کے اثرات ہمارا کلچر انہی عناصر کا ملغوبہ ہے۔“(۱۲۲)

یہاں سید عبداللہ ہندوستانی اثرات کا ذکر نہیں کر رہے۔ مغربی ثقافت کے اثرات تو ۱۸۵۷ء قبل بالکل نہیں تھے۔اب ضرور ہیں لیکن ہندومت اور اس ثقافت کے اثرات کو درخو اعتنانہ جاننا پاکستانی ثقافت کی ایک شناختی پہلو کو چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ ہزار سالہ میل کے ایک شناختی پہلو کو چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ ہزار سالہ میل ملاپ نے ایک دوسرے کی اقدار و روایات اور رسم و رواج پر مثبت وبد اثرات مرتب کیے ہیں۔”ہندی مسلم“کی اصطلاح معروف و مقبول ہے۔ہندوؤں کے اثرات سے انکار قطعاً ممکن نہیں۔یہ اثرات پاکستانی ثقافت پر دیکھے بھی جاسکتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام انہی ہندوانہ اثرات پر بات کرتے ہوتے کہتے ہیں:

> ”معاشرتی رسموں کے اعتبار سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اب بھوت پریت کے ڈر دوسرے وہموں سے زندگی کا سکون

تلف ہو رہا ہے۔ ہندوؤں میں نکاح بیوگان پاپ سمجھا جاتا ہے مسلمانوں میں بھی نکاح ثانی برا سمجھا جانے لگا ہے۔ بیاہ شادی اور تجہیز و تکفین کے متعلق اسلام احکام نہایت سادہ، معقول اور دینی و دنیا بھلائی پر مبنی تھے لیکن مقامی اثرات (ہندوانہ اثرات) سے ان کی جگہ ایسی خلاف شرع رسموں نے لے لی ہے جن میں فضول خرچی، تضیع اوقات اور دوسری بیسیوں قباحتیں تھیں اور ہیں۔"(۱۲۳)

بالکل درست ہے اور اس طرح کی چند قباحتوں کو ضرور ہندی اہل اسلام نے قبول کیا۔ ذات پات میں بٹے ہوئے ہندوؤں کے ساتھ معاشرت ہونے کہ وجہ سے اہل اسلام کی نسبی و حسبی عصبیت بھی تناور درخت بن چکی ہے۔ جہیز کا چلن بھی ہندی کلچر کی دین ہے مگر پاکستانی ثقافت کا ڈھانچہ چونکہ مضبوط اسلامی اقدار رکھتا ہے لہذا متاثر تو ضرور ہوا مگر مسخ نہیں ہوا۔ اسی طرح مسلمانوں نے ہندو مہاجن کے سود کے نظام کو یکسر رد کر دیا ہے۔ مقامی ثقافتوں پر بھی ہندوؤں کے اثرات زیادہ ہیں۔ جن میں ناچ اور گانا گانے کا عنصر نمایاں ہیں۔ مسلمانوں نے موسیقی کو مسلمان کرتے ہوئے قوالی اور کافی کا نام دے دیا۔ اس ساری بحث کا مطلب و مقصد یہ ہرگز نہیں کہ پاکستانی ثقافت کا رنگ اور مزاج ہی ہندوانہ ہے ہاں البتہ ہندی اثرات کلچر، زبان اور رسوم و روایتوں پر ضرور موجود ہیں ہزار سال اکھٹے رہنے سے ایسا ہو جانا کوئی قابل طعن امر بھی نہیں۔ یہاں سید عبد اللہ کا ایک محاکماتی اقتباس دیکھیے:

"پاکستان کا موجودہ علاقائی کلچر (دیہاتوں میں پایا جانے والا) مسلم کلچر سے الگ کوئی چیز نہیں۔ فرق صرف کل اور جز کا نہیں بلکہ ماہیت کا بھی ہے۔ موجودہ علاقائی کلچر اپنی آخری شکل میں مسلمانوں کے تمدنی تجربے سے گزر کر اور اخذ وانتخاب کے عمل کے معیار پر اتر کر اپنی شکل اور ماہیت دونوں کے اعتبار سے مسلم کلچر ہو چکے ہیں علاقوں میں تھوڑے تھوڑے طبعی احوال اور بعض ضمنی عوامل کی وجہ سے فرق ہیں ورنہ پاکستان کے سب علاقائی کلچر مسلم تمدن کے مظاہر ہیں۔"(۱۲۴)

سید عبد اللہ کی بات سو فیصد درست ہے کہ ہمارے صوبوں میں مثلاً بلوچ کلچر، پٹھان کلچر، پنجاب کلچر، سندھ کلچر، گلگت و بلتستان و کشمیر و چترال کلچر میں علاقائی آب و ہوا، کھانے پینے کے حوالے سے رسم و رواج شادی بیاہ اور فوتگی کی رسومات و معاملات میں فرق ضرور ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ تمام علاقوں کا مجموعی کلچر رنگ ڈھنگ میں اسلامی اور پاکستانی ثقافت کا ہے۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے اسی اسلامی ثقافتی رنگ کے متعلق فیصلہ کن بات کی جو پاکستانی ثقافت کے خدوخال کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلامی ثقافت پر ہمیشہ ہی سے دینی اثر قائم رہا ہے اور یہ دینی رنگ ہی اس کی روح رواں ہے اگر دین پس پردہ رکھا جائے پھر یہ ثقافت کچھ اور ہو سکتی ہے لیکن اسلامی نہیں ہو سکتی اس میں ہر چیز کا جواز اور سند مذہب ہی سے حاصل ہوتی ہے جو ہدایات و احکامات الہیہ کا مجموعہ ہے جس سے زندگی کے مختلف ادوار میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے جس کی مکمل تصویر نبی امیؐ نے اپنی زندگی میں لوگوں کے سامنے پیش کی۔'' (۱۲۵)

اس اقتباس سے بھلا کسے اختلاف ہو سکتا ہے اسلامی ثقافت، اسلامی ثقافت بنتی ہی تب ہے جب اس پر دینی اثرات مرتب ہوں ورنہ وہ سب کچھ ہو سکتی ہے اسلامی ثقافت نہیں ہو سکتی نیز دین اسلام کا سب سے نمایاں کارنامہ ہی یہی ہے کہ وہ ہر اس شے جس کو کہ جس کا تعلق زندگی اور انسان سے ہو اس کو اسلامیا لیتا ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے یوں کہا جائے کہ پاکستانی ثقافت ایک معتدل اور متوازن مرکب ہے جس میں اسلامی عقائد و نظریات، ایرانی و ہند آریائی اقدار حسنہ اور مغرب کے ثقافتی اثرات (جو اسلام سے متصادم و متحارب نہیں) کا تو غلط نہ ہو گا۔ اسلام کے خمیر میں نرمی کی سہولت اور لچک موجود ہے جس کی وجہ سے اسلام جہاں گیا اس نے جغرافیائی ماحول اور پہلے سے موجود ثقافت اور تمدن کو خندہ پیشانی سے قبول کیا لیکن ردو قبول کا یہ عمل کبھی بھی مسلمانوں کی منشا اور مرضی پر منحصر نہیں رہا بلکہ اس کی کسوٹی بھی خود اسلام اور اس کی تعلیمات رہی ہیں۔ ہر وہ ریت، رواج اور ہر رسم و قدر جو اسلامی مزاج اور تعلیمات کے متضاد ہے وہ رد ہوتی رہی، وہ اپنی نوع میں کتنی اہم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اسلامی ثقافت جس کو ۱۹۴۷ء میں پاکستانی ثقافت کا نام ملا دراصل ہندی مسلم ثقافت تھی جس میں ہندو کی بت پرستی، مشرکانہ رواجوں اور سود وغیرہ کی بالکل جگہ نہیں تھی البتہ موسیقی کے کچھ نرم گوشے نکل آئے کیونکہ بقول وحید عشرت:

> ''اسلام کی تہذیب اور ثقافت جامد نہیں اور نہ ہی وہ بند کمرے کی طرح ہے ہر خطہ اور ہر عہد اور ہر سماج کے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصول کی فلاسفی پر ثقافت اپنے ڈھانچہ کی تعمیر طور کرے گی اور وہ اس سماج کے تخلیق عناصر کو سمجھتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کو محسوس نہیں کرے گی۔'' (۱۲۶)

اسی طرح اسلامی ثقافت کے رنگا رنگی مختلف ممالک میں نشوونما پانے والی ثقافتوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے مثلاً افریقہ و مصر، سوڈان اور لیبیا، ایران و ترکی اور روسی آزاد ریاستوں کے علاوہ ملائشیا اور انڈونیشیا وغیرہ ہیں۔ اسلامی ثقافتیں ہونے کے باوجود الگ اور جدا ثقافتی اقدار رکھتی ہیں یہ اختلاف ان میں ندرت اور تنوع کا ضامن ہے۔ فیض احمد فیض اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"اسلام چونکہ عالم گیر مذہب ہے اس لیے مسلمان قوم کا کلچر اسلامی کلچر ہے۔ ہر مسلمان قوم کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر اسلامی ملک کی ایک قومی تہذیب بھی ہے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے مثلاً ایران ایک مسلمان ملک ہے اس لیے ایرانی تہذیب اسلامی بھی ہے اور ایران بھی انڈونیشیا کی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہے اور انڈونیشائی بھی اسی طریقے سے پاکستانی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہوگی۔"(۱۲۷)

یہاں اب بحث ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخلی ہوگئی ہے کہ پاکستانی ثقافت سے تشکیلی عناصر میں ہندی عناصر بھی شامل ہیں اور یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہند مسلمان مقامی حالات، اقدار، اطوار اور تقاضاپائے زندگی سے نابلد کیونکر رہ سکتے تھے لہذا مسلمانوں نے مقامی اثرات کو قبول کیا اور بقول وحید عشرت:

"اسلام انسانی زندگی کی تدوین نہایت احسن طور سے کرتا ہے اور اسلام ایک ایسا رویہ پیدا کرتا ہے جو کہ زندگی کے ہر پیچ اور پر خم راستوں میں ایک اعتدال پسندانہ محفوظ اور مامون راستہ ہمیں بتاتا ہے۔۔۔۔۔۔ مثلاً ہم خوردونوش کا مسئلہ لیتے ہیں اسلام خوردونوش میں حرام و حلال کی حدود بتاتا ہے اور اس بات سے بحث نہیں کرتا کہ کس کس چیز کو پھر کس کس انداز سے کھانا ہے۔ اسلام لباس کے بارے میں پاکیزگی اور ستر پوشی کی پابندی عائد کرتا ہے اس سے بحث نہیں کرتا کہ کون سا کپڑا پہنتے ہیں اور کس وضع قطع کا سلواتے ہیں۔"(۱۲۸)

پس مسلمانوں نے مقامی اثرات کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا اور اپنے دین کے مزاج اور تعلیمات سے ہم آہنگ کسی بھی شے کو رد نہیں کیا اور ہندوستان میں بھی یہی طرز عمل رہا اور یوں پاکستانی ثقافت متشکل ہوئی۔ اس بات میں ڈاکٹر جمیل جالبی کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"ہم پاکستان کے سب باشندے اس "ہند علم ثقافت" کے وارث اور جان نشین ہیں جو اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت میں کی فضا، مزاج، آب و ہوا اور میل جول کے زیر اثر پروان چڑھی ہے جس میں عربوں کا مذہبی جوش اور آدرش بھی شامل ہے اور افغانوں، ایرانیوں، ترکمانیوں اور مغلوں کا مزاج اور روح بھی نہ صرف یہ بلکہ جس کی روح نے برصغیر پاک و ہند کی روح کو اپنے مزاج میں سمو کر تہذیب کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا تھا جو کم و بیش آج برصغیر کی زندہ تہذیب ہے۔"(۱۲۹)

غرض پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر میں اسلامی عقائد، دیگر اسلامی ثقافتوں کی اقدار جیسے ایرانی اور ترکمانوں اور عربوں کی اقدار اور مقامی اثرات کے ساتھ ساتھ انگریزی ثقافت کے اثرات بھی شامل ہیں۔ انگریزی ثقافت کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں نے قبول کرنا شروع کیے ہے جس کے حامی سر سید احمد خان تھے کہ جنھوں نے انگریز سے مفاہمت کی پالیسی پر عمل پیرائی شروع کی۔(۱۲۹) انگریزی ثقافت کی نفوذ پذیری خاصی تیز رفتار تھی اور سر سید احمد خان کے بر خلاف مسلمان قوم میں اس تہذیب و ثقافت کی مخالفت بھی خوب رہی لیکن اس کے اثرات کو بآسانی پاکستانی ثقافت پر دیکھا جا سکتا ہے، لباس، فرنیچر، طرز معاشرت اور رہن سہن میں اس مغربی تہذیب کے اثرات نے خاصا اثر دکھایا ہے لیکن پاکستانی ثقافت نے اس سے بھی وہ کچھ لیا جو اسلام کی کسوٹی سے متخارب نہ تھا جیسے شراب نوشی، برہنگی، بال پارٹیاں اور کلب کی سرگرمیوں کو یکسر رد کیا گیا اور اگر کسی طبقہ نے ان چیزوں کو اپنایا بھی تو ان کو نفرت اور حقارت کے رویہ کا سامنا کرنا پڑا۔(۱۳۰)

المختصر پاکستانی ثقافت میں یہ سارے تشکیلی عناصر ان کی پاکیزگی، طہارت، حسن و لطافت کو بڑھاتے ہیں اور مقامی ثقافتیں اس بڑی ثقافت کو مزید خوش رنگ بناتی ہیں گو کہ پاکستانی ثقافت کی عمر باقی تمام ثقافتوں سے کم ہے لیکن اس کا روغن اور جمال اور صورت سب سے بڑھ کر ہے۔ سید عبداللہ اس ثقافت کے فروغ اور ترویج کے خواہاں ہیں اور اس میں جو کمیاں اور کجیاں ہیں وہ ان کی اصلاح کے خواہاں بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی ثقافت کا منبع اور سرچشمہ اسلامی تہذیب و ثقافت ہے اور اس اس اسلامی ثقافت کا معیار قرآن و سنت اور نبی پاکؐ کے عہد میں جنم لینی والی مدنی ثقافت ہے۔(۱۳۱) سید عبداللہ کے ہاں پائے جانے والے عناصر کے تعین اور شناخت سے پاکستان کی ثقافت کے خصائص کو ظاہر کرتے ہیں۔ پاکستانی ثقافت کی اقدار اور رسوم اس مملکت اور سرزمین کی شناخت ہیں۔ اہل پاکستان کو اس باب میں سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ نشر و اشاعت میں انفرادی اور اجتماعی طور پر حصہ لینا ہو گا تا کہ وطن عزیز کا قد کاٹھ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے۔

قومی زبان اردو: اہمیت و ضرورت

سید عبداللہ کا سب سے مستند اور نمایاں حوالہ ان کا محب اردو ہونا ہے۔ اردو سے ان کی محبت لفظوں اور تحریروں تک محدود نہیں تھی بلکہ انہوں نے اردو زبان سے عملی محبت کی۔ ساری عمر اردو زبان اور اس کی تدریس سے وابستہ رہے۔ یوں

تو اردو پڑھانے والوں کی پاکستان میں کبھی کمی نہیں رہی۔ عہد حاضر میں ان کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ سید عبد اللہ اردو پڑھانے والے استاد تھے لیکن ایسے استاد جو اپنے طلبہ کے اندر ادبی ذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔ جو اپنے طلبہ کو اعلیٰ اور کلاسیکی مذاق سے آشنا کرتے ہیں۔ سید عبد اللہ کی اردو سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بشیر احمد سوز لکھتے ہیں:

> ''اردو کی سلطنت جب بابائے اردو سید عبد اللہ تک پہنچی اور جب وہ مسند اردو پہ متمکن ہوئے تو چار سو سے یہی آواز آئی کہ پاکستان بھر میں صرف سید صاحب ہی اہلیت اور قابلیت رکھتے ہیں۔ بس جونہی سید صاحب نے آگے بڑھ کر بابائے اردو کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر لے لیا تو وطن عزیز کے علمی وادبی حلقوں نے انہیں ''بابائے اردو ثانی'' کے لقب سے نوازا۔''(۱۲۳)

'' بابائے اردو ثانی'' سے ملقب ہونا سید عبد اللہ کے لیے واقعی اعزاز کی بات ہے لیکن اس لقب کی وجہ ان کی بے مثال خدماتِ جلیلہ ہیں جو اردو زبان کی ترویج اور نفاذ کے لیے وہ عمر بھر کرتے رہے ہیں۔'' اردو زبان کا نفاذ'' سید عبد اللہ کی زندگی کا ایک مشن تھا۔ اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بنانے کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اردو زبان کے نفاذ کے لیے انہوں نے ارباب اقتدار کو قائل کرنے اور عوامی رائے ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ اردو دان طبقہ، مفکرین اور دانشوروں کو ہم خیال بنانے کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ سید عبد اللہ اردو زبان کو ایک زبان سے بڑھ کر جانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی پہچان اور ان کے کلچر کے ہونے کی ضامن ہے۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ''زبان کی اہمیت ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں فرنگی خوب جانتا ہے کہ زبان کی بنیاد پر عوام کو ملایا بھی جاسکتا ہے اور لڑایا بھی جاسکتا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زبان صرف کاروبار کا وسیلہ اظہار نہیں بلکہ اس کے ساتھ گہرے جذبات اجتماعی اور تہذیبی وابستہ ہیں۔ لفظ اردو میں گذشتہ مسلم تہذیب و اقتدار کا نقش موجود تھا۔ اس میں عربی، فارسی کی آمیزش تھی اور بین الاقوامی تہذیب کے اشارے پائے جاتے تھے۔ بس انہی اشاروں کو انگریز ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ اقتدار کی دوسری علامتوں کی طرح یہ حوالہ بھی باقی نہ رہے اور شوکت گم گشتہ کی فخر آمیز اور سلطنت کی بازیابی کا خیال نہ رہے۔''(۱۳۳)

تقسیم ہند سے قبل اردو زبان کو مذکورہ بالا خطرہ لاحق تھا کہ انگریز اور ہندو دونوں مسلم دشمنی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مشغول تھے۔ دیگر محاذوں کی طرح ''اردو ہندی تنازع'' کھڑا کر دیا۔ شروع میں انگریزوں نے ''اردو'' نام کو

"ہندوستانی" میں بدل دیا(۱۳۴)اور پھر ہندوؤں نے فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ کو نکلوا کر ہندی زبان کی بنیاد رکھ دی اور ہندوؤں نے ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دلوانے کے لیے سنجیدہ کوششیں شروع کر دیں۔ اس کشمکش کو سید واجد رضوی کچھ یوں ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں:

> "اردو پر پہلا حملہ ۱۸۶۷ء میں ہوا جبکہ ہندوؤں نے مطالبہ شروع کیا کہ اردو غیر ملکی زبان ہے۔ اس کے بجائے ہندی کو اور دیوناگری رسم الخط کو نافذ کیا جائے۔ در اصل ہندو اردو زبان کو ختم کر کے مسلمانوں کو اپنے ماضی سے منقطع کرنے کی سازش کر رہے تھے تاکہ مسلمانوں کی شناخت دھندلا جائے اور ان کے تشخص اور شناخت پر پردہ ڈالا جا سکے۔"(۱۳۵)

اس اردو دشمنی مہم میں گاندھی پیش پیش تھا۔ مسلمانوں کے خیال میں اردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترکہ زبان تھی مگر یہ مسلمانوں کی سادہ لوحی اور خام خیالی تھی۔ ہندو کے بیانگ دہل اعلان دشمنی کے بعد سر سید احمد خان پہلے مجاہد تھے جنھوں نے اسلامی ثقافت کی سب جاندار اور نمایاں نشانی کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے۔(۱۳۶)اس اردو دشمنی نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی راہ ہموار کی۔ بقول ممتاز منگلوری:

> "سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کی مقتدر شخصیات کو حالات کی سنگینی کی طرف توجہ دلا کر اجتماعی جدوجہد پر آمادہ کیا اور ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ آل انڈیا کانفرنس جانتی تھی کہ اردو کی مخالفت در حقیقت مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور مذہب و معاشرت کی مخالفت ہے اور اس کے تحفظ میں کوتاہی بڑی تباہی کا باعث ہو گی۔"(۱۳۷)

یوں "اردو زبان" کو مسلمانوں کے ساتھ جوڑ کر "ہندی" کو سرکاری زبان بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس اردو دشمنی کو دیکھ کر مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے بد ظن ہو گئے اور پاکستان کی تحریک کی فضا ہموار ہونے لگی۔ سر سید احمد خان کا ایک قول دیکھیے جس میں وہ اردو دشمنوں کے لیے لکھتے ہیں:

> "تیس برس کے عرصے میں مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلم، خیال پیدا ہوا۔ ہمیشہ میری خواہش تھی کہ دونوں (ہندو مسلم) مل کر فلاح کے لیے کوشش کریں مگر جب سے ہندوؤں کو یہ خیال آیا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے، اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو اور مسلمان باہم متفق ہو کر ملکی کی ترقی اور اس کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔"(۱۳۸)

ان حالات میں اردو زبان کو بر صغیر کے مسلمانوں نے اپنی سر آنکھوں پر بٹھالیا اور یوں تقسیم ہند کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ سر سید احمد خان کے بعد اردو زبان کو مولوی عبد الحق جیسا نڈر، باہمت اور مخلص سر پرست ملا۔ مولوی عبد الحق نے اردو زبان کی سرپرستی شروع کی اور ہر محاذ پر مردانہ وار اردو کو تحفظ دیا بلکہ یوں کہ جیسے کوئی غیرت مند باپ اپنی اولاد کو سنبھالتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''اردو ان کی (مولوی عبد الحق کی) دنیا تھی اور ان کی زندگی تھی۔ اردو ان کا نصب العین تھا۔ اردو ان کا نظریہ حیات اور ان کا مزاج، اردو ان کی طبیعت تھی۔ غرض وہ اردو کے سوا اور کچھ نہ لکھتے تھے۔ اردو کو ان کی شخصیت سے یا ان کی شخصیت کو اردو سے الگ کر دیا جائے تو ہر صورت میں دونوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔''(۱۳۸)

انجمن ترقی اردو کا قیام اور پھر اس کے فعال کردار کو پیش نظر رکھیے تو بریلوی صاحب کی رائے سے اختلاف کا یارا نہیں ہوتا۔

مولوی عبد الحق نے جب اردو دشمنی کو ہندوؤں کے دلوں اور زبانوں پر دیکھ لیا تو انہوں نے اردو کے تحفظ کا کام شروع کر دیا۔ یاد رہے کہ ہندوؤں کو اس کام میں انگریز حکومت کی خاموش مگر مکمل اعانت بھی حاصل تھی کیونکہ انگریز ہی مسلمانوں کو ان کے اس عظیم تہذیبی سرچشمہ سے دور کر کے ہمیشہ کے لیے ہندوؤں یا اپنے آپ کے زیر دست کرنا چاہتے تھے۔ مولوی عبد الحق نے اس ساری دشمنی کا تن تنہا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور مضبوط بنیادوں پر لڑائی لڑنے کے لیے انہوں نے انجمن ترقی اردو کا مضبوط مورچہ تیار کیا۔ بقول ناصر سوری:

> ''انجمن ترقی اردو پاکستان، بر صغیر کا قدیم ترین ثقافتی اور ادبی ادارہ ہے جو ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ کی حیثیت سے سر سید خان کے رفقائے کار نے قائم کیا۔ اس کے بنیادی مقاصد اردو زبان کی ترویج و اشاعت، تراجم اور تحقیق تھے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق ۱۹۱۳ء میں انجمن کے معتمد ہوئے اور ان کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد لے گئے۔''(۱۳۹)

مولوی عبد الحق نے انجمن ترقی اردو کو خوب فعال کیے رکھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی کل پونجی جو کم و بیش ۵ لاکھ سے کم نہ ہو گی، انجمن کو وقف کر دی۔(۱۴۰) گاندھی سے شروع ہونے والی اس جدوجہد کو مولوی عبد الحق نے تادم آخر تک جوش و خروش سے جاری رکھا۔ اردو کی ترویج اور فروغ کو ۱۹۴۷ء کے بعد بھی جاری رکھا۔ مولوی عبد الحق پاکستان بن جانے کے بعد اردو سے محبت کرنے والے لوگوں بالخصوص ادیب، مفکروں اور دانشوروں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ اردو کے

فروغ کے ساتھ ساتھ پاکستان میں اس کے نفاذ کے لیے بھی کام کریں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے جو مقام اردو کو دینا چاہا تھا اس کے لیے خاص محنت اور کوشش کی ضرورت اب بھی ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے اس ضمن میں واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا:

> ''میں آپ کو صاف طور پر بتادوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ در حقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ واحد سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم متحد رہ سکتی ہے نہ ہی روبہ عمل۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔''(۱۴۱)

قائد اعظم کے اس حکم نے سرکاری اور قومی زبان کی بحث کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک اردو اسلامی اور پاکستانی قومیت کا سب سے مستحکم اور نمایاں و عنصر تھا اور قائد اعظم بھی اس حقیقت آگاہ تھے۔ جب کبھی بھی اردو کا ذکر آیا انہوں نے اردو زبان کی اہمیت پر ایک ہی موقف اپنایا اور اپنے دل کی بات کو خوب وضاحت سے بیان بھی کیا ہے۔ قائد اعظم ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور ایک عاقل و بالغ رہنما تھے اور اردو کے حوالے سے انہوں نے کبھی بھی مبہم بات نہیں کی کیونکہ قائد اعظم نہایت معتدل اور واضح لسانی شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

> ''ہم ایک قوم ہیں اور ہماری تہذیب و ثقافت ہماری اپنی ہے۔ ہماری اپنی زبان ہے۔ ہمارا اپنا رب ہے۔ ہمارا اپنا فن تعمیر ہے اور ہم اپنے فن تعمیر پر ناز کرتے ہیں۔ اقدار اور نسبتوں کا تصور ہمارا اپنا ہے۔ ہمار ا اپنا قانون اور ہمارا اپنا نظام اخلاق ہے۔ ہماری رسوم اور کلینڈر، تاریخ اور روایات اور امنگیں صرف ہم ہی سے ماخوذ ہیں اور زندگی کو جانچنے اور سمجھنے کا انداز اور زندگی گزارنے کے مسائل اور زاویے ہمارے اپنے ہیں۔''(۱۴۲)

قائد اعظم محمد علی جناح نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اردو ہمارے ثقافتی سرمائے کی پہچان اور ضامن ہی نہیں سرمایہ بھی ہے۔ اس لیے مولوی عبد الحق قائد اعظم محمد علی جناح کے ہم خیال تھے اور اس مشن کی تکمیل کے آرزومند بھی۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر کو تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی لے آئے اور اردو کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ سید عبداللہ اور مولوی عبد الحق کے دیرینہ مراسم تھے اور راہ و رسم کی وجہ کچھ اور نہ تھی بلکہ اردو ہی تھی۔ مولوی عبد الحق اور سید عبداللہ کے مراسم پر بات کرتے ہوئے محمد اسلم نشتر لکھتے ہیں:

"بابائے اردو، انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں جن میں محبان اردو اور جانثاران اردو سے خط کتابت کے ذریعے رابطہ کرتے تھے۔اس میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید عبد اللہ قیام پاکستان کے بعد دم واپسیں تک ارض وطن میں نفاذ اردو کے لیے ایک مینارہ نور ثابت ہوئے۔انہوں نے اردو کے لیے جو مختلف تحریکیں چلائیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے لیے بابائے اردو کا یہ انتخاب نہایت موزوں اور مناسب تھا۔"(۱۴۳)

سید عبد اللہ نے مولوی عبد الحق کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی جس کا مقصد اردو کا تحفظ اور نفاذ تھا۔سید عبد اللہ اس سے قبل بھی نفاذ اردو کے لیے انفرادی سطح پر کام کر رہے تھے۔مدرس اردو کی حیثیت سے اور ایک ادیب کی حیثیت سے لیکن اب انہوں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت بلکہ نفاذ کو چیلنج کے طور پر قبول کر لیا اور اس مشن میں مصروف عمل ہو گئے۔ اردو سے محبت کا عالم یہ تھا کہ بقول روبینہ شاہین:

"اردو زبان سے ان کی محبت اور شیفتگی حد درجہ تھی۔اردو کی حیثیت منوانے اور اس کو اس کا اصل مقام دلوانے کے لیے انہیں کئی دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا۔ان مشکل راہوں کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب "پاکستان میں اردو کا مسئلہ" (۱۹۷۶ء) بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ کتاب قائد اعظم محمد علی جناح کے نام معنون ہے۔کراچی میں اردو کالج کا قیام سید عبد اللہ کی اردو تحریک کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"(۱۴۴)

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے ایک پوری کتاب ڈاکٹر سید عبد اللہ کی خدمات پر لکھی جس کا نام "ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات" ہے۔اس کتاب میں انہوں نے سید صاحب کی اس جدوجہد کو قلم بند کیا ہے جو آپ نے فروغ زبان اور نفاذ اردو کے لیے کی۔ سید صاحب نے اردو زبان کے نفاذ اور فروغ کے لیے ارباب اقتدار کو قائل کیا۔مارشل لا کے زمانے میں بھی اپنی تحریک نفاذ اردو کو فعال رکھا۔نہایت ہمت اور منصوبہ بندی سے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

"طلوع پاکستان کے ساتھ ہی استاذی سید صاحب نے اردو کی ترقی اور ترویج کی مہم شروع کر دی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات خان ملک کو یونیورسٹی کی جانب سے اردو کانفرنس کے انعقاد پر آمادہ کیا۔مارچ ۱۹۴۸ء میں ہونے والی یہ پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس پاکستان کی پہلی اردو کانفرنس تھی۔"(۱۴۵)

سید عبد اللہ نے نہایت بے لوث اور اخلاص سے اردو زبان کی خدمت بجالانے کا کام شروع کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنا منشور اور مدعا عوام و خاص تک پہنچانے کے لیے ''پاکستان میں اردو کا مسئلہ'' کتاب لکھی۔ قائد اعظم کے نظریہ اردو اور مولوی عبد الحق کے تصور اردو سے عوام الناس کو روشناس کرایا کیونکہ اسی زبان اردو کے ساتھ پاکستان اور اہل پاکستان کی بقا مشروط تھی اور ہے اور یہ بھی کہ اردو اسلامیانِ ہند کی خوش رنگ نشانی اور شناخت کا حوالہ ہے۔ اس ضمن میں سید عبد اللہ نے ایک بنیادی سوال اٹھایا ہے:

> ''سوال کیا جاسکتا ہے کہ لفظ ''اردو'' میں وہ کون سا سیاسی اشارہ ہے جس سے پہلے انگریزوں کو اور پھر ہندوؤں کو چڑ تھی۔ اور اب قیام پاکستان کے بعد (بھی) چند لوگوں کو ہے۔''(۱۴۶)

یہ نازک اور بنیادی سوال ہے۔ اگر اس سوال کو مزید جامعیت سے پوچھ لیا جائے کہ اردو زبان جس کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جارہا ہے اس سے کن کن لوگوں کو چڑ ہے اور یہ چڑ کیوں ہے تو اس سوال کے جواب سے دوست اور دشمن کی پہچان ہو جائے گی۔ کیونکہ برصغیر میں اردو ایک کسوٹی ہے۔ سچ پوچھیے تو بغض اردو اور حب اردو انفرادی مسئلہ نہیں جماعت کا مسئلہ ہے بلکہ جماعت کی پہچان ہے۔ سید عبد اللہ اردو کے اسی حوالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم جن مقدس چیزوں کا نام لے کر کوئی مقصد خاص کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ مقاصد حاصل کر چکنے کے بعد پھر امن سے نا آشنائی برتتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔ اس وقت پاکستان کے مرکزی عقیدوں سے جو بے وفائی ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں نظر آئی ہے اس کو دیکھ کر بے حسی اور بے حیائی کا گہرا نقش جم جاتا ہے۔ بے وفائی کی اس داستان میں سب سے زیادہ مظلوم زبان اردو ہے۔''(۱۴۷)

یہ وہ سوچ اور فکر تھی جس نے سید عبد اللہ کو اردو کی اشاعت، ترویج اور نفاذ کی لگن لگائی کیونکہ وہ اردو کے اصل مقام اور وقعت سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ اس پر مستزاد یہ بھی کہ مولوی عبد الحق کی آنکھیں بھی دیکھی تھیں۔ خط کتابت بھی دونوں کے درمیان تھی جن سے سید صاحب اپنے مشن سے متعلق مولوی صاحب سے ہدایات لیتے تھے۔ دونوں زندگی بھر اس مشن میں لگے رہے۔ مولوی عبد الحق کی وفات کے بعد بھی سید عبد اللہ نے اپنا مشن جاری رکھا۔ بقول محمد اسلام نشتر:

> ''ڈاکٹر سید عبد اللہ کے نام لکھے گئے خطوط میں بابائے اردو کا جس انداز سے بھی تجزیہ کیا جائے، یہ بات طے ہے کہ دونوں اکابر مخلص، جدوجہد کے خوگر، لگن کے پیکر اور قومی زبان اردو کے لیے زندگی وقف کر چکے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد ازاں نا مساعد حالات میں ہی انہوں نے

اپنی جدوجہد کا علم بلند رکھا اور اس پر آنچ نہیں آنے دی۔ بابائے اردو ۹۱ سال کی عمر میں ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء تک ترویج و فروغ اردو اور نفاذ قومی زبان کے لیے کوشاں رہے۔" (۱۴۸)

سید عبداللہ نے اردو کے نفاذ کے لیے بہت کوشش اور محنت کی۔ اپنے مشن کے ساتھ سچی لگن اور محبت رکھتے تھے۔ لہٰذا مارشل لا جیسی سختی کے دور میں بھی وہ اپنے مشن کے لیے مختلف اداروں اور ارباب اقتدار کے دروازوں پر جا کر اپنا مقدمہ لڑتے۔ ساتھ ساتھ انہوں نے قلم کی مدد سے بھی جہاد کیا۔ اردو کے حق میں مضامین لکھے، تقاریر کیں اور خطوط بھی لکھے۔ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

"استاد مکرم (سید عبداللہ) نے اردو کے لیے اتنا لکھا شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔ آپ نے اردو کے لیے اتنا وقت دیا کہ شاید ہی کسی نے دیا ہو۔ آپ نے اردو کے لیے لگن اور محبت کا عملی ثبوت دیا کہ شاید ہی کسی نے دیا ہو۔" (۱۴۹)

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی رائے صائب ہے۔ واقعی سید عبداللہ نے اردو زبان کے لیے خوب دن رات کام کیا۔ اردو کے نفاذ کے لیے عوامی تحریک کا منصوبہ تیار کیا تا کہ عوام کی طاقت کو اس اہم اور نازک مسئلے کے حل میں استعمال کیا جا سکے کیونکہ اردو پاکستان کے صوبوں میں بھی لینگوا فرینکا ہے اور عوام اس کی افادیت اور تہذیبی قدر و منزلت سے آگاہ ہی نہیں بلکہ اردو زبان سے عوام کو پیار و محبت ہے۔ خواص کی بھی بڑی تعداد اردو زبان سے بلا کسی غرض انس رکھتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے عوامی تحریک کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ اپنے مراسم اور تعلقات بروئے کار لائے اور سارے پاکستان میں عوام کو اردو کے حق میں آواز اٹھانے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے مختلف کانفرنسوں کا انعقاد کیا تا کہ ارباب اقتدار کو ہم خیال بنایا جا سکے۔ اپنی جدوجہد کا حال بتاتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ اردو کے نفاذ کے لیے کوششوں کے بارے بتاتے ہیں:

"اردو کے لیے جدوجہد مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ (۱) تصنیفی مقاصد کے لیے مہم منظم ہوئی۔ (۲) کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ (۳) جلوس نکالے گئے۔ (۴) مخصوص مقاصد کے لیے مہم منظم ہوئی۔ (۵) حکام کے نام اپیلیں اور یادداشتیں بھیجی گئیں۔ (۶) بیانات دیے گئے۔ (۷) مضامین لکھے گئے۔ (۸) پمفلٹ تقسیم ہوئے۔" (۱۵۰)

بہ الفاظ دیگر سید عبداللہ نے اردو کے نفاذ کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور نہ ہی کوئی راہ چھوڑی نہیں ہے۔ دوران ملازمت اور بعد از ملازمت اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے، اردو زبان کو دفتری اور سرکاری زبان قرار دینے کے

لیے مقالات و مضامین لکھے۔کانفرنسیں منعقد کیں،تقاریر کیں۔بڑے بڑے مشاہیر کو کانفرنسوں میں بلایا اور ان سے اردو کے نفاذ کے لیے صلاح مشورے لیے۔پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس مارچ ۱۹۴۸ء میں شروع ہونے والا کانفرنسوں کا سلسلہ ان کی وفات کے ساتھ بند ہوا۔چند شہرہ آفاق کانفرنسوں کے حوالے دیکھیے:

> "اردو کانفرنس کراچی ۱۹۵۱ء کے بعد اردو انجمنوں کی بارہ کانفرنسیں کرائیں۔اس کے علاوہ اردو تدریس کانفرنس ۱۹۶۱ء انجمن ترویج اردو کے زیر اہتمام اورئینٹل کالج میں مختلف کانفرنسیں،اس کے علاوہ سرگودھا،پشاور،سیالکوٹ میں بھی مختلف سطح اور پیمانے کی کانفرنسیں کرائی گئیں۔ان میں سید صاحب بالواسطہ اور بلاواسطہ محرک تھے۔"(۱۵۱)

اس کے علاوہ بھی سید عبداللہ نے کئی معرکتہ الآرا مضامین اردو کی وکالت میں لکھے جو اپنے عہد کے موقر جرائد میں چھپے۔ مثلاً"اردو ذریعہ تعلیم اور نفاذ اردو"(پمفلٹ ۱۹۸۶ء)،"اردو کی مزید ترقی کے امکانات(ماہ نو ۱۹۵۳ء)،"پاکستان میں اردو کا مستقبل (ہمایوں لاہور ۱۹۴۸ء)،"اردو اپنے نئے ماحول میں(قومی زبان کراچی ۱۹۴۸ء)،"پاکستان میں اردو کا پہلا سال(ہمایوں لاہور ۱۹۴۸ء)،"پنجاب یونیورسٹی میں اردو"(قومی زبان کراچی ۱۹۴۸ء)،"اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں "(قومی زبان کراچی ۱۹۶۱ء)،"اردو کے موجودہ اہم مسائل "(قومی زبان کراچی ۱۹۷۰ء)،" اور " نظریہ پاکستان" (المعارف لاہور ۱۹۷۱ء)وغیرہ۔(۱۵۲)مضامین و مقالات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

سید عبداللہ نے اردو زبان کو سکولوں،کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس اور آرٹس کے جملہ مضامین کی تدریس کا ذریعہ بنانے کے لیے بھی سر توڑ کوششیں کیں۔ تعلیمی اداروں میں اردو کی تدریس کے نصابات کے لیے مشاورتی کمیٹیاں بنائیں۔کانفرنسیں اور مختلف انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔اورئینٹل کالج میں سائنسی موضوعات پر اردو میں مضمون نویسی کے مقابلوں کا انعقاد کرایا گیا اور انعامات دیے گئے۔یہ تعلیمی ذریعہ بنانا کے لیے اور اردو کے نفاذ کی سمت ایک قدم تھا جو کسی حد تک کامیاب بھی ہوا مگر تعلیم یافتہ طبقہ،تعلیم کی تدریس کے لیے اردو کے حق میں نہیں جس کی وجہ سے نفاذ اردو کا سادہ اور سیدھا عمل بھی ٹیڑھی کھیر بنا ہوا ہے۔ تعلیمی میدان کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام میں بھی اردو زبان کے لیے سید عبداللہ نے کام کیا۔اردو کو عدالتوں میں نافذ کرنے کے لی بھی سید عبداللہ نے سنجیدہ اور مخلص کاوشیں کیں۔ عدالتی نظام کے بارے میں سید عبداللہ اپنی کتاب تحریک نفاذ اردو میں لکھتے ہیں:

"عدالتوں کی زبان کا مسئلہ مشکل نہیں۔اصل تیاری یہ ہے کہ قانون کی تدریس اردو میں ہونی چاہیے۔(تاکہ اصطلاحات کی تعلیم اور مفہوم سمجھ آئے) باقی تیاری تجربے کے دوران ہوتی رہے گی۔"(۱۵۳)

عدالتی نظام کے بارے میں بھی سید عبداللہ کا نفاذ اردو کا بہت اصرار ہے اور وہ کہتے ہیں کہ آغاز کر دیں۔ درپیش آنے والے مسائل اور رکاوٹوں سے ساتھ ساتھ نمٹ لیا جائے گا۔یوں کہنا چاہیے کہ سید عبداللہ پاکستان کے ہر شعبہ زندگی میں اردوزبان کو برتنا چاہتے تھے۔سی ایس ایس اور فوج سے لے کر سکول، یونیورسٹیوں، مدرسوں، عدالتوں، بینکوں، ڈاکخانوں میں بھی واحد زبان اردو ہو۔وہ عید کارڈ اردو میں لکھے دیکھنا چاہتے تھے۔، دکانوں، موٹر کاروں کے نمبر، سڑکوں پر لکھی ہدایات وغیرہ اردو میں لکھے جانے کے آرزو مند تھے۔سید عبداللہ چاہتے تھے کہ اردو کو صرف آئین ہی میں سرکاری اور دفتری زبان قرار نہ دیا جائے بلکہ عملی طور پر اردو کا عملی مقام اسے ملے اور انگریزی اردوزبان کا نعم البدل بن جائے۔یہ خوش آئند امر بھی سید عبداللہ کے مشن کے لیے تھا کہ ہر آئین نے اردو کی افادیت اور اہمیت کو تسلیم کیا تھا اور وہ اس بات کو بطور دلیل بھی پیش کرتے تھے کہ اردو کو آئینی تقویت ہمیشہ حاصل رہی ہے۔بقول ڈاکٹر ظہور احمد اعوان:

"پاکستان میں جو بھی آئین تیار ہوا اس میں اردو کو قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔۱۹۵۶ء میں اردو کے سرکاری سطح پر انگریزی کی جگہ لینے کے لیے ۱۵ سال کی مدت مقرر کی گئی۔اگر یہ آئین برقرار رہتا تو اردو کو اس کا جائز مقام غالباً ۱۹۷۱ء میں مل جاتا۔پھر ۱۹۶۲ء کا آئین، اس میں قومی زبان کے نفاذ کے لیے ۲۰ سال کی مدت رکھی گئی۔اس آئین کو دوسرا مارشل لا کھا گیا۔موجودہ آئین ۱۹۷۳ء میں پھر پندرہ سال کی مدت رکھی گئی۔"(۱۵۴)

یعنی اب ۱۹۸۸ء میں اردو کو جائز اور آئینی مقام مل جانا چاہیے تھا۔یہ سب تاحال ایک دیوانے کے خواب کے سوا کچھ نہیں۔اردو کے سرکاری زبان بننے میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔کچھ ظاہری اور کچھ پوشیدہ رکاوٹیں ہیں جو دشمنوں نے پیدا کرر کھی ہیں۔ارباب اختیار کی بے توجہی اور بیوروکریسی کے رعب داب کو قائم رکھنے کے لیے اردوزبان نشانہ بن رہی ہے۔اردوزبان جو ہمارے قومی تشخص اور ہماری ثقافت کی نشانی ہے مگر اپنے دیس میں اجنبی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"امر واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان ہی ہماری تہذیب کا دوسرا نام ہے۔وجہ یہ ہے اردو نے ہماری تہذیب کی روح کو اندر سمیٹا ہے اور یہ تہذیب کے لطیف ترین ابعاد کو منعکس کرتے چلی گئی۔"(۱۵۵)

سید عبداللہ کے نزدیک اردو صرف تہذیب ہی نہیں بلکہ پاکستانی مسلمانوں کی شناختی علامت ہے۔ اردو نے ہماری تہذیب کی روح کو ہی نہیں سمیٹا بلکہ اسلامی تہذیب کو قدم جمانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس بات پر اہل دانش ہم خیال اور متفق ہیں کہ اردو کے بغیر پاکستانی قومیت کا تصور ایسا ہی ہے جیسے ایک بے جان جثہ پڑا ہوا ہو۔

سید عبداللہ نے اردو کے نفاذ کے ایک ایک عوامی تحریک کا منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں پورے پاکستان کے عوامی حلقوں سے رابطے کے لیے اپنے تعلقات استعمال کیے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ اردو زبان کے نفاذ کے ضمن میں جب تک عوام الناس کا دباؤ سامنے نہیں آتا ارباب اختیار اس معاملے میں ٹال مٹول ہی کرتے رہیں گے۔ اپنے مشن میں تیز اور اثر کے لیے انہوں نے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں موجود دوست اور رفقا کو خط لکھے کہ آپ اپنے اپنے ہاں کانفرنسیں، جلوس، احتجاجی ریلیاں اور تقاریر کا سلسلہ شروع کریں تاکہ ہم حکومت پر اس آئینی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دباؤ ڈال سکیں۔ ملک بھر کی ادبی تنظیموں اور انجمنوں سے کہا گیا کہ اردو کے نفاذ کے حق میں پروگرام تشکیل دیں اور سید عبداللہ نے ان کانفرنسوں، جلسوں اور ریلیوں میں بذات خوش شریک ہونے کی یقین دہانی بھی کرائی۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> ”۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء تک گیارہ برس تک استاذی سید صاحب اردو کو اس کا قانونی حق (دفتری ،سرکاری، علمی، تعلیمی) قومی مرتبہ دلانے کے لیے مختلف زاویوں سے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ کانفرنسوں ،مذاکروں میں اردو کے اصل مقام اور مرتبے کے عملی نفاذ کی بات کرتے رہے۔ اردو کی ترویج کے لیے خود مضامین لکھے اور اخبارات میں بیانات دیتے رہے۔ اور دوسروں کو اس ضمن میں آمادہ کرتے رہے۔“(۱۵۶)

پھر انہوں نے عوامی سطح پر ایک کامیاب تحریک چلائی۔ عوامی حلقوں نے بھی اردو زبان سے اپنی عملی محبت کا ثبوت دیا اور پاکستان کے طول و عرض میں جلسے اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں سے کچھ میں سید صاحب خود تشریف لے گئے۔ عوامی حلقوں کے اس رد عمل پر سید عبداللہ کو اپنے ملک میں اردو کا مستقبل محفوظ محسوس ہوا۔(۱۵۷)

سید صاحب کا زندگی بھر کا مشن نفاذ اردو زبان تھا۔ وہ اردو کو قائداعظم کی نظر سے دیکھتے تھے اور وہ اس کا تحفظ اپنے مرشد مولوی عبدالحق کی طرح کرتے رہے۔ وہ اردو کو قومی، سرکاری اور دفتری زبان بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس ضمن میں خوب لڑائی لڑی اور مخالفین کا عزم صمیم سے مقابلہ کیا اور اپنے پایۂ استقلال کو ڈگمگانے نہیں دیا۔ انہوں نے اردو کو ذریعہ

تعلیم بنانے اور عدالتی کارروائی کو اردو زبان میں کرنے کے لیے زبان اور قلم دونوں طرح سے لڑی۔مارشل لا اور بیورو کریسی کی رعونت کے آگے ڈٹ گئے اور اپنے مشن کے لیے سارے پاکستان میں تحریک نفاذ اردو چلائی۔اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے خود بھی مقالات لکھے اور زبان کے فروغ کے لیے کام کرنے والی انجمنوں کی سرپرستی بھی کی۔ سائنس کی تدریس اردو میں ممکن ہے اس کے لیے بی ایس سی اور ایم ایس سی کا نصاب مرتب کیا اور اصطلاحات کے باب میں اجتہادی کام کیا۔اپنے کالج میں سائنسی موضوعات پر مقابلہ مضمون نویسی کرایا اور معترضین کو عملی طور پر لاجواب کیا ۔ یہ مقابلہ مضمون نویسی کئی سالوں تک جاری رہا۔سید عبداللہ کی تحریک نفاذ اردو نے کئی اردو کے اعتراضات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور اردو زبان کی وسعت و فصاحت کو منوایا۔وہ ایک باعمل، لگن کے پکے اور محنتی انسان تھے، اس لیے ساری زندگی اردو کی خدمت میں گزاری۔اسی لیے ان کو محبان اردو نے "بابائے اردو ثانی" کا لقب بھی دیا ہے۔(۱۵۸)

افکار قائداعظم اور سید عبداللہ

قائداعظم محمد علی جناح سے ہر باشعور اور غیرت مند پاکستانی پیار کرتا اور ان کے لیے عقید و احترام کا جذبہ رکھتا ہے کیونکہ بابائے قوم نے مسلمانان ہند کو آزادی دلائی اور ان کی آنے والی نسلوں پر احسان عظیم کیا۔سید عبداللہ عام، باشعور اور غیرت مند پاکستانی سے بڑھ کر ہیں کیونکہ آپ سچے محب وطن ہیں اور پاکستان کو ایک عظیم سلطنت اور مستحکم ملک کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔سید عبداللہ وہ پاکستانی ہیں جنھوں نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے تمام عمر کوشش کی اور پاکستان سے محبت کے تقاضوں کو صدق دل سے نبھایا۔سید عبداللہ قائداعظم کے سچے پیروکار اور ان کے نظریات کے مکمل حامی تھے۔ قائداعظم کو وہ اپنا حقیقی رہنما اور ہیرو مانتے تھے۔ان کی کتاب "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر"(۱۹۷۷ء) قائد اعظم کے متعلق نیک خیالات اور توصیفی کلمات ملتے ہیں جن میں مبالغہ آمیزی بالکل نہیں۔ان خیالات کو پڑھ کر ان کی نظر میں بابائے قوم کا جو مقام ہے وہ نظر آجاتا ہے۔ قائداعظم کے لیے اور پاکستان کے استحکام کے لیے سید عبداللہ جابجا کامیابی کی کنجی اس عمل کو قرار دیتے ہیں۔بقول ان کے "میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ قائداعظم کے واضح ارشادات کو مشعل راہ بنانا چاہیے۔"(۱۵۹)سید عبداللہ کی تحریری سرمائے میں قائداعظم محمد علی جناح کے خیالات کی شرح اور تفسیر ملتی ہے۔ سید عبداللہ اپنے خیالات اور نظریات بیان کرتے وقت قائداعظم کے بیانات اور اقوال کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ قائداعظم کے خطوط اور تقاریر کے اقتباسات سید عبداللہ اپنی بحثوں کو معنی خیز اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے استعمال

کرتے ہیں۔یوں اس سچے محب وطن اور محب قائد کی گفتگو اور تحریر میں خلوص اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور عظیم رہبر کا قد بھی بڑھنے لگتا ہے۔سید عبداللہ نے قائداعظم محمد علی جناح کے نظریۂ قومیت کو خاص حوالے کے طور پر لیتے ہیں۔ قائد اعظم کا نظریہ پاکستان دو قومی نظریے کی دین ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نظریہ کے بارے میں ایک رائے نواب بہادر یار جنگ کی قائد کی فہم و فراست کو ظاہر کر رہی ہے:

> "قائد اعظم نے جس وقت لیگ کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی،ہمارے دماغوں پر مختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے،برادرانِ وطن نے باندازِ دوستی ہم کو یقین دلا دیا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں۔ یہ احساس کمتری ہر چھوٹے بڑے میں سرایت کر گیا تھا۔ قائد اعظم نے ہم کو بتایا کہ ہم اقلیت نہیں ہیں۔ دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلا سکتی "تم ایک قوم ہو، مستقل قوم، جس کے قوام اقوامِ عالم سے بالکل مختلف اور جدا ہے اور جس کی بنیاد و ترتیب، جغرافیہ، نسل و رنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔"(۱۶۰)

قائداعظم سمجھتے تھے کہ پاکستان کا مطالبہ مسلمان صرف اور صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کی قومیت ہندو کی قومیت سے الگ ہے۔الگ قومیت کے اس تصور کو قائد اعظم نے نہایت وضاحت اور صراحت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ بقول سید عبداللہ:

> "قائد اعظم نے مسلمانوں کی الگ قومیت کی بنیادی اور واحد مؤثر وجہ یہ بتائی کہ ہندوؤں کا اور مسلمانوں کا مذہب جدا ہے۔ اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قائد اعظم مذہب کو قومیت کی اساس سمجھتے تھے۔"(۱۶۱)

اور قائداعظم کا یہ قول بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ مذہب کو قومیت کی لازمی شرط جانتے تھے کہ:

> "قائداعظم نے فرمایا تھا'پاکستان اسی روز وجود میں آ گیا تھا جس روز پہلا ہندوستانی (ہندو) مسلمان ہوا تھا۔"(۱۶۲)

اس اقتباس سے کس قدر صراحت سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ بابائے قوم قائد اعظم نے نظریۂ قومیت کی بنیاد "اسلام" کو قرار دیا ہے۔سید عبداللہ یہ بھی مانتے ہیں کہ قائد اعظم کے سامنے بر صغیر کے مسلمانوں کے علیحدگی کے مطالبے کے لیے معاشی،اقتصادی اور سیاسی وجوہ بھی ضرور تھیں لیکن وہ پاکستان کے نظریہ اور مطالبہ کے متعلق نہایت واضح اور صریح رائے رکھتے تھے جس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ جیسے انہوں نے گاندھی کو خط میں لکھا:

"ہم کہتے ہیں اور یہ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمان اور ہندو ہر تعریف اور معیار قومیت کی رو سے (انڈیا کی) دو بڑی قومیں ہیں۔ ہم مسلمان دس کروڑ نفوس پر مشتمل ایک قوم ہیں اور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک مخصوص اور منفرد کلچر کے مالک ہیں۔ ہم ایک تمدن کے وارث ہیں۔ ہماری زبان، ہمارا ادب، ہمارا فن، تعمیری اسالیب، نام اور نظام اسما، شعور و اقدار و تناسب، قوانین، اخلاق و ضوابط، رسم و رواج، تقویمی سلسلہ، تاریخ، روایات مزاجوں کی ساخت، آرزوؤں اور امنگوں کی نوعیت، غرض زندگی کے بارے میں اور زندگی میں ہمارا اپنا خاص نقطہ نظر ہے اور بین الاقوامی قانون کی ہر تعبیر کے مطابق ہم ایک مستقل قوم ہیں۔" (۱۶۳)

سید عبداللہ، قائد اعظم کے نظریہ پاکستان اور نظریۂ قومیت کو بہت سراہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قائد اعظم کے یہ نظریات جہاں پاکستان کے حصول اور مسلم اتحاد کے لیے برصغیر میں جادوئی انداز میں کام کر رہے تھے اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو فعال کر رہے تھے، وہیں یہ نظریات خود بابائے قوم کے مذہبی، قومی اور ملی رجحان اور طبع سلیم کا حال بھی ظاہر کر رہے ہیں دوسری طرف بابائے قوم کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانے والے عناصر کو بھی لاجواب کر رہے ہیں۔

قائد اعظم کے متعلق اندرون و بیرون ملک پاکستان ایک گروہ نہایت ڈھٹائی اور زیرکی سے کئی بدگمانیاں پھیلانے میں مصروف عمل ہے جن میں سے ایک قبیح بدگمانی یہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح سیکولر سوچ و فکر کے حامل قرار دینا ہے۔ ایک معتدل اور سوچنے والا اور سمجھنے کا سلیقہ رکھنے والا شخص تو قائد اعظم کے نظریۂ قومیت سے ان کی فکر جان کو بہ سہولت جان لے گا مگر کم فہم، بد طینت اور بدگمان طبیعتیں گمراہ ہو جاتی ہیں۔ قائد اعظم پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے بقول ڈاکٹر صفدر محمود:

"دانشوروں کا ایک منظم گروہ چند برسوں میں دن رات یہ ڈھنڈورا پیٹنے میں مصروف ہے کہ قائد اعظم سیکولر ذہن کے مالک تھے اور پاکستان میں تو سیکولر نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔" (۱۶۴)

سید عبداللہ بھی اس ضمن میں خاصے فکرمند ہیں کہ یہ جھوٹا واویلا جہاں قائد اعظم جیسی عظیم اور معتبر شخصیت کے قد کاٹھ کو نقصان پہنچا رہا ہے وہیں پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ قائد اعظم کبھی بھی سیکولر ذہن اور نظام کے داعی نہیں رہے۔ سیکولر کا مطلب کچھ یوں ہے:

" The Deattachment of a State or other body from reliogious foundation " (۱۶۵)

سید عبداللہ اس سیکولرزم کے الزام کو بھی قائد اعظم سے دور کرنے کے لیے ایک بالیدہ انداز میں وکالت کرتے ہیں۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ گو قائد اعظم کی ظاہری صورت مذہبی نہ تھی لیکن قائد اعظم ایک دین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور خود بھی اسلام کی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بھی خاصا تھا جو ان کے انٹرویوز، تقاریر اور خطوط میں جھلکتا ہے۔ سیکولرازم ان کے لیے بالکل غیر اہم تھا۔ پاکستان کے لیے ان کے پاس ”دین اسلام“ تھا۔ اسی لیے تو انہوں نے پاکستان کو ”اسلام کی تجربہ گاہ“(۱۶۶) اور ”اسلام کا مضبوط قلعہ“ قرار دیا ہے۔(۱۶۷) سعید الدین اختر ڈار کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

Quaid-e-Azam considered creation of Pakistan a means to an end not the end iteself.He "
wanted Pakistan to be " Bulwark of Islam" and a state where the principles of Islam social justice could find free play. He wanted Mulsims to take inspiration and guidance from the Holly Quran.He believed that the salvation of the Muslims lies in following the golden rules of conduct act for us (Muslims) by our great law giver, the Prophet (PBUH)

(۱۶۸)

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قائد اعظم کے ذہن میں یہ واضح تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی جو اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ ہو گی نہ سیکولر ریاست بنائیں گے۔ اس اسلامی ریاست میں اسلامی قوانین پر عمل پیرا ہونے اور انہیں برتنے کا کام کیا جائے گا۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ قائد اعظم کے فرامین اس ضمن میں نہایت واضح ہیں۔ ان کی باتیں کسی قسم کا ابہام نہیں پیدا ہونے دیتیں۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ تعصب اور بغض کی عینک اتار کر قائد اعظم کے اسلامی نظریات اور خیالات کو دیکھا جائے۔ یہ بات نہایت ذمہ داری سے کہی جا سکتی قائد اعظم نے تقسیم ہند کی جتنی وضاحتیں کیں ان کی بنیاد اسلام ہی تھا۔ ایک توجیہہ دیکھیے جو سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ”ہندوستان کی مسلم قوم کے مستقل اور منفرد ہونے کے اصول پر قائد اعظم نے اتنا زور دیا کہ اس مسئلے کو انہوں نے ہند اسلامی تاریخ کا مستقل (موضوع) بنا دیا۔ انہوں نے فرمایا: پاکستان کی بنیاد اسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن برصغیر کا پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مقامی باشندوں میں سے کسی نے اگر نیا مذہب قبول کیا تو جہاں اس نے نیا مذہب قبول کیا اس کے ساتھ ہی اس کی قومیت بدل گئی۔“(۱۶۹)

سید عبداللہ اس بحث کو آگے بڑھاتے لے جاتے ہیں کہ اتنی واضح شہادتوں کے بعد بھی قائد اعظم کے مذہبی حوالے پر شک کرنا اور مطالبہ پاکستان کے مذہب کے علاوہ دیگر کسی پہلو کو وجہ قرار دینا ناانصافی ہو گی۔ قائد اعظم نے بارہا اور نہایت واشگاف الفاظ میں اسلام اور پاکستان کے رشتے کو واضح کیا اور اس معاملے میں انہیں کسی قسم کی جھجھک نہیں رہی اور نہ ہی ان کے ہاں اسلام اور پاکستان کے باہمی رشتے کے متعلق متضاد آرا ملتی ہیں۔ اسلام کے بارے میں قائد اعظم کا تصور بڑا واضح اور مانع تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''اسلام کے تصور مملکت کا یہ امتیاز نظر میں رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے اصول اور احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی شخص یا ادارے کی بلکہ قرآن مجید کے احکامات ہی یہ سیاست اور معاشرت میں آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرسکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکومت ہے۔''(۱۷۰)

سید عبداللہ قائد کے انہی افکار و خیالات کو اپنے ہاں جگہ دیتے ہیں اور یہ سوالات پوچھتے ہیں کہ کیا ایسے خیالات اور نظریات کا حامل انسان سیکولر ریاست کے لیے کام کر رہا تھا؟ سید صاحب قائد اعظم کو ایک منجھا ہوا وکیل اور ایک ہمہ جہت رہنما قرار دیتے ہیں جن کے ایک ایک کلمہ پر پاکستان کو لبیک کہنا چاہیے۔ اس حوالے سے سید عبداللہ کا محاکماتی اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''قائد اعظم پر یہ بہتان کہ وہ قیام پاکستان کے دوسرے روز ہی ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الااللہ'' سے دستبردار ہو گئے، یہ سراسر الزام ہے۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ پاکستان میں بسنے والے سب لوگ جو پاکستان کی آئیڈیالوجی کا احترام کرتے ہیں۔ شہری کی حیثیت سے برابر ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کہ کل تک ہندو مسلم کو دو قومیں کہہ رہے ہوں اور مطلب نکل جانے پر وہ خود ہی اپنے فلسفے سے انکار کر دیں۔ یہ قائد اعظم کے خلاف غرض مندانہ پروپیگنڈا ہے جو پاکستانی اقلیتوں کو اسلام پسند عوام سے بد ظن کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے اور اسی تشکیک سے ابھرا ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں کوئی غیر مسلم گروہ رہ نہیں سکتا۔''(۱۷۱)

اس اقتباس میں اپنے رہنما کی وکالت کا حق ادا کرتے ہوئے وہ اس سازش کو بے نقاب کرتے ہیں جو سادہ لوح پاکستانی عوام کو گمراہ کرنے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ ان جملوں کی بنت اور الفاظ سے سید عبداللہ کی قائد اعظم کے لیے دل بستگی، محبت

اور بے پناہ جذباتی لگاؤ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسی عقیدت و احترام وہ ہر جگہ برتتے ہیں جہاں ان کے محبوب قائد کا ذکر آتا ہے۔

پاکستانی کلچر کے حوالے سے سید عبد اللہ نے خاصا وقیع کام کیا ہے۔ اس موضوع پر بھی وہ قائد اعظم کے تصور مسلم ریاست کو پیش نظر رکھتے ہیں اور گاہ بہ گاہ ان کے خیالات اور فکر سے استفادہ کرتے ہیں۔ سید عبد اللہ بابائے قوم کے ثقافت زاویہ نگاہ کو ملحوظ رکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہندو مسلم ثقافت دو الگ چیزیں ہیں کیونکہ قائد اعظم روز اول سے ہی ہندو کو الگ اور مسلمان کو الگ قوم قرار دیتے ہیں لہذا مسلمانوں کی ثقافت ان کی اپنی معاشرت اور تمدن کی دین ہے۔ قائد اعظم نے فرمایا تھا:

> ''اسلام کے قومی تصور اور ہندو دھرم کے سماجی طور طریقوں کے باہم اختلاف کو محض وہم و گماں بتانا ہندوستان کی تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ ایک ہزار سال ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب ایک دوسرے سے دوچار رہی۔ یہ دونوں آپس میں میل جول رکھتی چلی آئیں مگر ان کے اختلافات اسی شدت سے موجود (رہے) ہیں۔''(۱۷۲)

مسلم اتحاد کے بارے میں سید عبد اللہ لکھتے ہیں کہ قائد اعظم کسی بھی خوش فہمی کا شکار نہ تھے۔ قائد جانتے تھے ہندو مسلم اتحاد کی مثال آگ اور پانی کی سی ہے۔ قائد اعظم کا ماننا یہ تھا کہ ایک ہزار سال اکٹھے رہ کر بھی اگر یہ دو قومیں مشترکات پر راضی نہیں ہوئیں تو آئندہ کے لیے امید رکھنا عبث ہے۔ ان دونوں قوموں کے حق میں بہتر یہی تھا کہ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں سکونت پذیر ہو جائیں اور اقلیتوں کا احترام کریں۔ قائد اعظم ہندو مسلم اتحاد کے نہ ہونے سے آگاہ تھے، اسی لیے انہوں نے الگ وطن کی تحریک کی سربراہی قبول کی۔ ان کے نزدیک پاکستان ہی ساری مصیبتوں اور جھمیلوں کا حل تھا۔ پاکستان، جہاں مسلمان اسلامی تعلیمات اور احکامات کو عملی طور پر آزمائیں، اسے اسلام کی ایک مضبوط تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ بنانا ان کا خواب تھا۔(۱۷۳)

سید عبد اللہ لکھتے ہیں کہ قائد اعظم نے ہندو مسلم فرق کے لیے خوب سے خوب مثالیں دیں۔ ان کی یہ مثال کہ مسلمانوں کے ہیرو ہندوؤں کے دشمن اور ہندوؤں کے ہیرو مسلمانوں کے دشمن بھی ایک کسوٹی کی مثال ہے۔ مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، احمد شاہ ہمارے ہیرو اور ہندوؤں کے دشمن ہیں۔ سید عبد اللہ قائد اعظم کی تقاریر اور دیگر اقوال کو بطور حوالہ بھی استعمال کرتے ہیں اور ان کی توضیح بھی کرتے چلے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عبد اللہ

بابائے قوم کو اپنا حقیقی رہنما اور محسن جانتے ہیں۔ سید صاحب قائد اعظم کو نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات اور ارشادات کو حقیقی رہنمائی کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔

سید عبداللہ قائد اعظم محمد علی جناح کی اردو سے محبت کو بھی ایک مثالی جذبہ قرار دیتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے بد گمان کرنے والوں نے یہ بھی پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ قائد اعظم اردو کے حق میں نہ تھے کیونکہ وہ اردو نہیں جانتے تھے۔ سید عبداللہ جو خود اردو زبان کے محافظ اور محبی تھے اس امر کی وضاحت اور صراحت بھی کرتے ہیں اور اپنے محبوب قائد اعظم کے لسانی شعور اور زبان کی افادیت اور مقام سے آگاہی کے لیے انہی کی تقاریر اور خطوط واقتباسات سے نظریہ زبان اردو سے آگاہی رکھتے ہیں۔ اردو کے باب میں بھی قائد اعظم محمد علی جناح کا نظریہ بالکل سادہ اور واضح تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی سرکاری اور دفتری زبان ہر صورت اردو ہی ہو گی۔ سید عبداللہ کے تصور زبان کے متعلق خاص طور پر بحث کرتے ہیں تاکہ عوام الناس کو قائد اعظم کے ویژن اور سوچ کے انداز سے آشنائی ہو سکے۔ دو اقتباس ملاحظہ کریں:

ا۔ ''اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا ہے تو سرکاری زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اردو اور صرف اردو ہے۔''(۱۷۴)

ب۔ ''میں آپ کو صاف طور پر بتادوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔ اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ در حقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ واحد سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو متحد رہ سکتی ہے اور نہ روبہ عمل۔ دوسرے ملکون کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی (قومی، سرکاری، دفتری) زبان اردو ہو گی۔''(۱۷۵)

قائد اعظم کا لسانی شعور وقت کے تقاضوں ہی سے ہم آہنگ تھا اور پاکستان کا مستقبل اردو کے ساتھ مضبوط و محفوظ معلوم ہوا۔ اس لیے ان کا اصرار تھا کہ اردو زبان کو پاکستان میں ہر صورت رائج کیا جائے اور لینگوا فرینکا کے طور پر اردو اپنا کردار ادا کرے۔ سید عبدللہ پاکستان کی دلیری اور صاف گوئی پر تبصرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

''قائد اعظم نے ۱۹۴۸ء میں بنگال جیسی صوبہ پرست سرزمین میں خود پہنچ کر زبان اردو کی قومی اور ملی حیثیت کا اعلان کیا اور اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا۔ آئینی اسمبلی (Constitutional Assembly) نے غیر مبہم انداز میں اردو کا حق اولیت تسلیم کیا۔''(۱۷۶)

سید عبد اللہ اردو زبان کے سرکاری اور دفتری استعمال کے طور پر رائج کرنے میں ناکامی ان کی بے وقت موت کو قرار دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ قانون ساز اسمبلیوں نے تینوں آئین میں اردو زبان کو سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر تسلیم کیا ہے وہ اسی قائد کے واضح حکم کا نتیجہ ہے۔ سید عبد اللہ قائد اعظم کے اس شعور اور دور اندیشی کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ جس میں قائد اعظم نے آنے والے دنوں میں قوم کے اس رجحان کو بھانپ لیا کہ مختلف صوبے اپنی لسانی اور علاقائی شناختوں میں خود کو بانٹ اور باندھ لیں گے۔ سید عبد اللہ کہتے ہیں کہ قائد اعظم کے دور میں مسلمانوں میں علاقائیت یا ایسا کوئی بھی تعصب معلوم نہ تھا لیکن قائد اعظم جانتے تھے کہ انگریز اور ہندو ضرور پاکستان کی جغرافیائی جڑوں کو کمزور کرنے لیے اہل وطن کو بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں، پنجابیوں، بلوچوں اور کشمیریوں میں بانٹیں گے۔ قائد اعظم کی بالیدہ فکری کا اندازہ اظہار ان کی ایک تقریر کا یہ جملہ کر رہا ہے:

> "اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں اور مسلمان و پاکستانی محض اتفاقیہ، تو جان لیجیے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"(۱۷۷)

یہ پیش گوئی وہی انسان کر سکتا ہے جو اپنی قوم کے مزاج اور ذہنی بلوغت سے کامل آگاہ ہو اور دوسری جانب اپنی قوم کے دشمن کی زیرکی اور سازشی ذہنیت کو بھی جانتا ہو کیونکہ ۱۹۷۱ء میں اسی سازش کا بھیانک نتیجہ نکلا اور آج بھی ہم علاقائی اور لسانی تعصب میں بٹے ہوئے ہیں۔ زبان، علاقہ اور نسلی بانٹ ہمارے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔

سید عبد اللہ قائد اعظم کو اپنا رہنما اور رہبر جانتے ہیں اور ان کی سوچ اور فہم سے ہی نہیں ان کے سیاسی تدبر سے بھی واقف ہیں۔ ان کے قائد اعظم سے دلی لگاؤ کے متعلق ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان بتاتے ہیں:

> "سید صاحب کو قائد اعظم کی ذات سے غیر معمولی لگاؤ تھا جس کا مظہر ان کی ذات سے بے لوث محبت اور عقیدت ہے جو ان کی کتابوں میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ قائد اعظم کے بارے میں ان کا خاص لگاؤ نام کی حد نہ تھا بلکہ انہوں نے قائد کی عادات حسنہ اور اصولوں کو زندگی بھر اپنائے رکھا۔ وقت کی پابندی، اصول پسندی، خوش لباسی جیسی عادات حسنہ انہوں نے اسی عظیم لیڈر سے لیں۔"(۱۷۸)

سید عبد اللہ اور قائد اعظم کے خیالات اور افکار میں ہم آہنگی اور مماثلت اسی وجہ سے ہے کہ سید صاحب قائد اعظم کے حقیقی پیروکار ہیں۔ ان کے افکار سے مستفیض ہوتے ہیں۔ دونوں کا مشن پاکستان کو مضبوط کرنا تھا۔ قائد اعظم کی محبت ان کے سارے تحریری سرمائے میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کتاب "پاکستان میں اردو" قائد اعظم محمد علی جناح کے

نام معنون ہے جو ان کی قائد سے محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ سید عبد اللہ اپنے مباحث میں جہاں بھی پاکستان اور اسلام کا ذکر آتا ہے وہ قائد اعظم کے اقوال اور ارشادات کو بلا تکلف بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ قائد اعظم کے افکار عالیہ کو سید عبد اللہ نے اپنے خیالات اور تجاویز میں دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

سید عبد اللہ کا نظریہ پاکستانی قومیت

سید عبد اللہ کا نظریہ قومیت سادہ اور واضح ہے۔ سید صاحب کے نظریہ قومیت کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ پاکستان اور پاکستانی قومیت کے باب میں حیات افروز خیالات کے مالک ہیں۔ سید عبد اللہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کی پائیداری کے لیے سچے پاکستانیوں کا پاکستان میں بسنا ضروری ہے۔ یہ سچے پاکستانی قائد اعظم کے عزائم اور اقبال افکار عالیہ سے آشنا ہوں اور اپنے حقیقی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ نیز یہ سچے پاکستانی ہی ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آنے والی اسلامی ریاست کو اسلام کا قلعہ اور اس قلعے کو اسلام کی تجربہ گاہ بنا سکتے ہیں۔ استعماری قوتوں اور پاکستان دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ سچے پاکستانیوں کے ہی طفیل پاکستان سلامت رہے گا اور پاکستانی قومیت کی افزائش بھی ہو گی۔

قومیت کے لیے عمومی طور پر نیشن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سید عبد اللہ اپنے ایک مضمون ''اقبال اور قومیت'' میں اس اصطلاح کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''نیشن یا قوم انسانوں کے کسی ایسے اجتماع کو کہتے ہیں جس میں وحدت کے کچھ جذباتی اور عقائداتی وجوہ موجود ہوں اور اس کے افراد نے ایک ہئیت اجتماعی کی صورت میں باہم مل کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس وحدت کے جذباتی احساس کے لیے عصبیت کا نام قومیت ہے۔''(۱۷۹)

ایک تعریف اس حوالے سے اور بھی ملاحظہ کیجیے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق:

> ''کسی علاقے میں آباد لوگ جو مشترکہ سیاسی اداروں کی بدولت متحد ہوں، علاقہ یا ملک، ایسے لوگوں کا گروہ جو ایک جیسی ملتی جلتی زبان بولتے ہوں اور جس کی عموماً ایک ہی نسل ہو۔''(۱۸۰)

قومیت کی تعریف کرتے ہوئے چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ لکھتے ہیں:

"عام طور پر قوم ایک ایسے پائیدار گروہ کا نام ہے جس کے ارتقا میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر اشتراکِ زبان و عقائد، اشتراک ارض، اشتراک معاش اور اشتراک اقدار پایا جاتا ہو۔" (۱۸۱)

قومیت کی مذکورہ تعریفیں قریب المفہوم ہیں اور قومیت کے تصور کو واضح بھی کر رہی ہیں۔ ان سب کے مطلب کو ادا کرنے والی جامع تعریف خود سید عبد اللہ نے کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"قوم (نیشن) ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں وحدت کے زیادہ سے زیادہ وجوہ موجود ہوتے ہیں۔ ساری قوم کا ایک نسل یا ایک مذہب ہونا ضروری نہیں البتہ ایک قوم کا بنیادی طور پر جغرافیہ ہونا چاہیے تاکہ ریاست قائم ہو سکے۔ دور جدید میں وہ اصول جو ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا کرتے ہیں۔ یہ ہیں: (۱) زبان (۲) کلچر (۳) مذہب (۴) نسل (۵) تاریخی پس منظر (۶) قدرت کی جغرافیائی حدیں اور معاشی مفادات کی وحدت شامل ہیں۔" (۱۸۲)

سید عبد اللہ کی یہ تعریف خاصی جامع اور مانع ہے۔ وہ قوم اور قومیت کے تصور میں خاصے واضح نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ ان کی قومیت کی تعریف ان کے تصور قومیت کی وضاحت کرتی ہے۔ سید عبد اللہ کے نزدیک:

ا۔ قومیت میں وحدت و شراکت سے بڑھ کر جذبات کی وابستگی اہم ہوتی ہے۔

ب۔ مذہبی اور اشتراک سے بڑھ کر جغرافیائی اساس زیادہ ضروری ہے۔

ج۔ قوم کے لیے ریاست لازمی جزو ہے۔

ان بنیادی نکات کے علاوہ دیگر سات اصول بھی بتا دیے جو ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا کرتے ہیں۔ قومیت کے مباحث میں سید صاحب پاکستانی قومیت کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۷۱۲ء میں وجود میں آنے والی اسلامی ریاست ۱۹۴۷ء تک کے سفر میں کئی مدوجزر دیکھتی ہے۔ عروج وزوال کی اس داستان میں جب انگریزوں کی چالیں جب حاکم کو محکوم بنا لیتی ہیں تو پھر متعصب ہندو اپنے من کا میل اور منتقم المزاجی کے سبب مسلمانوں پر باعزت زندگی گزارنے کے دروازے بند کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے تو باشعور مسلمان قوم جان جاتی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں ایک اقلیت بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ اپنی شناخت کی جنگ لڑی جائے اور ایک الگ ریاست حاصل کی جائے اور اپنی قومیت کو منوایا جائے اور محفوظ بھی کیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ مسلمانوں نے شناخت کھو جانے کا کوئی منظر ہندی تنازع کے دوران دیکھ لیا ہو یا تقسیم بنگال منسوخ کرانے کے لیے ہندوؤں کے دیوانہ وار احتجاج نے مسلمانوں کو جگا دیا ہو۔ یوں مسلمانوں کو

یقین ہو چلا کہ وہ ایک الگ قومیت ہیں۔ وہ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعرے سے فریب کھائے ہوئے تھے۔ اب وہ تحریک پاکستان کے علم تلے جمع تھے یعنی مفروضہ یہ تھا کہ ایک آزاد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں مسلمان آزادانہ طور پر اپنے دین کے مطابق زندگی گزاریں (۱۸۳)۔ اس ضمن میں مشہور سیاسی سائنسدان Keith Callard لکھتا ہے:

> "The demand for Pakistan and its realization are not to be understood unless it is cearly perceived that to the Muslims of India, Islam was more than a religion in the Western meaning. It was and it is an outlook upon life that embraced social, cultural and political aspects of human behavior. Islam has guidance to offer in the production and distribution of wealth in maintenance of social services in iternational relatives and in the structure of family life in public finance and proper position of the hands during paryers. "
> (۱۸۴)

کیتھ کلارڈ اسلامی قومیت کے حوالے سے بڑی واضح دلیل لاتا ہے کہ اسلام کے ماننے والے برصغیر میں ایک قومیت رکھتے تھے۔ دنیا میں قومیت کی اور بھی شرائط ہیں اور ہوں گی جبکہ مسلمان اپنے مذہبی حوالے سے الگ خصوصیت کے سبب قومیت کا دعویٰ رکھتے ہیں نیز اسلام کا معاشرت اور معیشت بھی اس قومیت کو دیگر قومیتوں سے جدا کرتا ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی قومیت کی واحد اساس دین برحق ہے یعنی کلمہ گو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دیگر فلسفوں میں قومیت کے لیے مذہب، زبان، کلچر، نسب، تاریخ، جغرافیہ اور جذباتی وحدت بھی قومیت کو تشکیل دیتی ہیں لیکن اسلام مذہب پر ہی اپنا سارا دارومدار رکھتا ہے۔ سید عبداللہ اس ضمن میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "اسلام کا تو ذکر ہی نہیں کیونکہ اس کا سارا تصور زندگی دینی ہے۔ اس میں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا موجود نہیں جس میں دین موجود نہ ہو۔ جو دین میں نہ ہو مگر خود مغرب میں بھی مذہب اور قومیت میں اتنا بعد نہیں کہ جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔" (۱۸۵)

بہ الفاظ دیگر سید عبد اللہ پاکستانی قوم کی شراکت دینی کو ہی قومیت کی اساس قرار دے رہے ہیں۔اسی لیے یہی شراکت دینی پاکستان کے وجود میں آنے کی وجہ بنی۔پاکستان کا تصور بھی اسی امکانی صورت کا نتیجہ ہے۔پاکستانی قومیت کی اساس ضرور دین پر ہے مگر پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی کیونکہ مذہبی آزادی کا حق دونوں کو حاصل ہے۔قائداعظم نے صاف صاف کہا تھا:

> ''عنقریب یہاں نہ ہندو، ہندو رہیں گے اور نہ مسلمان، مسلمان۔دین کے اعتبار سے نہیں۔اس لیے کہ وہ ہر شخص کا انفرادی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی مفہوم میں ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے۔ آپ پاکستان میں آزاد ہیں کہ مسجد جائیں یا مندر جائیں یا کسی بھی عبادت خانے میں جائیں۔سیاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ آپ کس مذہب یا نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۱۸۶)

سید عبد اللہ کا تصور قومیت بھی یہی ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔اقلیتوں کو مکمل چھوٹ حاصل ہوگی اور ان کو مذہب، معاشی ترقی اور دیگر شہریت کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔پاکستان بن جانے کے بعد کچھ برائے نام روشن خیال مفکرین نے یہ بحث شروع کی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے مگر محب وطن دانشوروں نے دلائل دے کر ان کے منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔ایسے گمراہ مفکرین نے قائداعظم کو بے دین اور آزاد خیال ثابت کرنے کے لیے ان کے اقوال کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور گمراہی پھیلانا چاہی۔سید عبد اللہ نے اس حوالے سے بڑا واضح موقف اختیار کیا اور کہا:

> ''ماحصل یہ ہے کہ قائداعظم نے علیحدہ ملک کا جو مطالبہ کیا اس کی بنیاد مذہب ہی تھی۔انہوں نے فرمایا کہ ہم پاکستان کو اسلامی عقیدوں کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ظاہر ہے کہ اس اس ارشاد کی رو سے تحریک پاکستان کی دینی بنیاد ثابت ہوتی ہے۔''(۱۸۷)

موضوع بحث کی جانب گریز کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اور پاکستان بننے تک ''مقامی قومیتوں'' کا مسئلہ بھی منظر عام پر نہ تھا۔لیکن قیام پاکستان کے ساتھ ہی ''مقامی قومیتوں'' نے بھی سر اٹھانا شروع کیا۔''مقامی قومیتوں'' سے مراد ایک قوم کے اندر مختلف اشتراک پر مبنی چھوٹے بڑے گروہوں کو بھی قومیتیں ہی کہا جاتا ہے جو درحقیقت ایک بڑی قوم کے اجزا اور حصوں کے طور پر موجود ہوتی ہیں۔۱۹۴۷ء میں بنگالی، سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچی اور کشمیری قومیتیں بھی موجود تھیں مذکورہ قومیتیں جغرافیائی حوالے سے ہیں۔اسی طرح لسانی اعتبار سے بھی ہیں مثلاً پشتون، ہندکووان، پنجابی، سرائیکی، براہوی، بلوچی، سندھی، بلتی، شینا، گوجری، پوٹھواری اور اردو مزید براں دینی اعتبار سے سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور

اہل حدیث وغیرہ بھی قومیتوں کی صورت میں سامنے آئیں۔ قومیتوں کی موجودگی اور شناخت کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں تاوقتیکہ کہ وہ اپنی حد اور تقاضوں میں تجاوز نہ کرنے لگیں، خود کو برتر اور دوسروں کو کم تر کی دوڑ میں نہ لگ جائیں۔ سید عبداللہ اس مسئلے سے آگاہ تھے اور کماحقہ آگاہ تھے:

> ''سب کو معلوم ہے کہ تحریک پاکستان میں قومیت کی واحد اساس اسلام بتائی گئی تھی مگر بدقسمتی سے اب اس ملک میں ایک نیا فتنہ ''قومیتوں'' کا اٹھا جس کا نعرہ یہ ہے کہ پاکستان ایک قوم کا وطن نہیں، کئی اقوام کا وطن ہے۔ ابتدا میں اس کے لیے معصوم زبان استعمال کی جاتی ہے مگر آہستہ آہستہ الگ قومی تشخص ابھرنے لگتا ہے۔ اب اسی علاقائیت کو زیادہ اور شدید منظم طور سے پیش کرنے کے لیے اسے قومیتوں کا نام دیا گیا۔''(۱۸۸)

قومیتوں کے مسائل میں عموماً ذاتی اغراض اور سیاسی مفادات کارفرما ہوتے ہیں۔ پاکستان میں قومیتوں کو فروغ دینے اور ان مسائل میں وطن عزیز کو جھونک دینے میں اہم کردار غیر ملکی ایجنسیوں کا ہے (۱۸۹) اور یہ بھی غلط نہیں کہ ہمارے اپنے کج فہم اور کم عقل رہنما بھی اپنے معمولی اور وقتی مفادات کے لیے ان علاقائی قومیتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ غرض اور لالچ کی پٹی بندھ جاتی ہے اور قومیتوں کو ہوا دے کر اپنے مطلب نکلواتے ہیں۔ علاقائی قومیتوں میں بعض اوقات حکومت کا غیر دانشمندانہ طرز یا انتظامی ڈھانچے کی کمزوری سے بھی مسائل جنم لیتے ہیں۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ قوم میں بالعموم اور پاکستانی قوم میں بالخصوص قومیتوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ اب اگر ایک سماجی گروہ یا قومیت بااختیار بن جائے یا اس کے تصرف میں وسائل حکومت تک رسائی آجائے تو بقول چوہدری چوہدری نیاز احمد سیکھیڑہ:

> ''کوئی گروہ (قومیت) حادثے کے سبب حکومت، سیاست، معیشت اور تعلیم، ذرائع ابلاغ پر مکمل غلبہ حاصل کرے اور دیگر قومیتوں اور سماجی گروہوں کے مفادات و تحفظات کو خیرباد کہہ کر پورے وفاقی ڈھانچے پر اپنی گرفت مضبوط کرلے تو نہ حقیقی قوم تشکیل پاسکتی ہے نہ مقامی قومیتوں میں اس کے شدید ردعمل کو روکا جاسکتا ہے۔''(۱۹۰)

خدانخواستہ ایسا اگر ہو جائے تو یہ صورت سنگین قرار دی جائے گی۔ ایسی صورت میں غلبہ پانے والی قومیت دیگر قومیتوں کی شناخت اور تشخص پر وار کرے گی اور خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔ صوبوں، نسلوں اور فرقوں کے بیچ منافرت اور مایوسی کی فضا پھیلے گی۔ عوام عدم تحفظ کا شکار ہوں گے۔ معاشرتی امن اور ملک کی ترقی کی راہیں مسدود ہوں گی۔ یک جہتی بے گانگی،

ایثار حرص، قربانی ہوس، غم خواری ستم کشی میں بدل دی جائے گی۔ معاشرہ اسلامی اور انسانی اقدار سے محروم ہو جائے گا اور بغض و عناد کا دور دورہ ہو گا۔ اس ساری صورتحال سے بچنے کے لیے سید عبداللہ کے پاس ایک قابل عمل لائحہ عمل ہے:

> ”اس سلسلے میں دو باتیں ایسی ہیں جن کی اہمیت کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ ایک ہے مفاداتی مفاہمت کی اہمیت و ضرورت اور دوسرا زبان کا مسئلہ۔ اگر پاکستان کو واحد ملک کے طور پر زندہ رہنا ہے تو اس میں شہریوں کے حقوق کا منصفانہ چارٹر بنانا اور اس پر عمل کرنا اشد ضروری ہے۔ اب رہا زبان کا مسئلہ تو اس کا حل آسان ہے اور ملک کی جو مسلمہ قومی زبان ہے لہٰذا سرکاری زبان کا درجہ صرف اسی زبان (اُردو) کو حاصل ہونا چاہیے اور یہ مصلحت ملکی کے عین مطابق ہے۔“(۱۹۱)

اس اقتباس سے دو باتیں منشرح ہوتی ہیں اول کہ پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ سنگین نوع کا نہیں۔ ان قومیتوں کو سہولت اور دانش مندی سے اسلامی طرز فکر سے روشناس کرا کے مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ان قومیتوں کو پاکستان اور اسلام کے تعلق سے تعارف کرانا اور باور کرانا ضروری ہے کہ پاکستان اور اسلام باہم مترادف ہیں۔ ایک سے محبت دوسرے سے محبت ہے۔ دوسری بات یہ کہ قومیتوں کے باہمی اتفاق سے اردو زبان کو دفتری سرکاری زبان قرار دیا جانا چاہیے۔ قومیتوں کے اس مسئلے پر میاں عبدالرشید کی رائے بھی قابل لحاظ ہے:

> ”ہمارے لیے پاکستانی قومیت کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا نہیں۔ پاکستان وہ سرزمین ہے جسے ہم اس دور میں اسلام کی تجربہ گاہ یا تختہ مشق کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان سے محبت ہی اسلام سے محبت کا ایک رُخ ہے۔ اسی طرح پاکستان سے بطور وطن محبت ہماری اسلام کی محبت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے کیونکہ قرن اول کے عربوں کی طرح ہم پاکستانی بھی اسلام کو اپنا قومی مقصد قرار دے چکے ہیں۔“(۱۹۲)

سید عبداللہ بھی میاں عبدالرشید کے ہم خیال ہیں۔ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ایک معقول معاشی نظام اور معقول نظام اصولیات (قانون) پاکستانی وحدت کا ضامن ہے۔ چھوٹے صوبوں اور پاکستانی قومیتوں کی زبان، مقامی ثقافت، لوک ورثہ، رسم و رواج اور اقدار عالیہ کو آزادانہ ماحول دیا جائے اور ساتھ ان کی نسل کی بقا اور بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی بھی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ علاقہ سے محبت علاقہ پرستی نہیں اور علاقہ پرستی مسلمان کے ایمان کا حصہ کبھی بھی نہیں بن سکتی لہٰذا مسلمانوں کی قومیتوں کو وفاق اعتماد میں لے اور ان کو ان کی مقامی زبان و کلچر کی ترقی اور بقا کی یقین دہانی کرائے۔ پھر کوئی بھی مفاد پرست ٹولہ پاکستان کی قومیتوں کے جذبات سے نہیں کھیل سکے گا۔ مقامی قومیتوں کے معاملے

سے نمٹنے کے لیے سید عبد اللہ ایک اور گر بھی بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ تعلیم اور نصاب کے ذریعے نئی نسل اور عوام کو پاکستان اور تحریک پاکستان سے تعارف کرایا جانا چاہیے اور یہ بتانا ضروری ہے کہ مدینتہ المنورہ کے بعد پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جو اسلام کے نام پر حاصل ہوئی اور اسلام کے قلعے کے طور پر خود کو منوائے گی۔ اسلام سے محبت پاکستان سے محبت ہے۔ سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> "استحکام پاکستان کے لیے قومیت (پاکستانی ہونے پر) فخر کرنے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اس یقین کامل کے ساتھ ساتھ اپنی قومیت پر فخر کرنا اور اس کے تحفظ کے لیے ہر قربانی کو تیار رہنا بھی لازمی ہے۔"(۱۹۳)

پاکستان اور اسلام ہی وہ قومیتیں ہیں جو پاکستان کی قومیتوں کو شیرازہ بند کر سکتی ہیں۔ سید عبد اللہ کا تصور قومیت توانا اور واضح ہے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ریاست کا فرض اولین ہے وہ تمام قومیتوں کے لیے یک جہتی، اتحاد اور یک رخی کے لیے کام کرے۔ دوم ریاست قومیتوں کے مابین مساوات کا برتاؤ رکھے اور معاشی عدل کو یقینی بنائے۔ قومیتوں کے خدشات اور توقعات پر پورا اترے اور قوم سازی کے عمل پر خاص دھیان رکھے نیز قومیتوں کے مابین تنازعات کو فوراً دور کرے اور باہمی مفاہمت اور فہم و تفہیم کی فضا کو برقرار رکھے۔ پاکستانی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی مضبوطی اور تحفظ انہی قومیتوں کے مابین اتفاق اور مہر و محبت ہی میں مضمر ہے۔ سید عبد اللہ سمجھتے ہیں کہ استحکام پاکستان کے لیے قومیت پر فخر کریں اور غیور اقوام کی طرح ذاتی غرض مندی سے باز رہا جائے۔ یہی ایک مہذب اور تہذیب یافتہ پاکستان کی ضمانت ہو گی۔

سید عبد اللہ اور پاکستانیت

سید عبد اللہ ایک محب وطن پاکستانی تھے۔ وہ تحریک پاکستان میں بھی رکن رہے تھے اور قائد اعظم محمد علی جناح کی تحریک پاکستان سے براہ راست مستفیض ہو چکے تھے۔ پاکستان بننے اور پاکستان بن جانے کے بعد کی قومی اور ملی ذمہ داریوں سے مکمل آگاہ تھے۔ سید صاحب پاکستان بن جانے کے بعد نئی ذمہ داریوں پر غور و حوض بھی کرتے رہتے تھے۔ وہ اس پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست اور علامہ اقبال کے خواب کے طور پر دیکھتے تھے۔ قائد کی تعبیر کو اب ہمیشہ اسلام کا قلعہ اور تجربہ

گاہ ہی رہنا چاہیے۔ اس حوالے سے سید عبداللہ نے پاکستانیت پر خاص توجہ دی۔ اب مضامین اور لیکچرز میں پاکستانیت پر زور دیا ہے۔ ان کے تصور پاکستانیت اور پاکستانی قومیت میں کوئی فرق نہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "ہمارے لیے قومیت اور پاکستانیت مترادف ہیں۔ یہ پاکستانیت صرف سیاست کے امور تک محدود نہیں، اس کا تعلق زندگی کے کل شعبوں سے ہے"۔(۱۹۴)

سید عبداللہ کے نزدیک پاکستانیت سے مراد وہ حوالہ ہے جو کسی بھی رسم ورواج، قدروریت، فیشن، طرز وانداز و عمل، فن پارے، ادب پارے اور تہوار اور پروگرام کو "پاکستانی" قرار دے۔ شلوار قمیض ہندوستان کا بے تکلف لباس ہے، شیروانی اور قراقلی، اس لباس کو پاکستانی لباس قرار دیں گی۔ اسی طرح وہ تمام اسلامی اقدار، تقاریب اور تہوار پاکستانیت کے حامل ہیں جن میں اسلامی رنگ نمایاں ہو یا وہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہوں مثلاً عید الفطر کے موقع پر سویاں، شیر خرما اور چناچاٹ کے ساتھ مقامی مٹھائیاں وغیرہ اس تہوار کو پاکستانیت سے رنگ دے گا۔ اسی طرح عید میلاد لنبی جس طرح پاکستان میں منایا جارہا ہے، اس طرح کسی اور جگہ نہیں منایا جاتا لہذا یہ بھی پاکستانیت کا حوالہ ہے۔ اسی طرح دیگر مقامی عرس میلے ٹھیلے اور تہواروں کا رنگ ڈھنگ پاکستانیت کا علمبردار ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "میں کلچر کے معاملے میں وسیع النظری کا قائل ہوں۔ مگر یہ دل سے یہ چاہتا ہوں کہ پاکستانیت بھی کسی نہ کسی شکل میں ترقی پذیر ہو اور دنیا میں پاکستان کی انفرادیت تسلیم ہو۔ اس کی تعمیر کرنے اور مفاہمت کے اصول متعین کرنے سے یہ مشکل یقیناً رفع ہو جائے گی۔"(۱۹۵)

سید عبداللہ کا خیال راست ہے کہ پاکستانیت کو فروغ دینا اور اس کے لیے خلوص نیت سے منصوبہ بندی کرنا، اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہماری قومیت کے درخت کا پھل یہی پاکستانیت ہے۔ پاکستان کی موسیقی، ادب، لوک ادب، ذرائع ابلاغ، میڈیا اور ورثہ اس بات کا متقاضی ہو گا کہ اس کو الگ اور نئی شناخت ملے جو پاکستانی ہو اور یوں پاکستانیت کا عنصر بخوبی نمایاں ہو۔ افضل حق قرشی بتاتے ہیں:

> "پاکستانیت سے مراد پاکستان کا رنگ اور پاکستان کی جھلک ہر جگہ اور ہر شے میں دکھائی دے۔ ادب ہو کہ موسیقی، شاعری ہو کہ ڈراما یا فلم، کھانے پکانے کا فن ہو یا رسم و رواج، شادی ہو یا میلے اور عرس، فن تعمیر ہو کہ فن باغبانی، بنکاری ہو کہ صنعت کاری غرض ہر شعبے میں پاکستان کا رنگ اور پاکستان کی جھلک یعنی پاکستانیت موجود ہو۔"(۱۹۶)

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانیت سے مراد وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ہم پاکستان میں نشوو نما پانے والی اقدار، رسومات و رواجات، ادب و شاعری، مجلسی زندگی، معاشرتی نظام کے اختلاف سے دیگر معاشروں سے مختلف قرار پائیں۔ معلوم حقیقت ہے کہ اسلامی اقدار نے تو سارے جہاں میں نشوو نما پائی اور ہر ملک کی تہذیب و تمدن و ثقافت اپنی مقامیت کی وجہ سے دوسرے خطوں سے الگ پہچان رکھتی ہیں۔ سید عبد اللہ پاکستانیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"پاکستانی ادب (دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی) میں خالص پاکستانی عناصر موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم اتنے واضح اور قوی نہیں جتنے دنیا کے بعض دوسرے ممالک ہیں۔ لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ پاکستان کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ اتنے تھوڑے عرصے میں منفرد نقوش کا پختہ ہونا دشوار ہے۔" (۱۹۷)

پاکستانیت کے آثار اور نشانیاں زندگی کے مختلف شعبوں میں دکھائی دے رہی ہیں۔ مثلاً "پاکستانی اردو" ہی کو دیکھ لیں۔ آزادی کے بعد ایک طویل اور مثبت سفر طے کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمود الرحمان:

"ہم پاکستان کے مقامی الفاظ و محاورات کو کیوں نہ استعمال کریں اور اردو کے بدلتے ہوئے خدوخال کو مزید تاب و توانائی کیوں نہ عطا کریں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ زبان ایک ایسی جوئے بار کی حیثیت رکھتی ہے جو مختلف مراحل سے گزرتی ہے اور اپنے دامن میں جملہ ثقافتی، لسانی اور جغرافیائی عناصر کو سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ یہی حال اردو زبان کا ہے۔ اس کے خدوخال بدلتے جائیں گے۔ آج یہ زبان ویسی نہیں جیسی میر و غالب کے زمانے میں تھی۔ (پاکستانی اردو میں بدل گئی ہے)۔" (۱۹۸)

اب جو رنگ اردو روز مرہ اور محاورہ میں پاکستانی علاقوں میں بولے جانے کی وجہ سے عود کر آیا ہے اس کے لیے "پاکستانی اردو" کی اصطلاح مقبول ہو رہی ہے۔ پاکستانیت کے اثرات کی اہم دلیل یہ ہے کہ معاشرتی اقدار جو جنم لیتی ہیں ان کا سرچشمہ اس خاص معاشرے کے عقائد ہوتے ہیں اور ان عقائد کے پیروکاروں کے ہاں ان عقائد کے مطابق اثرات ان کی اقدار پر پڑتے ہیں جیسے پاکستانی معاشرے میں سود حرام ہے تو سودی کاروبار نہ پروان چڑھے گا اور اس کے کرنے والا مطعون ہوں گے اور اس سے دور رہنے والے باعزت ہوں گے۔ اس بات کو سید عبد اللہ نے نہایت سہولت سے یوں بیان کیا ہے:

"معاشرتی اخلاق کی بنیاد بھی چند اصولوں پر ہے اور یہ اصول چند عقیدوں سے ابھرتے ہیں۔ یہ اور بات کے ان عقیدوں کی نہاد روحانی نہیں عقلی اور تمدنی اور رتجرباتی ہے۔" (۱۹۹)

عقیدوں کے اثرات نیک و بد روحانی، عقلی، تمدنی اور تجرباتی ہوتے ہیں اور انہی اثرات کے نتیجے میں ایک معاشرے کی پہچان دوسرے سے الگ ہوتی جاتی ہے۔ پاکستانیت کے اثرات یوں معاشرتی اور ثقافتی اقدار پر مثبت ہوں گے کہ پاکستان سے وابستہ اشیا اور حوالے پاکستانی بنت کی مہر رکھیں گے۔

سید عبداللہ نے اپنی کتاب "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر" میں "ادب اور پاکستانیت" کے حوالے سے ایک پورا باب باندھا ہے جہاں انہوں نے ادب میں پاکستانیت کی اہمیت اور افادیت کو بالخصوص برتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ادب میں پاکستانیت کے چلن کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔ ایسا کرنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ پاکستانیت کے ادب میں چلن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "میں پاکستانی ادب کا انہی معنوں میں قائل ہوں اور چاہتا ہوں کہ پاکستانیت ایک مسلک بن کر باقی شعبوں کی طرح فضائے ادب پر بھی چھا جائے اور میری تو آرزو ہے کہ یہ پاکستانیت ہماری زندگی کا ایک بنیادی ذوق بن جائے۔ یہاں تک کہ پاکستانی فضاؤں پر تیرنے والا بادل بھی اگر پاکستانی بادل کہلانے لگے تو بڑا ہی مزا آجائے۔"(۲۰۰)

دوسرے لفظوں میں سید عبداللہ نے یہ تصور پاکستانیت دیا کہ پاکستان اور پاکستان کا عکس اہل پاکستان اور متعلقات پاکستان کی زندگی، سوچوں اور عمل میں ہویدا ہو یعنی پاکستان میں پاکستانی بنک کاری، پاکستانی ثقافت، پاکستانی موسیقی، پاکستانی نثر و شاعری، پاکستانی تحقیق و تنقید، پاکستانی فکشن، پاکستانی ڈرامے اور فلم، شادی بیاہ، پاکستانی لباس، پاکستانی میڈیا، پاکستانی نظام تعلیم کی اصطلاحات اور سوچ و فکر میں پاکستانیت کا رنگ دکھائی دے۔ اس تصور کا بہت خاص اور اہم پہلو سید عبداللہ یہ بتاتے ہیں کہ پاکستانیت کا مقصد و مطلب بھارت دشمنی ہر گز نہیں۔ یہ ایک مثبت جذبہ ہے جو حب الوطنی کے عظیم اور پاک جذبے کو متحرک کرتا ہے۔ اس کا کوئی منفی زاویہ نہیں۔ ہندوستان سے سیاسی معاملات میں اتار چڑھاؤ الگ شے ہے لیکن پاکستانیت کا جذبہ بھارت سے مخاصمت کو بڑھاوا ہر گز نہیں دیتا۔ اگر کسی بھی مخاصمت یا نفرت کو اس جذبے سے تحریک یا اشتعال ملے تو پھر وہ جذبہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن پاکستانیت ہر گز نہیں۔ سید عبداللہ اس ضمن میں واضح موقف اختیار کرتے ہیں:

> "پاکستانیت کی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے معنی بھارت سے نفرت نہیں۔ ہمارا بھارت سے سیاسی جھگڑا ہو سکتا ہے مگر ہم اس حقیقیت کو فراموش نہ کریں گے ۔۔۔۔۔ اپنے حقوق و مفادات پر اصرار ضرور کریں۔"(۲۰۱)

سید عبداللہ بھارت سے مخاصمت، بھارتی کلچر کی تقلید، بھارتی ادیبوں اور شاعروں کے ہندی روایتوں کے استعمال سے روکتے ہیں۔ سید عبداللہ ایک مثبت انداز میں پاکستانیت کو اپنی موجودہ اور آنے والی نسل میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ سید عبداللہ ایک محب وطن اور محب قوم شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدیں محفوظ کرنے کے لیے وقف کیا اور اہل پاکستان کو پاکستان سے محبت کرنے کا سلیقہ اور شعور دیا۔ اپنی ثقافت اوراپنے معاشرتی نظام کو بہتر بنانے کے لیے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پاک وطن اسلام کا قلعہ بنے اور اسلامی عقائد کی تجربہ گاہ، اس لیے وہ ساری عمر اس کے استحکام اور فعالیت کے لیے زبان و قلم دونوں سے جہاد کرتے رہیں۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین کا تبصرہ بر محل معلوم ہوتا ہے:

> ''ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت کا نمایاں عنصر ان کی اسلام اور پاکستان سے محبت ہے۔ ان کے ہاں شروع ہی سے اخذ و اکتساب عمل جاری وساری رہا۔ وہ تاریخ و ثقافت اور تحریکات و شخصیات سے استفادہ کرتے رہے اور اپنے شعور کی لو کو بڑھاتے رہے۔ آخر ان کو وہ منزل مل گئی جسے مذہب کی روشنی اور وطن کی محبت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک پاکستانیت اسلامیت کا مقامی نقش ہے۔ عملی لحاظ سے پاکستانیت کا مطلب پاکستان سے محبت ہو گا۔'' (۲۰۲)

ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا بالکل درست ہے۔ سید عبداللہ نے واقعی پاکستان سے محبت کی ہے اور یہ محبت نصف صدی کا قصہ ہے۔ پاکستان کی تحریک میں وہ شامل تھے۔ قائد اعظم کے ساتھ مسلم لیگ کے جلسوں میں شامل رہے۔ وہ اس مملکت خداداد کی قدرو قیمت جانتے تھے لہذا وہ اس وطن کو مضبوط و محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے پاکستان اور اردو کے لیے خوب محنت اور کوشش کی اور نیک نام بھی کمایا اور پاکستانیت کے سبق کو نہایت اخلاص سے اپنی قوم تک پہنچانے کی سعی بھی کی۔ پاکستانیت کو وہ اہل پاکستان کا زیور جانتے ہیں اور ان کے خیال میں ہر وہ پاکستانی جو اس وطن کی بہتری اور فلاح کے لیے کام کرے گا وہ در حقیقت پاکستان کی پہچان اور اور تشخص کو مامون کر رہا ہو گا اسی محنت اور کوشش سے پاکستانیت کا شجر ثمر بار ہو گا اور اسی ثمر سے اہل پاکستان کے ولوں میں اس وطن عزیز کے لیے محبت اور وابستگی جنم لے گی جس کی مدد سے پاکستان دنیا میں معزز تو ہو گا ہی اس کی قیادت اور سیادت بھی محکم و مستحکم ہو گی۔ یہی منزل پاکستان کی خلق کی وجہ اور سبب تھی۔

سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت

سید عبداللہ ایک اسلامی فکر کے حامل مفکر تھے اور ان کے ہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے تصورات ملتے ہیں اور خاص کر وہ ہندوستان میں اسلام کی عظمت رفتہ کے متعلق الگ انداز میں غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی اسلامی حکومت کے خاتمہ پر افسردہ اور فکر مند ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں مسلمانان ہند اپنی وہ بالا دستی اور برتری دوبارہ حاصل کریں اور یہ کہ اسلام کا بول بالا ہو جائے۔ اس حوالے سے وہ ایک نظریہ پیش کرتے ہیں جس کو وہ نظریہ بازیافت اور کہیں جذبہ بازیافت کہتے ہیں۔ سید عبداللہ کا یہ نظریہ بازیافت ان کی کتاب ''پاکستان تعبیر و تعمیر'' میں ملتا ہے۔ بازیافت کے لفظی معنی نوراللغات میں حصول، تعمیر نو، تلافی کرنا اور واپس لینے کے ہیں(۲۰۳)۔ اس نظریہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے سید عبداللہ خود بتاتے ہیں:

> ''تحریک بازیافت یا جذبہ بازیافت سے مراد یہ ہے کہ زوال سلطنت (ہند) اور خاتمہ حکومت کے بعد بھی تمام مسلمانوں کے دل میں کسی نہ کسی شکل میں یہ جذبہ موجزن رہا ہے کہ کھوئی ہوئی سلطنت کو پھر سے حاصل کیا جائے۔ بیسویں صدی میں جب کانگرس نے آزادی کی تحریک کو زیادہ منظم کیا اور مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ اس میں شریک ہو گیا تو اس وقت بھی عام مسلمان اندر سے بازیافت کے جذبے سے ہی سرشار تھے۔''(۲۰۴)

سید عبداللہ کی مراد یہ ہے کہ ہندوستان جو مسلمانوں کا مفتوحہ علاقہ تھا جہاں ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور پھر ایک طویل تاریخ ہے جہاں مسلمانوں نے سارے ہندوستان پر حکومت کی۔ اس حکومت نے اس سرزمین کو اپنی فیوض و برکات سے نوازا۔ اسلامی حکومتوں نے جہاں اپنے تمدن اور ثقافت کو پروان چڑھایا، وہیں ہندو کی تہذیب و معاشرت میں بھی نکھار پیدا کیا۔ شعر و ادب کی اسلامی روایات میں ہندو کے مذاق پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ مسلمانوں کی برصغیر میں آمد اور ہندو کے ساتھ رہن سہن اور ان کی زندگی، فلسفہ، علم، عبادات غرض ہر پہلو پر اسلامی اثرات مرتب کیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد مسلمان ہو گئی اور جو مسلمان نہیں ہوئے ان کی زندگی پر اسلامی اثرات کسی تعارف و تلاش کے محتاج نہیں۔ اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ سید عبداللہ چاہتے ہیں کہ مسلمان پھر سے یہ سب کھویا ہوا حاصل کر لیں، ہندوؤں کے ساتھ رہنے لگیں، ان کے مذہب اور زندگی پر اثر انداز

ہوں۔ان کی سوچ اور فکر کو اسلامی اثرات سے متاثر کریں ، ان کو زندگی کے مزید اسلامی رنگ دیں ۔ہندو کو اسلامی، شعری اور نثری اسالیب سے روشناس کرائیں۔ مسلمانوں کی میراث پورا ہندوستان تھا اور اب مسلمان ایک بہت بڑے حصے سے محروم رہ گئے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پورے ہندوستان کو اپنا ملک سمجھیں اور اس کی بازیافت کے لیے کوشش اور محنت کریں۔ اب بعد میں اپنے نظریہ بازیافت کے متعلق لکھتے ہیں کہ بازیافت کا یہ نظریہ قائد اعظم محمد علی جناح کے ذہن میں بھی تھا کیونکہ قائد اعظم وقتاً فوقتاً اپنے اس نظریے کے متعلق براہ راست نہ سہی لیکن مختلف اوقات میں اس کا اظہار کیا ہے۔ جب میں نے ان اقتباسات کو ایک خاص حوالے سے ملا کر دیکھا تو مجھے نظریہ بازیافت کے مکمل پروگرام سے تعارف ہوا:

> ''اگر قائد کے بیانات کے ساتھ دوسری عبارات کو ملا کر پڑھا جائے تو ہم فوراً بازیابی کے اس مکمل پروگرام کا سراغ لگا سکتے ہیں جو قائد اعظم کے ذہن میں تھا۔ صاف نظر آجائے گا کہ پاکستان بازیابی کا مرحلہ اول ہے۔ سیاسی طور سے پاکستان کی سرحدیں کچھ بھی ہوں، برصغیر میں اسلام کا ایک مستقبل ہے جس کی نوعیت اگر ماضی میں سیاسی تھی تو آئندہ ادوار میں روحانی و فکری ہو سکتی ہے۔''(۲۰۵)

سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے کہ قائد اعظم کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مسلمان سارے ہندوستان کے مالک اور مختار تھے گو کہ اب ہندوستان میں ایک علاقے تک محدود ہو گئے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کا حق سارے ہندوستان پر ہے۔ قائد اعظم کی تقاریر میں ایسا کوئی اقتباس نہیں ملتا جس میں قائد اعظم نے پورے ہندوستان میں سیاسی یا روحانی و فکری ریاست یا عمل داری کا دعویٰ کیا ہو۔ اس ضمن میں سید عبد اللہ قائد اعظم کی ایک تقریر سے اقتباس پیش کرتے ہیں:

> ''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کا جواز کیا تھا۔ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی نہ ہندوؤں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''(۲۰۶)

اس اقتباس پر سید عبد اللہ یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''غور کرنے سے ہر شخص پر عیاں ہو سکتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ محدود مقاصد کے لیے نہ تھا بلکہ ان وسیع تر مقاصد کے لیے تھا جو ہر مسلمان کا دین و ایمان ہے یعنی کلمہ توحید کی وسیع تر اشاعت اور یہ وہی شے ہے جسے میں اپنی تقریروں اور تحریروں میں بازیافت کا بازیابی کہتا ہوں۔''(۲۰۷)

سید عبداللہ کی اپنے نظریہ بازیافت بارے یہ توجیہہ وتوضیح کچھ خاص متاثر کن نہیں اور وہ حوالہ جات بھی اس پس منظر میں بامعنی اور بامطلب معلوم نہیں ہو رہے۔ البتہ نظریہ بازیافت ایک وقیع اور وسیع زاویہ فکر ضرور ہے۔

نظریہ بازیافت سے مراد یہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان سے لاتعلقی اختیار نہیں کرنی بلکہ وہاں پر پاکستان کی آبادی سے زیادہ مسلمان بھی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ رشتہ ملت کی استواری بحال رکھنی ہے اور سب سے اہم بازیابی کی صورت سید عبداللہ کے نزدیک یہ ہے کہ سیاسی حوالے کو چھوڑ کر پاکستانی مسلمانوں نے ایسے قد کاٹھ، اپنے کردار کی مضبوطی، اپنے ایمان کی پاسداری قول و فعل میں ہم آہنگی، اسلامی اقدار کی پرداخت اور قانون الٰہی کی حکمرانی سے ہندوستان کے عام آدمی کو متاثر کرنا ہے۔ ذات پات کے مارے ہندو کو اپنے معاشرے میں معاشرتی مساوات، معاشی عدل، امن و پیار کی جھلک دکھانی ہے۔ یوں وہ عام ہندو اسلام کی آفاقیت سے متاثر ہوگا اور وہ دین برحق کے دائرے میں داخل ہوگا۔ یہ روحانی جنگ جب فتح سے ہمکنار ہوگی تو سارا ہندوستان مسلمانوں کا ہو جائے گا۔ سید عبداللہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''پاکستان کے سیاسی سمجھوتے کے بعد طے شدہ سیاسی حد بندی کا احترام کرنے کے پابند ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ سیاسی سمجھوتے کا احترام کریں جو قائد اعظم اور کانگرس کے درمیان طے پایا۔ لیکن اس حد بندی میں کلمہ توحید اور روحانی افکار کی اشاعت پر پابندی کیوں ہو؟''(۲۰۸)

یعنی بالفاظ دیگر سید عبداللہ کی تبلیغ و ترویج سے سارے ہندوستان کو بازیاب کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ واشگاف الفاظ میں بازیافت کے لیے ہر قسم کی جارحیت اور لڑائی کو رد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، بقول ڈاکٹر احسان الحق:

> ''سید صاحب کا نظریہ بازیابی ایک ایسا منصوبہ ہے جو اسلامی تاریخ میں ہزارہا مثالیں رکھتا ہے۔ بازیاب یہ کرنا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے کردار سے غیر مسلم یعنی ہندو متاثر ہوں جیسے کہ ہمارے ادوار میں صوفیا اور اولیا نے اپنی تعلیم اور سیرت کے اثرات حسنہ سے غیر مسلموں کو دین اسلام میں داخل کیا۔ تلوار و توپ اسلام کی اشاعت کے لیے بالکل استعمال نہیں ہوئیں بلکہ بزرگان دین کی خانقاہوں، درگاہوں اور زیارات سے اسلام نے مشرک دلوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ سید عبداللہ آج بھی اسی برتاؤ اور نمائش ایمان کا تقاضا کرتے ہیں اور یوں ہندوؤں کے دل جیت کر ہندوستان پر حکومت کی جائے۔ یہی نظریہ بازیافت ہے۔''(۲۰۹)

سید عبداللہ اس تحریک کو روحانی اور فکری تحریک کے طور پر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے مشائخ، صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بہت کام کیا ہے۔ جن میں نظام الدین اولیا، خواجہ معین الدین چشتی، بہاء الدین زکریا، بو علی قلندر پانی پتی اور سلطان باہو جیسے سیکڑوں نام ہیں۔ سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت ہمہ جہت نظر یہ ہے گو وہ اس کی حدود کا تعین نہیں کرتے ہیں۔ وہ اس نظریے کو ایک مسلک کی طرح مجاہد آزادی کے لیے آزاد اور لچکدار رکھنے کے لیے اس کی تفصیلی جزئیات بیان نہیں کیں تاکہ جو مجاہد نظریہ بازیابی کے جس پہلو پر جس انداز سے چاہے جہاد کرے۔ اس کے ہاتھ کھلے ہوں۔ مثلاً سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت سوشل ورکر کے لیے بھی ہے، عمرانی مصلح کے لیے ہے، ادیب یا شاعر کے لیے بھی ہے، ایک مبلغ اسلام اور داعی امن کے لیے بھی ہے، ایک معاشی، معاشرتی اور عمرانی سائنسدان کے لیے بھی ہے۔ ان کا نظریہ دعوت فکر و عمل رکھتا ہے یعنی آپ جس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اسی شعبے میں اسلامی اقدار کی ترویج اور اسلامی تعلیمات کو ہمسایوں بالخصوص ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو منتقل کریں۔ اس ضمن میں قائد اعظم محمد علی جناح کا ایک قول بھی مشعل راہ بن سکتا ہے:

> ”قائد اعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ ہندوؤں کا بھی ہم پر حق ہے اور یہ حق دو طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ ہم اپنی مملکت میں ان کے حقوق کی حفاظت کریں، دوسرا یہ کہ ہم انہیں ان تعلیمات سے روشناس کرائیں جو عدل و مساوات اور اخوت پر مبنی ہیں۔ اس لیے بازیابی کے تصور کو اپنے دل میں مستحکم کرنا ہوگا۔“(۲۱۰)

غرض سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت یہ ہے کہ ہم نے پاکستان لے لیا مگر پاکستان کے علاوہ باقی ماندہ ہندوستان بھی سارے کا سارا ہمارے اسلاف کا ملک تھا۔ درہ خیبر سے لے کر راس کماری تک ہماری یعنی مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ یہ لازمی ہے کہ وہ باقی ماندہ ہندوستان پر بھی روحانی فتح حاصل کریں اور دوبارہ سارے ہندوستان پر اسلام کا پرچم لہرایا جائے مگر جارحیت کے بجائے محبت اور انسان دوستی کے اصولوں سے فتح حاصل کرنی ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ”میرے تصور بازیافت کے معنی سیاسی کشور کشائی نہیں۔ میں کچھ اس طرح سوچتا ہوں جس طرح حضرت داتا گنج بخش، حضرت معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا اور شاہ گیسو دراز سوچتے تھے۔ میرا تصور (بازیافت) روحانی اور پیغامی ہونی چاہیے۔ محبت کی اور دکھوں سے ہمدردی کی، دردمندی کے اس جذبے کو زندہ رکھنا اور پورے ہندوستان کو محبت سے مسخر کرنا اس جذبہ بازیافت کا حصہ ہے۔ اس لحاظ سے پورا ہندوستان ہمارا ہے مگر فی الحال ہم نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔“(۲۱۱)

سید عبد اللہ کے اس اقتباس سے جو پیغام ملتا ہے وہ یہ ہے کہ سارے ہندوستان کو سیاسی ہتھکنڈوں یا حربی لحاظ سے نہیں بلکہ مذہبی رواداری اور روحانی طاقت سے مسلمانوں کو حاصل کرنا ہے۔ ہندوؤں کے دلوں کو اسلام کے عدل وانصاف، ذات پات سے چھٹکارا اور برابری کے حقوق سے جیتنا ہے۔ غربت و افلاس اور کسمپرسی کے مارے طبقوں کو اسلام کی روشنی سے کی طرف متوجہ کرنا ہے اور یہی بازیابی ہے، مسلمانوں کو اللہ کا تفویض کردہ فریضہ ہے لیکن سید صاحب ہندوستان والوں کے دلوں کو فتح کرنے کے لیے ان کے غموں، تفکرات اور ان کی روحانی مدد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس بازیافت میں غصہ، نفرت، طعنہ زنی نہیں بلکہ عاجزی، ملنساری، خوش اخلاقی، بھائی بندی اور رواداری مسلمانوں کے ہتھیار قرار دیتے ہیں۔

تحریک یا نظریہ بازیافت کا فلسفہ سید عبد اللہ کے زرخیز ذہن اور حب اسلام کا منطقی و معروضی نتیجہ ہے۔ سید عبد اللہ کے ہاں پاکستان اور اسلام کی ایسی ہی عملی صورتیں ملتی ہیں۔ سید صاحب ایک خوشحال پاکستان کے خواہاں ہیں۔ وہ پاکستان کا قائد اعظم اور علامہ اقبال کی آرزوؤں کا مظہر جانتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ پاکستان کو مسلمانوں کی تمناؤں اور امید کا محور بھی سمجھتے ہیں۔ نہ ان مسلمانوں کا جو اس مملکت میں آباد نہیں بلکہ مسلمانان عالم بھی پاکستان سے امیدیں رکھتے ہیں۔ پاکستان صرف برصغیر کے مسلمانوں کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اس کا مقصد ''مدینتہ المنورہ'' کی نظریاتی ریاست کی بازیابی بھی ہے، پاکستان اسلام کی تجربہ گاہ اور قلعہ بھی ہے۔ جہاں مغربی فلاسفہ اور طرز ہائے حکومت کے درمیان اللہ کی حکومت قائم ہونی ہے۔ پاکستان کے وجود سے ایک تقویت ان کروڑوں مسلمانوں کے لیے بھی ہے جو تحریک آزادی کا حصہ بنے، قربانیاں دیں لیکن ہندوستان میں ہی مقیم ہیں۔ اس آزاد وطن کا ان کو براہ راست فائدہ نہیں ہوا۔ اب پاکستان نے ان کے تشخص، ان پاکستانیوں کی بقا، افزائش نسل کی ذمہ داری براہ راست پاکستان اور اہل پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ سید عبد اللہ کا جذبۂ بازیافت ان ہندوستانی مسلمانوں کی بقا کا ضامن بھی بنتا ہے اور ان کے مفادات اور حقوق کا محافظ بھی ہے۔ یہ تحریک ان غیر ملکی مسلمانوں کے مفادات کے لیے عالمی اور اخلاقی سطح پر بھی تحفظ کو یقینی بنائے گی۔ سید عبد اللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگر ہندو کے مسلمان ہو جانے سے پاکستان وجود میں آسکتا ہے تو کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی کیا اس امر کا ثبوت نہیں ایک مکمل پاکستان ادھر (ہندوستان میں) ہے۔ مگر اس دوسرے حصے میں بھی ایک نیم پاکستان ہے جس میں صداقت کی شمعیں روشن ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عارضی طور سے ان شمعوں پر تاریکی کے غلاف چڑھے ہیں اور روشنی مدہم مدہم نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے

> تاریکیوں کے پردے جلد تار تار ہو جائیں گے اور وہ نیم پاکستان ایک بار پھر مکمل پاکستان بن جائے گا۔ لیکن میں سیاسی سطح کی بات نہیں کر رہا، فکری اور روحانی سطح کا ذکر کر رہا ہوں۔" (۲۱۲)

سید عبد اللہ ان کروڑوں مسلمانوں کا ذکر کر رہے ہیں جو ہندوستان مین ہی رہ گئے ہیں اور ان کے ذہن اور روحانی رشتے اور جذبے پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ وہ وہاں مسجدوں کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ سید عبد اللہ کا تصور بازیافت یہی کہہ رہاہے کہ ان مسلمانوں کو بھائی سمجھا جائے اور غیر مذاہب کے لوگوں کو روحانی اور فکری طور پر اسلام کی آفاقیت اور سچائی کا قائل کیا جائے۔ کردار کی پختگی اور عظمت سے ان کے دل جیتنا ہوں گے اور یوں اسلام کی سچی اور مضبوط برداری مین ان کو شامل کر کے ہندوستان کو پاکستان بنالیناہی بازیافت ہو گی۔

نظریہ بازیافت ایک متحرک تصور ہے جس میں وہ مسلمانوں کو پیغام دے رہے ہیں۔ اول یہ کہ ہندوستان کو اسلام کی تبلیغ اور اسلامی فکر سے فتح کریں اور اولیائے کرام کے مسلک کو اپنا کر ان کی انسان دوستی اور وسیع المشربی سے اپنے کردار کو پختہ بنائیں۔ غرض بازیافت کا تصور دو دھاری تصویر ہے جس کا مقصد اولیٰ تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیناہے اور مسلمان فرد کے کردار کو اسلامیانا اور دین کی تہذیب اقدار سے سجاناہے اور اس مسلمان کے مخاطب "نیم پاکستان" یعنی ہندوستان کے ذات پات میں جکڑے اور چھوت چھات کے مارے ہوئے ہندو ہیں جن کو معاشی مساوات، معاشرتی عدل اوراسلامی تمدن و ثقافت کی اعلیٰ اقدار کے عملی نمونے پاکستانی سرزمین پر بطور ماڈل دکھائے جائیں تاکہ ان کو اپنی گھٹن زدہ اور تنگ نظر معاشرت سے موازنے کا موقع ملے اور روحانی آسودگی کے لیے وہ دائرہ اسلام میں آئیں اور جب یہ عمل شروع ہو گا تو مسلمانوں کی اپنی ریاست اور ماضی کی حکمرانی کی بازیابی تو ہو گی ہی، کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کو اقلیت کی حیثیت سے چھٹکارا ملے گا اور عظیم مسلمان برادری تشکیل پائے گی۔

سید عبد اللہ کا نظریہ آزادی

ڈاکٹر سید عبد اللہ پاکستان اور متعلقات پاکستان کے بارے میں ایک جامع اور وقیع شعور رکھنے والے دانشور ہیں۔ سید عبد اللہ نے پاکستان کو ایک وسیع پس منظر اور پیش منظر میں دیکھتے ہیں جہاں اس خطہ ارض کا واحد مقصد ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہرگز نہیں تھا اور نہ یہ ارض پاک انگریزوں کی کسی سازش یا ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کا جواب تھا بلکہ

پاکستان کا مطالبہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس نے اپنے وقت پر ظاہر ہونا ہی تھا کیوں کہ اسلام نے اپنی ریاست بہر طور قائم کرنی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح اس اٹل حقیقت سے آگاہ تھے جیسے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

"آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔"(۲۱۳)

اسلام کا بنیادی مطالبہ سے مراد یہی ہے کہ اسلام اپنے لیے ایک الگ ریاست کا متقاضی تھا جیسے مکہ کے مسلمانوں نے مدینہ ہجرت کی اور یوں پہلی اسلامی ریاست کی بناڈالی گئی۔ اصول یہ ہے کہ دین اسلام کو ایک ریاست کی ضرورت ہے جہاں وہ بطور ضابطہ حیات اپنے نظام کو نافذ العمل کرے۔ اسی لیے قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے تھے۔ جس کا منطقی ظہور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ سید عبداللہ بھی اس سچائی کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کا قیام حادثاتی ہر گز نہیں۔ پاکستان نظریہ اسلام کا منطقی نتیجہ اور مسلمان قوم کے مطالبے کا جواب تھا کیونکہ ہندوستان میں دو قومیں آباد تھیں۔ اس حوالے سے نواب بہادر یار جنگ نے اپنی تقریر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کہا تھا:

"قائداعظم نے جس وقت لیگ کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی، ہمارے دماغوں میں مختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے۔ برادران وطن نے بہ انداز دوستی ہم کو یقین دلایا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں۔ یہ احساس کمتری ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں سرایت کر گیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے بتلایا کہ ہم اقلیت نہیں ہیں۔ دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلا سکتی "تم ایک قوم ہو، مستقل قوم، جس کا قوام، اقوام عالم سے بالکل مختلف اور جدا ہے اور جس کی بنیاد و ترتیب، جغرافیہ، نسل ورنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔"(۲۱۴)

قائداعظم نے اس قوم کو یقین دلایا کہ ہندوستان میں موجود مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ ایک ایسی قوم جو ہندوؤں سے کامل طور پر مختلف اور جدا ہے۔ ان دونوں کی آپس میں کوئی قدر مشترک نہیں لہٰذا ان کا متحدہ ہندوستان میں اکھٹے رہنا دیوانے کے خواب سے بڑھ کر نہیں۔ سید عبداللہ نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے افکار سے اپنے نظام فکر میں خاصا استفادہ کیا۔ اقبال کو تو سید عبداللہ اپنا فکری پیشوا تسلیم کرتے ہیں اور اقبال کے خواب پاکستان کی تعبیر و تعمیر کے لیے خاصا مستند کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تین کتابیں "پاکستان۔ تعبیر و تعمیر"، "ادب وفن" اور "کلچر کا مسئلہ" پاکستان کے اور پاکستان کی کامل آزادی کی بقا کے لیے ہی لکھی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ پاکستان کے قیام کو مشن کی تکمیل نہیں سمجھتے ان کا خیال ہے کہ پاکستان کی آزادی اور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا قیام پاکستان کا اصل مقصد ہے۔ اس کے لیے اہل پاکستان کو کام کرنا ہے۔ سید عبد اللہ کا نظریہ آزادی در حقیقت پاکستان کی شناخت اور بقا کے لیے کام کرنا ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ پاکستان ایک زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک نظریہ اور فکر کا علمبردار ہے۔ اس وطن کو مکمل آزادی سے ہمکنار کرنا ہے تو پھر اس کے لیے اس کی الگ اسلامی طرز کی معاشی تنظیم کرنا ہو گی، یہاں کے باسیوں کو اپنی زندگیوں اور ثقافت میں اسلام اور پاکستانیت کو اپنانا ہو گا۔ پاکستان کو اپنی جداگانہ شناخت کے لیے ہر شعبہ زندگی میں اپنی انفرادیت کا اہتمام کرنا ہو گا اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ”پاکستان اب بن چکا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی بقا کے لیے جس قسم کی قومی شخصیت کی ضرورت ہے اور جس قسم کے جذبے اور عقلی اور روحانی رویے مطلوب ہیں اس کے لحاظ سے ہماری قوم کو ابھی بڑی منظم اور مؤثر تربیت کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سیاسی لحاظ سے تو قوم بن چکے ہیں مگر ذہنی اور عمل کے اعتبار سے ہم ابھی تک خام اور ناقص ہیں۔“(۲۱۵)

یہ اقتباس سید عبد اللہ کے نظریہ بقائے آزادی پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں آزادیِ پاکستان کی بقا چاہتے ہیں ہیں لیکن یہ بقا و تحفظ یا سلامتی صرف لفظی نہیں عملی اقدامات کی متقاضی ہے۔ سید عبد اللہ پاکستان میں موجود جم غفیر کو ایک قوم بنانے کے خواہش مند ہیں۔ قومیت کے اس احساس کو ہی وہ حقیقی منشور پاکستان قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کا بن جانا مشن کی تکمیل نہیں بلکہ مشن کا آغاز ہے۔ سید عبد اللہ پاکستان کے معرض وجود میں آجانے کے بعد اس آزادی کی بقا کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں تاکہ وطن عزیز ان امیدوں پر پورا اتر سکے جو اکابرین نے اس سے وابستہ کی تھیں نیز پاکستان واقعی اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔(۲۱۶) سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

> ”میری رائے میں یہ نظریہ پاکستان عبارت ہے اول اس عقیدے سے کہ پاکستان دو قومی تصور کا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ دوم یہ کہ مسلمانوں کی قومیت فقط اسلام ہے یعنی نسل، رنگ اور زبان نہیں عقیدہ اسلام ہے۔ لہٰذا پاکستان کی قومیت اسلام ہے۔ سوم، مسلمان چونکہ ایک منفرد قوم ہیں۔ اس لیے ان کی معاشرت، تہذیب اور اخلاقیات بھی منفرد ہے اور پاکستان میں اس کی وسیع تر نمائندہ ترجمان زبان اردو ہے۔ چہارم اس قوم کو بھارت کی ہزار سالہ تاریخ نے ایک تاریخی شعور دیا ہے۔ چنانچہ اس کے جملہ احوال کی تعبیر اس تاریخی شعور کے حوالے سے ہونی چاہیے اور اس کی ایک منطقی اور عملی تعبیر ظہور پاکستان ہے۔“(۲۱۷)

اس اقتباس سے سید عبد اللہ کا نظریہ آزادی نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے کہ اگر پاکستان اپنے ساتھ وابستہ آرزوؤں اور امیدوں کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے باسی ان چار پہلوؤں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں:

الف۔ دو قومی نظریہ　　ب۔ پاکستانیت یا اسلامی قومیت　　ج۔ پاکستانی ثقافت　　د۔ اردو زبان

یہی چار عناصر تخلیق پاکستان کے محرک بھی تھے اور یہی چار عناصر تکمیل پاکستان یعنی آزادی پاکستان کی بقا کے ضامن بھی ہیں۔ سید عبد اللہ کا نظریہ آزادی ان چار عناصر پر مشتمل ہے۔ وہ پاکستان کو آزاد اور بہبود یافتہ مملکت دیکھنے کے آرزو مند ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان عناصر کو بااہتمام فروغ دیا جائے اور پاکستان علامہ اقبال کی منشا کی ریاست بنے اور قائد اعظم کی تجربہ گاہ بن جائے۔

بحث کو اپنے منطقی انجام تک لے جاتے ہوئے کہنا پڑے گا کہ سید عبد اللہ کا نظریہ آزادی ان عوامل اور فکری پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو پاکستان کی آزادی کو استحکام بخشتے ہیں۔ سید صاحب پاکستان کو حقیقی طور پر آزاد دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ اس آزادی کے لیے وہ مذکورہ چار عناصر کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ یہ آفاقی اصول ہے کہ قوم اپنے عقائد اور فکری تسلسل کو مستحکم کرنے کے لیے آزادی کی بقا اور عناصر قومیت پر ترجیحی بنیادوں پر غور کرتی ہے۔ ان عناصر کی پرداخت اور نگہداشت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ پاکستان کو بھی ان عناصر پر خصوصی توجہ دینی ہوگی تب پاکستان اس منصب پر فائز ہو پائے گا جو علامہ اقبال اور قائد اعظم کے پیش نظر تھا۔ سید عبد اللہ پاکستان کی آزادی کے دوام اور بقا کے مذکورہ بالا عناصر کی سنجیدہ نگہداشت پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ ریاستی اداروں کو بھی اس مہم میں استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ تعلیم کا شعبہ، وکلا، مدارس، صحافی، پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے کام کرے اور حکومت ان کی سرپرستی کرے۔ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے عوامی رائے ہموار کرے۔ اپنے ثقافتی و تہذیبی حوالوں کو اعتبار بخشنے کے لیے کام کرے اور دانشوروں اور ادبا و شعرا کو اس ضمن میں خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میڈیا، ادب اور تعلیم کے ذریعے پاکستانیت کا شعور عام کیا جائے۔ اردو زبان کا تعارف اس انداز میں کرایا جائے کہ اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کا روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی حوالہ بھی ہے۔ اس کو آئینی، قومی اور سرکاری زبان بھی قرار دیا جانا چاہیے تاکہ پاکستان کی آزادی مستحکم ہو سکے۔ سید عبد اللہ کے اس نظریہ آزادی کی روشنی میں پاکستان اور اہل پاکستان کو اپنی شناخت کے ان پہلوؤں پر کامل توجہ کرنی چاہیے تاکہ ملک خداداد اپنے اصل مقام اور اپنے ساتھ جڑی امیدوں پر پورا اترے اور ملت اسلامیہ کی امامت کی ذمہ داری انجام دینے کا اہل قرار پائے۔

سید عبد اللہ کا نثری سرمایہ اعلیٰ نثری اوصاف اور ان کی منفرد حب الوطنی یعنی پاکستانی عناصر کا حامل ہے۔ سید صاحب کے ہاں عظیم پاکستانی قوم کا خواب، پاکستانیت کے حوالے سے تشخص کی آرزو اور سب سے بڑھ کر اردو زبان کے نفاذ کا منصوبہ موجود ہے۔ سید عبد اللہ کا اصرار ہے کہ ۱۹۴۷ء میں وطن حاصل ہونے کے بعد ادبا اور شعرا کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ سب اپنی قومیت، قائد اعظم کے مشن اور پاکستانیت کو نہایت ذمہ داری کے ساتھ اپنے ہاں برتنا ہو گا تا کہ پاکستان میں وجود میں آنے والا ادبی سرمایہ ایک مشن اور مقصد کے ساتھ ساتھ لطف اور تسکین کے لیے کام آئے۔ سید عبد اللہ کی نثر میں پاکستانی عناصر کا مطالعہ اور اس سے حاصل شدہ نتائج ان کے سرمایۂ نثر کو امتیازِ خاص سے نوازتے ہیں اور نئے آنے والے ادیبوں اور شعرا، نئے معیائیر اور فکر کے نئے اسالیب اور تدبر و تفکر کے نئے در وا کرتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ اس شعبے کے ساتھ وابستہ لوگوں کو وہ مواقع بھی فراہم کرتے ہیں جن پر چل کر ایک بلند پایہ، آفاقیت کی صفت سے متصف اور پاکستانیت کا حامل ادبی سرمایہ تخلیق ہو۔ نیز اہل ادب ان خطوط کو خصوص سے پیش نظر رکھیں جن سے پاکستان کی اصل شناخت اور اس کی حقیقی منزل کا حصول ممکن ہو۔ اہل ادبا اور شعرا کا ہمیشہ سے یہ وظیفہ رہا ہے کہ وہ عظیم مقاصد کے لیے اور اپنی قوم کو ایک جگہ جمع کرنے اور حریت اور غیرت کے جذبے کو اجاگر کرنے کے لیے کام کرتے ہیں ہیں اسی لیے سید عبد اللہ کا ماننا ہے عہد حاضر کے پاکستانی قلم کاروں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے کہ سید عبد اللہ کی نثر میں پاکستانی عناصر ان کے جذبہ حب الوطنی کے عکاس ہیں اور ایک محب وطن پاکستانی ادیب کے ہاں ان عناصر کا پختہ شعور اور سلیقہ اور اس کی تعمیر و تشکیل کے حوالے سے ایک بالیدہ مطمح نظر رکھتے ہیں۔ وہ پاکستان کی محبت اور پاکستان کی بات کو ادب کا ایک لازمی عنصر سمجھتے ہیں اور پاکستانیت کے پرچارک ہیں۔ برصغیر میں اسلامی ہر روایت کو وہ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستانی قرار دیتے ہیں اور مسلمان قوم کی پہچان جانتے ہیں۔ سید عبد اللہ کا ایک اور معتبر حوالہ ان کی اردو کے لیے حب ہے۔ مولوی عبد الحق کے بعد وہ نہایت اخلاص اور فرزانگی سے نفاذ اردو کے لیے متحرک رہے۔ اردو کو پاکستان کی آئینی، سرکاری، دفتری اور قومی زبان بنانے کے عازم تھے۔ اس کام کے لیے انہوں نے جہاد بالقلم ولسان کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ سید عبد اللہ کی نثر کے مطالعے سے ان کا معتدل نظریہ قومیت، پاکستانیت کا تصور اور نظریۂ بازیافت سے تعارف ہوتا ہے۔ نظریۂ قومیت میں وہ پاکستان کے نظریہ اور دو قومی نظریہ کی وضاحت کے ساتھ آنے والی نسلوں کو آشنا کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ بازیافت یہ ہے کہ ۷۱۲ء میں بننے والی اسلامی ریاست جو ۱۸۵۷ء تک قائم ودائم رہی، اس کو بازیاب کرنا پاکستانی قوم کا فریضہ ہے۔ اس ضمن میں وہ مبلغین اسلام

کے بعد ادبا اور شعرا کو ایسا ادب تخلیق کرنے کی صلاح دیتے ہیں جو ہندوستان کے ذاتوں میں بٹے معاشرے، عدم انصاف و مساوات کے مارے عوام اور غربت زدہ لوگوں کے زخموں کا مرہم بنے اور وہ اسلام اور امن کی طرف آئیں اور یوں برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت بازیاب ہو۔

حوالہ جات

۱)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، محمود برادرز راولپنڈی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۳
۲)چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۳
۳)ڈاکٹر سرفراز حسین، قیام پاکستان کے حقیقی اسباب، نظریہ پاکستان لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱
۴)مولانا عبد الستار خان نیازی، پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا، مجاہد ملت فاؤنڈیشن قصور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۳
۵)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۲۴
۶)میاں عبد الرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات، دانش گاہ پنجاب، پاکستان لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰۱
۷)ڈاکٹر احسان الحق، انٹرویو، غازی کوٹ ٹاؤن شپ، مانسہرہ، ۲۱ جنوری، ۲۰۱۸ء
۸) قائداعظم محمد علی جناح، تقریر، مشمولہ نظریہ پاکستان اور قرآن از ڈاکٹر انعام الحق، نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۲
۹)صفدر حسن صدیقی، پاکستان کی تعمیر نو، نگارشات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲
۱۰) نسیم حسن شاہ، قول، مشمولہ، نظریہ پاکستان، سید واجد رضوی، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱
۱۲)مفتاح الدین ظفر، تاریخ پاکستان، عزیز پبلشرز لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰
۱۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، مکتبہ خیابان لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۷
۱۴)مظفر مہدی ہاشمی، پاکستان کی نظریاتی اساس، کاروانِ ادب لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸۱
۱۵) قائداعظم، قول، مشمولہ، نظریہ پاکستان، از سید واجد رضوی، ص ۳۸
۱۶)چوہدری چوہدری نیاز احمد سیگھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، ص ۲۶
۱۷) عطش درانی، پاکستان، ایک نظریہ ایک تحریک، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۴
۱۸) عشرت رحمانی، پاکستان سے پاکستان تک، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۱۱۹
۱۹) کرامت علی خان، محرکات تحریک پاکستان، غالب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۲۸۶
۲۰)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مولف، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۵۰

۲۱)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۴۷

۲۲)عطش درانی، پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۳۲

۲۳)ڈاکٹر سید عبداللہ، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۸۲

۲۴)پروفیسر صادق زاہد، ڈاکٹر سید عبداللہ، بحیثیت محقق و نقاد، سحر پبلشرز لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۵

۲۵)ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، انٹرویو، بقہ مانسہرہ، بتاریخ ۲۲ دسمبر ۲۰۱۷ء

۲۶)ڈاکٹر سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱، ص ۸۱

۲۷)ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، انٹرویو، بقہ مانسہرہ، ۲۲ دسمبر ۲۰۱۷ء

۲۸)شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۸۱

۲۹)مفتاح الدین ظفر، تاریخ پاکستان، ص ۴۹

۳۰)لالہ ہر دیال، قول، مشمولہ پاکستانی ثقافت کی تشکیل از وحید عشرت، پاکستان فلسفہ اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴۷

۳۱۔)سوامی ستیادیو، تقریر، مشمولہ، پاکستانی ثقافت کی تشکیل از وحید عشرت، ص ۴۸

۳۲)ڈاکٹر قاضی سلطان، انٹرویو، شعبہ پاک سٹڈی، ایبٹ آباد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، ۲۳ دسمبر ۲۰۱۷ء

۳۳)ڈاکٹر سرفراز حسین، قیام پاکستان کے حقیقی اسباب، ص ۷۷

۳۴)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۰۱

۳۵)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۰

۳۶)فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸

۳۷)سید عبداللہ، کلچر، کا مسئلہ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۳۸)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستان کا کلچر، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

۳۹)منشی عبدالرحمان، مضمون، اسلامی ثقافت کا مسئلہ، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت مرتب عطش درانی، شاخ زریں لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۶

۴۰)رسالہ تہذیب الاخلاق، مضمون تہذیب اور اس کی تعریف، مضامین سرسید مرتبہ حامد حسن قادری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۴۴

۴۱)فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۱۴

۴۲)ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادب اور ادبی قدریں، ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳

۴۳)شان الحق حقی، نقد و نگارش، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۳

۴۴)ڈاکٹر سلیم اختر، ادب اور کلچر، مکتبہ عالیہ لاہور، س۔ن، ص ۲۰۰

۴۵)ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، اسلامی ثقافت، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، س ن، ص ۴۲

۴۶)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۳۴

۴۷)محمد مارماڈیوک پکتھال، مضمون اسلامی ثقافت، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت مرتبہ عطش درانی شاخ زریں لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳

۴۸)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۱۱۳

۴۹)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۱۲۶۔۱۲۴

۵۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۱۱

۵۱)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۱۱۳

۵۲)خورشید احمد ندیم، اسلام اور پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۳۷

۵۳)ڈاکٹر محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ڈائریکٹر پبلی کیشنز ممبی، ۱۹۷۵، ص ۱۵

۵۴)منشی عبد الرحمان، مضمون، اسلامی ثقافت کا مسئلہ، اسلامی تہذیب و ثقافت از عطش درانی، ص ۳۷

۵۵)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۷۰

۵۶)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۶۷

۵۷)عبد الماجد دریابادی، تاریخ تصوف، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۶ء، ص ۱۵

۵۸)وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، ص ۴۳

۵۹)ڈاکٹر سلیم فارانی، مضمون، اسلامی ثقافت کے خدوخال، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت مرتبہ عطش درانی شاخ زریں لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۸

۶۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، مضمون، اسلامی تہذیب، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت از عطش درانی شاخ زریں لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵

۶۱)سورۃ بنی اسرائیل، آیت ۹، پارہ ۱۵، تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۵۶

۶۲)سورۃ البقرا،نمبر شمارا آیت ۲،پارہ اول،ص ۱۲۲

۶۳)مفتی سعید عبد اللہ،انٹرویو،رہائش گاہ،ڈب نمبر امانسہرہ،۲۵جولائی۲۰۱۸

۶۴)ڈاکٹر نصیر احمد ناصر،اسلامی ثقافت،فیروز سنز لمیٹڈ لاہور،س ن،ص ۶۰

۶۵)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ،ص ۳۸

۶۶)ڈاکٹر نور اللہ،انٹرویو،شعبہ اردو،ایبٹ آباد پبلک سکول ایبٹ آباد،۶مارچ۲۰۱۸ء

۶۷)سورۃ النجم(۵۳)،آیت نمبر ۳۔۴،پارہ۲۷،ص ۹۴۴

۶۸)سورۃ آل عمران،نمبر شمار ۳،آیت ۱۶۴،پارہ،۳،ص ۱۲۶

۶۹)محمد رحیم بخش شاہین،عہد رسالت اور خلاف،مشمولہ،اسلامی تہذیب و ثقافت مرتبہ عطش درانی،شاخ زریں،لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۳۔۱

۷۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ،ص ۳۶

۷۱)ڈاکٹر احسان الحق،انٹرویو،غازی کوٹ ٹاؤن شپ مانسہرہ،۱۱ستمبر،۲۰۱۷ء

۷۲)ڈاکٹر محمد اشرف کمال،اصطلاحات،بک ٹائم لاہور،۲۰۱۸ء،ص ۴۶

۷۳)مولانا سید ممتاز علی شاہ،اشاریہ مضامین قرآن(اول)،الفیصل ناشران و تاجران لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۳۲۱

۷۴)سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ،ص ۱۴۰

۷۵)پروفیسر حمید احمد خان، تعلیم و تہذیب،(خطبات) مجلس ترقی ادب لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۳۲۱

۷۶)پروفیسر عزیز احمد،برصغیر میں اسلامی جدیدیت،ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،۲۰۱۵ء،ص ۹۴

۷۷)مفتی سعید عبد اللہ،انٹرویو،رہائش ڈب نمبر ا،مانسہرہ،۲۵جولائی۲۰۱۷ء

۷۸)وحید عشرت،اسلامی تہذیب و ثقافت،ص ۹۰

۷۹)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ،ص ۱۸۱

۸۰)پروفیسر رشید الدین خان،مسلم ذہن کی تشکیل،مشمولہ مذہب،مسلمان اور سیکولرازم از ڈاکٹر اشفاق محمد خان،نگارشت لاہور،۱۹۹۶ء،ص ۱۹۴

۸۱)شیخ محمد اکرام،رود کوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،۲۰۰۱ء،ص ۲۱

۸۲)رحیم بخش شاہین، مضمون، عہد رسالت اور خلافت راشدہ، مشمولہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، ص ۱۱۲

۸۳)سورۃ طٰہٰ، نمبر شمار ۲۰، پارہ ۱۶، آیت نمبر ۱۱۶، اعزاز الدین پرنٹرز لاہور، ص ۴۱۶

۸۴)سورۃ الشعرا، نمبر شمار ۲۶، پارہ ۱۹، آیت ۱۷، ص ۴۸۹

۸۵)ڈاکٹر مشتاق گورایا، مضمون، اسلامی تہذیب کی آئینہ بندی، مشمولہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، ص ۵۹

۸۶)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۱۷

۸۷)محمد حسین ہیکل، حیات محمدؐ، یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور، ص ۴۰۶

۸۸)ڈاکٹر محمد عبد اللہ، اسوہ رسول اکرمؐ، چوہدری بک ڈپو، جہلم، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۴

۸۹)آل عمران، سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر ۱۵۹، پارہ ۳، ص ۳۰۱

۹۰)سورۃ الاعراف، نمبر شمار ۷، آیت نمبر ۱۵۵، پارہ ۹، ص ۳۰۳

۹۱)رحیم بخش شاہین، مضمون، عہد رسالت اور خلافت راشدہ، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت از عطش درانی، ص ۱۰۹

۹۲)وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، ص ۹۰

۹۳)مفتی سعید عبد اللہ، انٹرویو، رہائش گاہ ڈب نمبر ا، مانسہرہ، ۲۵ جولائی، ۲۰۱۷ء

۹۴)شان الحق حقی، نقد و نگارش، ص ۱۴۶

۹۵)سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۳۷

۹۶)سید عبد اللہ، ایضاً ص ۴۰

۹۷) قاضی عتیق الرحمان، انٹرویو، پرنسپل، سرسید ماڈل پبلک سکول ہری پور، بتاریخ ۵ مئی ۲۰۱۷ء

۹۸) شمیم احمد، ۲+۲=۵، قلات پریس کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، ص ۵۱

۹۹) قاضی محمد سلطان محمود، انٹرویو، شعبہ پاکستان سٹڈیز، ۲۳ دسمبر، ۲۰۱۷ء

۱۰۰)ڈاکٹر علامہ اقبال، مکتوب، مشمولہ پاکستان کی نظریاتی بنیاد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۷۱

۱۰۱)منور ابن صادق، مضمون، معاشرت و سیاست کے چند بنیادی پہلو، مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت، عطش درانی، ص ۶۶

۱۰۲)سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۵۔۱

۱۰۳)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۱۸۴

۱۰۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۲۱

۱۰۵)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۵۶

۱۰۶)ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص۱۵۸

۱۰۷)ڈاکٹر غلام علی الانا، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص۵۰

۱۰۸)ڈاکٹر قاضی سلطان، انٹرویو، ۲۳دسمبر، ۲۰۱۷ء

۱۰۹)عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایت، رائل بک کمپنی کراچی، ۲۰۱۰ء، ص۱۳

۱۱۰)ابو الاعجاز صدیقی، کشاف تنقیدی اصلاحات، ص۱۳۷

۱۱۱)ڈاکٹر جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص۱۳۶

۱۱۲)وزیر آغا، کلچر کے خد و خال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۱۰۰

۱۱۳)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۲۶

۱۱۴)پروفیسر صادق زاہد، عظیم صوفیائے کرام، دارالشعور لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۵۹۹

۱۱۵)عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایت، ص۷۰

۱۱۶)ڈاکٹر اعجاز راہی، تاریخ خطاطی، ادارہ ثقافت پاکستان لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۱۰۱

۱۱۷)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۲۷

۱۱۸)عباس عالم، مضمون، فن خطاطی، مسلمانوں کا عظیم ورثہ، مشمولہ ماہنامہ اخبار اردو، خصوصی شمارہ فن خطاطی، دسمبر، جنوری ۲۰۱۸ء، ص۹

۱۱۹)عارفہ فرید، پاکستانی کلچر کی روایات، ص۷۵

۱۲۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، پاکستان کی تعبیر و تعمیر، ص۱۱۰

۱۲۱)فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص۳۶

۱۲۲)سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۱۳

۱۲۳)شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۴

۱۲۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۱۳

۱۲۵)محمد مارماڈیوک، پکتھال، مضمون، اسلامی ثقافت کا مفہوم، ص۱۴

۱۲۶)وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، ص ۹۴،۹۳

۱۲۷)فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۲۷

۱۲۸)وحید عشرت، پاکستانی ثقافت کی تشکیل، ص ۹۲،۹۱

۱۲۹)سر سید احمد خان، مقالات سر سید (حصہ چہارم)، تالیف و ترتیب، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۷

۱۳۰)میاں عبد الرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ص ۱۱۹

۱۳۱)سید عبد اللہ، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۱

۱۳۲)پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اردو ادب و زبان کی تاریخ، ادبیات ایبٹ آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۱۳۳)سید عبد اللہ، قول، مشمولہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، از ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷۔۴۸

۱۳۴)ڈاکٹر سلیم اختر، اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۷

۱۳۵)سید واجد رضوی، نظریہ پاکستان، ص ۳۴

۱۳۶)خواجہ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۱

۱۳۷)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، ص ۵۰

۱۳۸)ڈاکٹر عبادت بریلوی، قول، مضمون، ڈاکٹر سید عبد اللہ، بابائے اردو تحریک پاکستان، مشمولہ، اخبار اردو، جلد ۲۵، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۶

۱۳۹)ناصر سوری، مضمون، انجمن ترقی اردو پاکستان کا تعارفی خلاصہ، مشمولہ اخبار اردو، جلد ۳۵، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۷ء

۱۴۰)شاہد احمد دہلوی، مولوی عبد الحق، رسالہ افکار، جلد ۳۰، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۰

۱۴۱) قائد اعظم، قول، مشمولہ قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل، از ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۷

۱۴۲) قائد اعظم محمد علی جناح، تقریر، اخبار اردو، جلد ۲۴، شمارہ ۹۰، اکتوبر، ۲۰۰۷ء، ص ۶

۱۴۳) محمد اسلام نشتر، مضمون ڈاکٹر سید عبد اللہ، بابائے اردو تحریک پاکستان، اخبار اردو، جلد ۲۴، شمارہ ۹۰، اکتوبر، ۲۰۰۷ء ص ۶

۱۴۴)ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۷۷
۱۴۵)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، ص ۵۷
۱۴۶)سید عبد اللہ، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷
۱۴۷)ڈاکٹر سید عبد اللہ، ، تحریک نفاذ اردو، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۴
۱۴۸)محمد اسلام نشتر، مضمون، ڈاکٹر سید عبد اللہ، بابائے اردو اور تحریک نفاذ اردو پاکستان، اخبار اردو، ص ۵
۱۴۹)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، پیش لفظ، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، ص ۹
۱۵۰)ڈاکٹر سید عبد اللہ، تحریک نفاذ اردو، ص ۱۲۶
۱۵۱)ڈاکٹر احسان الحق، انٹرویو، رہائش گاہ غازی کوٹ، مانسہرہ، بتاریخ ۷ اکتوبر، ۲۰۱۷ء
۱۵۲)پروفیسر صادق زاہد، سید عبد اللہ: بحیثیت محقق اور نقاد، ص ۱۵۹
۱۵۳)سید عبد اللہ، تحریک نفاذِ اردو، ص ۲۴۲
۱۵۴)ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، دو پاکستان، ادارہ علم و فن پشاور، س ن، ص ۹۳
۱۵۵)ڈاکٹر وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۴
۱۵۶)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات، ص ۱۱۷
۱۵۷)ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ، ایضاً، ص ۱۲۰
۱۵۸)پروفیسر بشیر احمد سوز، ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ، ص ۱۸۱
۱۵۹)سید عبد اللہ، پاکستان کی تعبیر و تعمیر، ص ۲۶۳
۱۶۰)نواب بہادر یار جنگ، منشور پاکستان، بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴
۱۶۱)سید عبد اللہ، پاکستان کی تعبیر و تعمیر، ص ۱۶
۱۶۲)عطش درانی، پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک، ص ۱۱
۱۶۳)ڈاکٹر صفدر محمود، اقبال، جناح اور پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۴
۱۶۴)ڈاکٹر صفدر محمود، ایضاً، ص ۳۵
۱۶۵)Dictionary of Politics، آکسفرڈ پریس لندن، ۲۰۱۲ء، ص ۷۷۴
۱۶۶)محمد شریف بقا، قائد اعظم کے اسلامی افکار، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۰

۱٦۷)Owen Bennet Jones Pakistan (Eyes of Storm)،ویلفیئر یونیورسٹی پریس لندن،۱۹۹۹ء، ص ۲۲۱

۱٦۸)سعید الدین اختر،Idealogy of Pakistan،NIHC قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد،۲۰۰۰ء، ص ۲۵

۱٦۹)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۱

۱۷۰) قائد اعظم، تقریر، مشمولہ، پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک، از عطش درانی، ص ۳۰

۱۷۱)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۱۹۹

۱۷۲) قائد اعظم، تقریر، مشمولہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۷۴

۱۷۳)ائیر مارشل اصغر خان، پاکستان کا مستقبل، فیروز سنز لاہور، ۱۹٦۹ء، ص ۸۸

۱۷۴)ڈاکٹر سید عبد اللہ، تحریک نفاذ اردو، ص ۴۳۹

۱۷۵)ڈاکٹر جمیل جالبی، قومی زبان، یک جہتی، نفاذ اور مسائل، ص ۷

۱۷٦)ڈاکٹر سید عبد اللہ، تحریک نفاذ اردو، ص ۳۸

۱۷۷) قائد اعظم، تقریر، ۱۲مارچ ۱۹۴٦ء، مشمولہ، اخبار اردو، جلد ۲۴، شمارہ ۷، ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۷

۱۷۸)ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، انٹرویو، بفہ، مانسہرہ، بتاریخ ۱۷ ستمبر ۲۰۱۷ء

۱۸۷)ڈاکٹر سید عبد اللہ، اعجاز اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص ۵٦۸

۱۸۰)ڈاکٹر انعام الحق، نظریہ پاکستان، نظریہ پاکستان ٹرسٹ، ۲۰۱۲ء، ص ۳۱

۱۸۱)چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، ص ۲۴۸

۱۸۲)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۰۲

۱۸۳)جیلانی کامران، قومیت کی تشکیل اردو زبان، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۰

۱۸۴) Keith Clard، Pakistan: Apolitical Study، London Press،۱۹٦۸ء، ص ۱۹۷

۱۸۵)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۳

۱۸٦) قائد اعظم، تقریر، ۱۱اگست، ۱۹۴۷ء، مشمولہ اسلام اور پاکستان از خورشید ندیم، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵

۱۸۷)سید عبد اللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص ۲۰

۱۸۸)سید عبد اللہ، پاکستان، ایضاً، ص ۳۔۱

۱۸۹)صفدر حسین صدیقی، پاکستان کی تعمیر نو، بک پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۱

۱۹۰)چوہدری نیاز احمد سنگھیڑہ، پاکستان میں قوم سازی کا عمل، ص۲۷۹

۱۹۱)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۰۷، ۱۰۶

۱۹۲)میاں عبدالرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ص۱۷۸

۱۹۳)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۴۴، ۱۴۵

۱۹۴)سید عبداللہ، تعلیمی خطبات، مجلس ارادتمندان سید لاہور، مرتبہ ممتاز منگلوری، ۱۹۶۶ء، ص۳۳۸

۱۹۵)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۱۹

۱۹۶)افضل حق قرشی، مدیر، بذریعہ فون، صحیفہ، مجلس ترقی ادب لاہور،، بتاریخ ۲۷ جولائی ۲۰۱۷ء

۱۹۷)سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۲۰

۱۹۸)ڈاکٹر محمود الرحمان، مضمون، پاکستانی اردو کے خدوخال، مشمولہ پاکستانی اردو، مزید مباحث، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص۹۶

۱۹۹)ڈاکٹر سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، ص۱۳۷

۲۰۰)سید عبداللہ، ایضاً، ص۱۳۲

۲۰۱)سید عبداللہ کا ادب و فن، ص۲۱۹

۲۰۲) ڈاکٹر روبینہ شاہین، ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص۱۸

۲۰۳)مولوی نور الحسن نیر، نوراللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص۵۰۵

۲۰۴)سید عبداللہ، پاکستان تعبیر و تعمیر، ص۲۰۱

۲۰۵)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۰۹

۲۰۶)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۰۹

۲۰۷)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۰۹

۲۰۸)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۱۰

۲۰۹)ڈاکٹر احسان الحق، غازی کوٹ ٹاؤن شپ مانسہرہ، ۱۷ اکتوبر، ۲۰۱۷ء

۲۱۰)سید عبداللہ، پاکستان تعبیر و تعمیر، ص۲۱۰

۲۱۱)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۰۷

۲۱۲)سید عبداللہ، ایضاً، ص۲۱۵

۲۱۳) قائداعظم محمد علی جناح، تقریر، مشمولہ پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۲۰۹

۲۱۴)نواب بہادر یار جنگ، تقریر، بعنوان، منشور پاکستان، بہادر یا جنگ اکادمی کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۱۴

۲۱۵)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۳۱

۲۱۶)ڈاکٹر صفدر محمود، اقبال، جناح اور پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص۱۲۱

۲۱۷)ڈاکٹر سید عبداللہ، پاکستان۔ تعبیر و تعمیر، ص۱۵۹

حاصل تحقیق

سید عبد اللہ اپنے افکار میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس ضابطہ حیات کی وکالت کرتے ہیں جس کی ترویج اور اشاعت کے لیے ہر اسلامی ریاست اور مملکت کوشش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ پاکستان کی قومیت اور پاکستانیت کے لیے اہل پاکستان کو ذہنی اور قلبی طور پر تیار کرتے ہیں اور ایک ایسا لائحہ عمل اپنی قوم کے سامنے رکھتے ہیں کہ جس پر عمل کر کے یہ قوم دنیاوی اور اخروی سرخ روئی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سید عبد اللہ پاکستان اور عالم اسلام کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں اور اکابرین اسلام کے نظریات سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر اس باب میں یہ ہے کہ کیسے بین الاقوامی سطح پر ایک مضبوط، فعال اور مربیانہ اسلامی بلاک بنایا جائے جہاں مسلمانان عالم اپنے مسائل اور وسائل کے ساتھ ایک دوسرے کے کام آئیں اور اسلامی بھائی چارے اور اسلامی ثقافت اور تمدن کے لیے مل جل کر کام کریں۔

جہاں تک سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی عناصر کا تعلق ہے تو وہ ایک عملی نظام فکر کے مالک ہیں ان کے فکری نظام میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرت کے خدوخال ملتے ہیں۔ وہ اپنے فکری نظام میں ایک خالص اسلامی ثقافت اور تمدن و تہذیب کی اشاعت اور فروغ کی بات کرتے ہیں۔ سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے کہ پاکستان اور اسلام کو کسی بھی کیمیائی عمل سے الگ نہیں کیا جاسکتا گو کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی تقسیم میں دیگر وجوہات بھی کار فرما تھیں لیکن جو اصل سبب تھا وہ اسلام ہی تھا۔ سید عبد اللہ کا اصرار یہی ہے کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی سیکڑوں وجوہات تلاش کی جا سکتی ہیں اور ہزار دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن سب سے معتبر اور سب سے مستند حوالہ اور قابل یقین علت اسلام ہی ہے۔ ان کے نثری سرمائے میں بلا تخصیص اسلام اور پاکستان ایک سکے کے دو رخ ہیں کہ اسلام کے بغیر پاکستان اپنے وجود کی دلیل ہی کھو دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو اپنے نفاذ کے لیے ایک خطۂ ارض یعنی پاکستان چاہیے تھا جیسے نبی اکرمؐ کے دور میں اولین اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے مدینہ کی ضرورت پڑی تھی اسی طرح پاکستان بھی ایک نظریاتی مملکت کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔ سید عبد اللہ اسلام اور پاکستان کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم جانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام ہی وہ نظام ہے جو پاکستان کو اور اہل پاکستان کے ہر مسئلے اور ہر قضیے کا حل تجویز کرنے کا اہل ہے۔

سید عبد اللہ کے فکری نظام میں ملنے والے اسلامی عناصر کے معروضی مطالعہ میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ وہ اسلام کی کل میں پاکستان کے کل کو دیکھتے ہیں اور پاکستان کو اسلام کے بنا غیر مکمل جانتے ہیں۔ ان کے اسلامی عناصر کی

تلاش اور پرکھ سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ سید عبد اللہ ایک معتدل اور فہیم مفکر ہیں اور وہ پاکستان اور اہل پاکستان کے لیے اسلامی ریاست اور اسلامی طرز حکومت کو چنتے ہیں جیسا کہ علامہ اقبال اور قائد اعظم اور مسلمانان ہند کے دیگر اکابرین نے چنا تھا۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور اکابرین قوم کبھی پاکستان کے بارے میں تذبذب اور اضطراب کا شکار نہیں ہوئے اور ان کے سامنے پاکستان کا واحد مقصد ''اسلامی ریاست'' کا حصول تھا۔ اس ضمن میں وہ قائد اعظم کی تقاریر اور فرمودات سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ قائد اعظم کا مؤقف واضح تھا اور بابائے قوم وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کرتے رہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو گی اور اس کا نمونہ مدینہ کی ریاست پر تیار کیا جائے گا یعنی قائد اعظم اسلام ہی کو پاکستان کے لیے واحد دلیل سمجھتے تھے۔ سید عبد اللہ نے اپنے فکری نظام میں علامہ اقبال اور قائد اعظم سے فیض حاصل کیا اسی لیے وہ پاکستان کے ہر شعبہ حیات میں اسلام کی اساس دیکھتے تھے نیز سید عبد اللہ اپنے تمام عزائم اور ارادوں کے لیے قران و حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس میں قطعاً شک نہیں کہ سید عبد اللہ کا اپنا مذاق اور پس منظر بھی اسلامی تھا۔

سید عبد اللہ کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس سے متعلق مسئلہ، سوال، معاملہ درپیش آئے اور اس کا حل اسلام کے پاس نہ ہو یعنی اسلام ہی وہ واحد سرچشمہ ہے جو ایک مسلمان کو مکمل اور جامع ومانع رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس معاشرے کی بنیاد رکھنے کی راہ ہموار کرتا ہے جو اللہ کی مرضی سے متشکل ہو لہذا پاکستان میں اسلامی نظام ہی رائج کیا جائے گا اور اس معاملے میں کسی کی بھی کوئی تجویز اور رائے قابل اعتنا نہیں ہو گی۔ سید عبد اللہ نے ملک خداداد اور اسلام کے بندھن کی کامل توضیح کی اور نئی نسل کو اپنی تاریخ، سماجیات، عمرانیات اور ثقافت کے ساتھ ساتھ اپنے شاندار ماضی، تاریخ، حال اور تابندہ مستقبل کو اسلام سے جوڑ کر جینے کا راز بتانے کا اہتمام کیا۔ ان کے خیال میں ان عناصر کی ترویج سے پاکستانی معاشرہ دیگر معاشروں سے اپنی پہچان جدا کر سکے گا۔ معاشرے کی بنیادیں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی اور یہ معاشرہ فعال اور مضبوط اقدار کا حامل ٹھہرے گا۔

سید عبد اللہ کی نثر میں پائے جانے والے اسلامی عناصر کی فہرست یوں تو خاصی طویل ہے لیکن جن چند نمائندہ عناصر کو چنا گیا وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کا تصور زندگی ۲۔ اسلامی اقدار و روایات کا فروغ ۳۔ اسلامی تصوف ۴۔ اتحاد عالم اسلام

۵۔ فکر اقبال میں اسلامی عناصر ۶۔ اسلام کا تصور عورت ۷۔ اسلام کا معاشی نظام ۸۔ اسلامی تصور تعلیم

اسلام اور پاکستان کے رشتہ پر سید عبد اللہ نے خاصا کام کیا ہے اور اس مقدمہ کو جیتنے کے لیے انھوں نے خوب منطقیت اور استدلالیت سے کام لیا ہے۔ اسلام کے بغیر پاکستان کو وہ ایک بے جان جسم قرار دیتے ہیں اور پھر ان کا نہایت بر محل بیان ہے کہ اگر اسلام قیام پاکستان کی وجہ نہ تھی تو پھر ہندوستان کے بٹوارے کے لیے کوئی دلیل باقی نہیں بچتی۔

سید عبد اللہ کی نثر میں پایا جانے والے اسلامی عناصر میں ایک اسلامی عنصر 'اسلامی تصور زندگی' ہے۔ اس عنصر کو وہ بہت خاص جانتے ہیں اور یہ بات مبنی بر حقیقت بھی کہ کسی بھی اسلامی معاشرے میں اسلامی تصور زندگی ہی ان مقاصد کے حصول کو یقینی بناتا ہے جس سے وہ معاشرہ اسلامی قرائن حاصل کر سکتا ہے اور پھر اسی حوالہ سے وہ دوسرے تمام معاشروں سے ممیز جانا جاتا ہے۔ اسلامی تصور زندگی کے نفاذ کی بھی دو سطحیں ہیں اول انفرادی اور دوم اجتماعی۔ اہل معاشرہ جو اپنے تصور زندگی سے کامل طور پر آگاہ ہوتے ہیں وہ اس کے نفاذ کی سعی کرتے ہیں تا کہ اس عقیدہ حیات سے وہ اسلوب حیات جنم لے جو کسی بھی مذہب کا منتہا ہوتا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اسلامی معاشرے میں وہ عناصر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے، ان عقائد سے وہ تنظیمات وجود میں آتی ہیں جن کو اصطلاح میں تنظیماتِ معاشرتی کہا جاتا ہے۔ جو در حقیقت انہی عقائد کی عملی صورتوں کا اظہار ہوتی ہیں۔ اسلامی عناصر دراصل اسلامی شعائر کو تخلیق کرتے ہیں جن کو دیکھ کر اور جن کا مظاہرہ کر کے ایک خاص معاشرت اور ایک منفرد اسلوب حیات ابھرتا ہے جو اصل میں اس قوم کے تصور زندگی کی دین ہوتا ہے اور یوں وہ قوم دیگر قوموں سے مختلف اور منفرد ہو جاتی ہے۔ سید عبد اللہ کے نزدیک اسلام کا اصل مشن اسی تصور حیات کو عملی خطوط پر استوار کرنا ہے تا کہ وہ اسلامی معاشرت معرض وجود میں آپائے جس کے لیے قران اور سنت نے اعلیٰ ترین مقاصد کا تعین کر رکھا ہے۔ اس تصور زندگی کو ان کے ہاں مرکزی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔

سید عبد اللہ کی نثر میں اسلامی عناصر میں دوسرا اہم عنصر اسلامی اقدار و روایات کی کا فروغ ہے۔ سید عبد اللہ اسلامی اقدار کی بقا، ترویج اور اشاعت پر خاصا زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انہی اقدار و روایات کو فروغ اسلامی معاشرے کی پہچان اور انفرادیت کا ضامن ہے۔ وہ ہر اس ریت اور رواج کو اسلامی مانتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات سے متحارب نہ ہو اسی طرح وہ مغربی اقدار اور مغربی تہذیب کی ہر اس قدر کے خلاف ہیں جو اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس حوالے سے وہ اسلامی مزاج کے انجذاب کے معترف ہیں جو اپنے مزاج اور تعلیمات سے ہم آہنگ ریتوں اور رسومات کو بلا تکلف اپنا لیتا

ہے ساتھ ہی وہ ان تمام رسموں اور اقدار کی بیخ کنی کے خواہاں ہیں جو اسلامی معاشرت اور اسلامی مذاق سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ سید عبداللہ کا یہ مسلک رجعت پسندانہ اور ہٹ دھرمی پر مبنی بالکل بھی نہیں بلکہ ان کا رویہ قابل رشک حد تک معتدل اور لچکدار ہے۔

سید عبداللہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے خلاف ہیں اور اسلامی اور مشرقی اقدار کے حامی ہیں جو اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانان ہند چونکہ سو سال سے زائد عرصے تک انگریزوں کی غلامی میں رہے ہیں اس لیے وہ اس تہذیب سے مرعوبیت کا شکار ہیں اور یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ مغرب کے سائنسی اور صنعتی انقلاب نے ساری شرقی دنیا کو متاثر کیا ہے اس میں صرف اکیلے مسلمان ہی متاثر نہیں ہوئے۔ بہر طور سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ مغرب کی اس مرعوبیت کا خاتمہ اہل اسلام اپنی اعلیٰ اور اسلامی اقدار سے کر سکتے ہیں نیز انگریزوں کے دور حکومت میں جو اسلامی قوانین معطل رہے ہیں ان کو اسلامی (پاکستان) میں جاری کر کے مکمل اسلامی نظام کا نفاذ کیا جائے۔

سید عبداللہ کے نثری سرمائے میں ان کے اسلامی متصوفانہ خیالات و افکار بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تصورات کسی ایک نظام فکر کی صورت میں یا کسی خاص ترتیب سے نہیں ملتے بلکہ الگ الگ جگہوں میں جدا جدا امباحث کے دوران زیر بحث آتے ہیں۔ سید عبداللہ کا تصوف کے حوالے سے رجحان صحت مند اور مثبت ہے اور وہ تصوف کو صرف ادب کے ساتھ وابستہ نہیں دیکھتے بلکہ سید صاحب تصوف کے عملی پہلو پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ سید عبداللہ اس اسلامی تصوف کے قائل ہیں جو اسلامی تعلیمات سے مطابقت ہی نہیں رکھتا ہے بلکہ ہے ہی اسلام کی دین۔ وہ تصوف کو بے عملی اور حقائق سے فرار کا حیلہ ہرگز نہیں جانتے بلکہ وہ اسے کو فرد کے تزکیہ نفس اور معاشرہ کی کی اصلاح عظیم کام لینے کا وسیلہ گردانتے ہیں اور تصوف اور ادب کے مابین ایک مضبوط اور محکم رشتہ بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تصوف کو ادب کا حصہ ہونا چاہیے اور تصوف سے وہی مقاصد حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے کہ جن کے حصول کے لیے یہ فلسفہ اپنی خاص شہرت رکھتا ہے ہے۔ سید عبداللہ ادب میں تصوف کی روایت پرستی کے مخالف ہیں اور ان کے ہاں اسلامی تصوف ادب میں انہی اعلیٰ مقاصد کے حصول کو یقینی بنائے جن سے معاشرے میں مثبت اور مثالی اسلامی قدریں پروان چڑھیں۔

سید عبداللہ اسلامی تصوف کے حامی ہیں اور اسلامی تصوف ہی کو زندگی اور ادب دونوں کے لیے لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ وہ صوفیا کے مقام کے معترف، قدر کرنے والے اور ان کے وکیل ہیں۔ قصہ مختصر کہ ان کے پیش نظر تصوف کی فعالیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ تصوف زندگی کو ایک بے عملی سے بھی دوچار کرتا ہے سید عبداللہ اس تصوف کو یکسر رد کرتے ہیں۔ سید عبداللہ کا خیال ہے کہ ہند کے صوفیائے کرام نے ہند

اسلامی معاشرے میں ایک ہمہ جہت کردار ادا کیا۔ صوفیائے کرام کی وسیع المشربی، رواداری، تبلیغ اور مساوات کے درس سے غیر مسلم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے۔ سید عبداللہ کے نزدیک آج بھی ان صوفیا اور اولیا کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی تعلیم کو فروغ ملے اور تبلیغ اسلام بھی احسن طریق انجام ہوپائے اور مسلمانوں کی سیرت سازی بھی ہوسکے۔

سید عبداللہ کے ہاں پائے جانے والے اسلامی عناصر میں ایک اہم عنصر 'اتحاد عالم اسلام' ہے اس نظریہ میں وہ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے اور اسلام کا قلعہ ہے لہذا قیام پاکستان کے مقاصد میں سے ایک مقصد اتحاد عالم اسلامی کا قیام بھی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان اسلامی اتحاد میں ایسا کردار ادا کرے کہ اسلامی دنیا سیاسی طور پر بین الاقوامی سطح پر اپنے حقوق کا تحفظ اور دفاع کرسکے اور عالمی سیاسی منظر نامے پر مسلمانوں کے بین الاقوامی حقوق کے تحفظ اور دفاع کو یقینی بنایا جائے اور اس حوالے سے مسلمانان پاکستان دل سے کام کریں گے۔ سید عبداللہ کے اتحاد عالم اسلامی کی تقویت اور قیام کے باب میں خیالات و نظریات خاصے فکر انگیز اور فعال ہیں۔ سید عبداللہ نے اپنی کتاب 'پاکستان۔ تعبیر و تعمیر' میں چند تجاویز بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اتحاد عالم اسلام کے ضمن مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ سید عبداللہ اتحاد عالم اسلامی کو ایک خواب نہیں سمجھتے بلکہ یہ اسے ایک اٹل حقیقت مانتے ہیں کہ اگر اس کے لیے مخلصانہ اور ایمان دارانہ کوششیں کی جائیں تو وہ ابدی کامرانیاں اس ملت بیضا کو حاصل ہوں گی کہ جن سے عظمت رفتہ کا حصول کا خواب تعبیر پائے گا۔

سید عبداللہ کے اسلامی عناصر میں فکر اقبال کا مقام بھی کلیدی ہے۔ دراصل اقبالیات ڈاکٹر سید عبد اللہ کا ایک مستقل موضوع ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی نثر فکر اقبال کے حوالے سے خاصی ثروت مند ہے تو یہ بات بے جا نہ ہوگی۔ سید صاحب علامہ اقبال کے محب اور اقبال کی فکر کے مستند مفسر، فہیم شارح اور بے لوث وکیل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ سید عبداللہ کی اقبال شناسی کا ایک مسلمہ ثبوت ان کی کتاب ''اعجاز اقبال'' ہے۔ جس میں ان کے اقبالیات کے موضوع پر لکھے گئے تمام مقالات و مضامین یکجا کر کے شائع کر دیے گئے ہیں۔ سید صاحب کا اقبال سے خاص شغف تھا اور انھوں نے اقبال پر اپنی ندرت فکر اور فہم سے خاصے پائے کے مضامین تحریر کیے ہیں۔ سید عبداللہ ''محرک اقبالیات'' کہلائے کیوں کہ سید صاحب اپنے طلبا اور طالبات کے اندر اقبال شناسی کی تحریک پیدا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اقبال کے نظام فکر میں مسلم امہ کی نئی پود کی کردار سازی اور تربیت کا عملی لائحہ عمل موجود ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اقبال کی فکری تحریک

کو سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ سید عبد اللہ ایک سلجھے ہوئے، باسلیقہ اور متوازن فکر رکھنے والے محب اقبال اور اقبال شناس کے طور پر تسلیم کیے جاتے تھے۔

سید عبد اللہ گو کہ خود فلسفی اور شاعر نہ تھے لیکن اقبال کی سوچ اور فکر ان کے مزاج و منشا اور نظریہ حیات سے میل کھاتی ہے۔ وہ اقبال کے عزم اور مشن کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و فلسفہ کے خوشہ چیں بھی ہیں۔ سید عبد اللہ نے فکر اقبال سے خوب استفادہ کیا اور اقبال سے استفادہ کی وجوہ اسلامی تعلیمات ہیں جیسا کہ یہ مسلمہ سچ ہے کہ اقبال نے اپنے فکری نظام کو قرآن اور اسلامی تعلیمات پر استوار کیا لہٰذا سید عبد اللہ ان اسلامی ماخذات اور تعلیمات کو اپنے نثری سرمائے میں برتتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کی نظم و نثر ہر دو حوالوں سے خوب کام کیا۔ وہ خود بھی علامہ اقبال سے فکری تربیت حاصل کرتے رہے اور اس کو عام کرنے کے لیے ساری عمر کام کیا۔ ان کی کتب اور ان کے مقالات اس بات کا عملی ثبوت ہیں کہ سید عبد اللہ اور اقبال کے درمیان ایک روحانی رشتہ موجود تھا۔ سید عبد اللہ نے فکر اقبال کے سرچشموں تک رسائی کی کوشش کی، فکر اقبال کے ہم خیال فلاسفہ اور مفکرین سے بھی استفادہ کیا۔ یوں انھوں نے اسلامی فکر کی بنیادوں کو تلاش کیا۔ سید عبد اللہ کا ماننا یہ ہے کہ اقبال کا فکری نظام اسلامی فلسفہ کی دین ہے یعنی اقبال بھی اسلام کی فعالیت کو مانتے ہیں اور اسلام کو بطور ضابطہ حیات کے تسلیم کرتے ہیں اور پھر عظمت رفتہ کے کھو جانے کا احساس اور اس کو دوبارہ حاصل یا بحال کرنے کے لیے ایک عملی لائحہ عمل بھی تجویز کرتے ہیں۔ یہی وہ انقلابی پیغام تھا جس نے مسلمانوں کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ سید عبد اللہ بھی اسی انقلاب کے داعی ہیں۔ وہ اسلامی انقلاب کے نقیب بن کر اقبال کے تصورات اور فکر کی شرح اور تفسیر بیان کرتے ہیں۔

سید عبد اللہ کے نثری سرمائے میں ایک اہم اسلامی عنصر اسلام کا تصور عورت بھی ہے۔ عہد حاضر میں معاشرے میں عورت کا مسئلہ خاصا نازک اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ نسائی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیمیں عورت کو سبز باغ دکھانے میں مصروف ہیں۔ مسلمان عورت بھی مغرب کی اس ہوا سے خام خیالی کا شکار ہو رہی ہے کہ وہ بھی جدید عہد میں زندہ رہنے کا حق رکھتی ہے اور ان کو بھی مردوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ مغربی تعلیم کے زیر اثر مرد و زن واقعی اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ عورتوں کے ساتھ اسلامی معاشروں میں بالعموم اور پاکستانی معاشرہ میں بالخصوص زیادتی ہو رہی ہے اس لیے مختلف غیر حکومتی تنظیمیں (NGOs) بھی اس ضمن شعور آوری کی مہمات چلانے میں مصروف ہیں۔

سید عبد اللہ کا تصور عورت خالصتاً اسلامی فکر پر مبنی ہے وہ عورت کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس سے قرآن و سنت نے عورت کو دیکھا ہے۔ وہی مقام عورت کو دیتے ہیں جو قرآن و سنت نے اس کو دیا۔ سید صاحب مغربی عورت کو اپنا آئیڈیل تسلیم

نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق اور فرائض تفویض کیے ہیں وہ اس کی جنس کے اعتبار سے بالکل موزوں ہیں اور عورت کے تحفظ، فطری حیاداری، نیک نیتی اور جسمانی نزاکت کے لحاظ سے مناسب اور معقول ہے۔ اسلام مردوزن دونوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے جو ایک معتدل، خوشگوار اور مساوی معاشرتی زندگی کو یقینی بناتی ہیں لہذا پاکستانی معاشرے میں عورتوں کو اسلامی احکامات کی روشنی میں اپنے ثقافتی مزاج کے مطابق تشکیل پانے والا ماحول دینا چاہیے تاکہ ان کی زندگی اسلامی تقاضوں کے مطابق ایسے گزر سکے جو نہ صرف ان کے لیے تحفظ اور ناموس کا باعث ہو بلکہ معاشرے کے لیے بھی مفید اور فیض بخش ہو۔

سید عبداللہ کے نظام فکر میں اسلامی معاشی نظام کو اولیت حاصل ہے۔ وہ اسلامی معاشی نظام کو مستحکم، آزمودہ اور لچکدار قرار دیتے ہیں جو مضبوط معاشرتی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس کی اصل غریب نوازی، مصیبت کشائی، دوسروں سے ہمدردی، ایثار اور قرض حسنہ جیسی انسان دوست اسلامی اقدار و روایات پر مبنی ہے، جہاں سود، ربوٰ، غبن، چوری اور بے ایمانی جیسی مکروہ اور انسان دشمن قباحتوں کی بیخ کنی اور حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ دوسری جانب اپنی معاشی تنظیم کو فعال اور موثر بنانے کے لیے اسلام اجتماعی اور انفرادی سطح پر اپنے پیروکاروں کو تیار کرتا ہے۔ اس طرح کا معاشی نظام اپنی تنظیمی صورت میں اسلامی معاشرے کے قیام اور دوام میں کلیدی مقام رکھتا ہے۔ اسلامی معاشی تنظیم کی دو صورتیں ہیں ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی، اسلام اپنی معاش کی تنظیم میں فرائض اور حقوق کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی معاشرے میں اقتصادی امور کی اعتدال پسندی اور صدقات وزکوٰۃ اور خیرات کے حوالے سے ایسی تنظیم ہو کہ جہاں غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر نہ ہوتا جائے بلکہ دولت کی انتہائی منصفانہ تقسیم ہو اور افراد معاشرہ آسودہ اور خوشحال زندگیاں گزاریں۔ اسی اسلامی تنظیم معاش کے لیے سید عبداللہ اصرار کرتے ہیں کہ اہل معاشرہ کی بنیادی ضرورتوں مثلاً روزگار، تحفظ، بقائے نسل کے ممکنہ امکانات کا اہتمام جائے۔ سید عبداللہ پاکستان کو ایک نیا معاشی تجربہ بھی قرار دیتے ہیں۔

اسلام کا تصور تعلیم بھی سید عبداللہ کا ایک نمایاں اور خاصا مستند حوالہ بنتا ہے، ان کے خطبات اس حوالے سے بہت خاص ہیں۔ سید عبداللہ اسلامی تصور تعلیم کے مبلغ رہے ہیں۔ اسلام کا تصور تعلیم یہ ہے کہ فرد کے اذہان و قلوب کو آفاقی حقائق اور اسلامی طرز فکر سے یوں روشناس کرایا جائے کہ وہ اس دنیا کے کے تمام تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کو کما حقہ نبھا سکے نیز فرد ایک ایسے معاشرے کی تخلیق کرے جس میں مقتدر اعلیٰ اللہ ہو اور اس کے کے سامنے اخلاق اور معاشرت کا نمونہ اسوہ حسنہ کی صورت میں ہو۔ سید عبداللہ کا نظام تعلیم انہی اسلامی تقاضوں کی تکمیل کا اصرار کرتا ہے۔

برصغیر میں لارڈ میکالے کے نظام تعلیم پر وہ کڑی تنقید کرتے ہیں اور ایسے نظام کے داعی ہیں جو اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ جدید عہد کے مسائل اور مطالبوں سے بھی نمٹ سکنے صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ جس نظام تعلیم کے خواہاں ہیں وہ اسلامیت کا حامل ہو اور سائنسی نصاب بھی رکھتا ہو اسی نظام ہی میں وہ اپنی قوم کی فلاح اور سرخ روئی دیکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سید عبداللہ اپنی تحریروں میں ایک خالص اسلامی معاشرہ کے پرچارک اور داعی ہیں اور ان کے نزدیک پاکستان یا کوئی بھی اسلامی معاشرہ سرخ روئی نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اسلامی اصولوں اور تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں نافذ نہیں کرلیتا۔ نفاذ اسلام ہی مسلمانوں کی عظمت اور کامرانی کی شرط اولین ہے۔ اسلام کو ایک مکمل ضابطہ مان لینے کے بغیر نہ اسلامی معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے نہ ہی وہ تمدن معرض وجود میں آسکتا ہے جس کا قیام اسلام کا حقیقی مشن اور مقصد ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اہل پاکستان اور پاکستان ہی سید عبداللہ کا اصل موضوع ہیں۔ وہ اس خطہ ارضی پر بقول قائد اعظم اسلامی اصولوں کی ایک تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں اور اس مملکت خداداد کو اسلام کا مضبوط قلعہ بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں پائے جانے والے اسلامی عناصر کا مطالعہ اسی حقیقت کو افشا کرتا ہے کہ انھوں ساری عمر پاکستان کے قیام اور پاکستان میں اسلامی نظام پر غور و فکر کیا ہے اور ان امور اور حکمت عملیوں کو وضع کیا ہے جن کو اپنا کر اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے اس ملک کو حقیقی روح کے ساتھ علامہ اقبال اور قائد اعظم کا پاکستان بنایا جاسکے۔

غرض سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے اسلامی عناصر ان کی فکر کے خاص اجزائے ترکیبی ہیں ان کی فکر خالصتاً اسلامی ہے اور وہ اپنی اس فکر کو پاکستان اور اہل پاکستان کی تربیت اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی تشکیل کے لیے استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ پاکستان کو ریاست مدینہ کی پیروی میں قائم ہونے والی واحد نظریاتی ریاست سمجھتے ہیں اور وہ اس سماج اور تمدن کے وکیل ہیں جس کے لیے سرکار دو عالم ﷺ اور ان کے خلفائے راشدین نے کام کیا ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان کا قیام ایک حادثہ نہیں تھا اور نہ ہی اس وطن کے لیے اسلام کا نعرہ ایک وقتی حکمت عملی تھی۔ پاکستان اسلام کے نظریاتی قوت کا اظہار تھا کیونکہ اس کا قیام اسلامی تعلیمات کا منطقی نتیجہ تھا۔ لہذا سید عبداللہ اسلام کی اساس پر ہی پاکستان کی نظری اور فکری عمارت کی بنیاد رکھنے پر اصرار کرتے ہیں خواہ ادب ہو یا ریاست، معاشرتی اقدار ہوں یا ثقافتی روایات یا پھر سماجی و اقتصادی و عمرانی مسائل ہوں، مسلمان کے لیے ہر شعبہ زندگی میں اسلامی تعلیمات کی رہنمائی لازمی ہے ان کے نزدیک اسلامی عناصر کی نشو و نما اور نگہبانی ہی اس اسلامی ریاست کے تشخص اور بقا کی ضامن ہو گی۔

سید عبداللہ کے ہاں موجود اسلامی عناصر کا تکملہ وہ پاکستانی عناصر ہیں جو ان کی نثر کا دوسرا غالب موضوع ہے۔ ان کے ہاں ملنے والے پاکستانی عناصر سے مراد وہ عناصر ہیں جو پاکستان اور پاکستان کے متعلقات کی ایک شناخت اور پہچان کا حوالہ

بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، ان کو پاکستانی عناصر کے نام سے معنون کیا جاسکتا ہے۔ سید عبداللہ کی نثر میں ملنے والے پاکستانی عناصر درج ذیل ہیں:

۱۔ دو قومی نظریہ: توضیح و تشریح ۲۔ پاکستانی ثقافت اور اس کے تشکیلی عناصر ۳۔ قومی اردو زبان
۴۔ قائد اعظم اور سید عبداللہ ۵۔ سید عبداللہ کا نظریہ قومیت ۶۔ سید عبداللہ اور پاکستانیت
۷۔ سید عبداللہ کا نظریہ بازیافت ۸۔ سید عبداللہ کا نظریہ آزادی

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایک نظریہ یعنی "دو قومی نظریہ" کی منطقی دین ہے۔ اس نظریہ نے ہندی مسلمانوں کو ایک الگ تشخص کا بخشا۔ دو قومی نظریہ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ ریاست کے حصول کا تصور دیا۔ قائد اعظم مکمل وضاحت اور صراحت کے ساتھ مسلمان قوم کو ایک جدا اور مکمل قوام رکھنے والی قوم قرار دیتے ہیں۔ دو قومی نظریہ کو پاکستانی عناصر میں اولیت حاصل ہے کیونکہ اس نظریے کے بنا اسلامیان ہند اپنے وجود کو منوا ہی نہیں سکتے تھے۔
سید عبداللہ سمجھتے ہیں کہ اس نظریے کی ترویج اور ابلاغ سے پاکستانیت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اس نظریے کے بنیاد پر ہی اہل پاکستان اپنے وطن کو اس معراج سے ہمکنار کرسکتے ہیں جس کا قائد اعظم نے خواب دیکھا تھا اور جس منزل کی نشان دہی علامہ اقبال نے کی تھی۔
سید عبداللہ کے ہاں پاکستانی عناصر کا مطالعہ کرتے ہوئے دوسرا عنصر جو سامنے آتا ہے وہ "پاکستانی ثقافت" ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آنے والی یہ نظریاتی ریاست پاکستان، در حقیقت ریاست مدینۃ المنورہ کی نقل تھی۔ یہی اس ریاست کا سب سے بڑا محرک تھا۔ دوسرا نمایاں محرک ہندوستانی مسلمانوں کی جدا اور منفرد ثقافت تھی جس کے تحفظ کے لیے مسلمان فکرمند تھے اور وہ اپنی ثقافت و تہذیب کے ہر رنگ، زاویہ اور طرز کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اقبال کا الگ مملکت کا خیال بھی بنیادی طور پر مسلم معاشرت و ثقافت اور اسلامی نظام حیات کو مامون کرنا تھا۔
سید عبداللہ یہی چاہتے ہیں کہ پاکستانی ثقافت اپنے ظاہری اور باطنی ہر دو روپ میں اسلامی تہذیبی اور تمدنی سرچشمہ سے فیض یاب ہو اور علاقائی مسلم ثقافتوں کو تحفظ دیتے ہوئے پاکستانی کلچر کو فروغ اور اشاعت دیا جائے۔ سید عبداللہ پاکستان کو صرف ایک زمین کا ٹکڑا ہی نہیں مانتے بلکہ وہ اس دھرتی کو ایک عظیم اور مثالی ریاستِ مدینہ کی پیروی میں معرض وجود میں آنے والی مملکت جانتے ہیں، جس کے قیام کا مقصد ایک نظام حیات اور اسلوب معاشرت کو نافذ کرنا تھا بالفاظ دیگر پاکستان وجود میں آجانے سے مشن مکمل نہیں ہوا بلکہ اصل مشن حقیقی معنوں میں شروع ہوا ہے کہ اسلام کے نام

پر حاصل ہونے والا پاکستان اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ ثابت ہو گا۔اس تجرباتی عمل کا منطقی نتیجہ مسلم تہذیب و ثقافت اور اسلامی طرز حیات کے تحفظ کی صورت میں سامنے آنے تھا۔ سید عبداللہ کا ماننا بھی یہ ہے کہ اب ہمیں اپنی الگ اصطلاحات بھی وضع کرنی ہوں گی یعنی ہم نے اب اسلامی ضابطہ حیات کو پاکستانی ضابطہ حیات کا نام دینا ہو گا اور یہ دونوں اصطلاحات باہم مترادف ہوں گی۔ اسی طرح پاکستانی ثقافت ، پاکستانی حدود، پاکستانی معاشرت ، پاکستانی فکر ، پاکستانی لباس ، پاکستانی شادی ، پاکستانی موسیقی ، پاکستانی صنعت ، پاکستانی مصوری ، اور پاکستانی ادب جیسی اصطلاحیں پاکستان کی پہچان اور پاکستان کی ساکھ کو بڑھائیں گی۔ پاکستانی ثقافت کے تشکیلی عناصر کا تحقیقی مطالعہ میں سید عبداللہ ان امور کی نشان دہی کرتے ہیں .ان چند تشکیلی عناصر کو اس ضمن میں موضوع بحث بنایا گیا جن میں پاکستانی ثقافت کی اصطلاح، ثقافت اور مذہب کا رشتہ ،فلسفہ تطہیر زندگی ، نظام اخلاقیات ، مذہبی رواداری، رسوم و رواجات ، اعتدال پسندی اور میانہ روی ، مشاورت اورآزادی اظہار رائے، مجلسی زندگی، نظام سیاست، زبان، آداب معاشرت، فنون لطیفہ، ہندی اثرات وغیرہ شامل ہیں۔

سید عبداللہ کے نظام فکر میں ملنے والے پاکستانی عناصر میں ایک بہت اہم عنصر قومی زبان اردو ہے۔ تحریک پاکستان ہو کہ قیام پاکستان کے بعد کی کتھا اردو ایک اساسی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے ۔برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا سب سے اہم تاریخی ثمر اردو زبان کو مانا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو زبان پاکستانی عناصر میں خاص اور بلند مقام رکھتی ہے۔ اسی لیے آپ نے اردو کے نفاذ کے لیے سر توڑ کوششیں کرتے رہے ہیں اور اسی سبب سے انھیں ''بابائے اردو ثانی'' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مارشل لا جیسے عہد میں بھی اپنے اس مشن کو نہیں چھوڑا اور اردو کے نفاذ کے لیے دن رات کام کیا۔ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ملازمت کے دوران میں بھی ان کا یہ مشن چلتا رہا اور انھوں نے بارہ اردو کانفرنسیں منعقد کرائیں، ادبی اور صحافتی میدانوں میں جہاد بالقلم کیا۔المختصر اردو کو سید عبداللہ کے ہاں اسے ایک اساسی اور اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔

سید عبداللہ کی نثر میں قائد اعظم کی شخصیت اور ان کے افکار ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح ایک مثالی کردار کے حامل با اصول اور ایماندار شخصیت کا نام ہے۔ اہل پاکستان کے لیے ''بابائے قوم'' کی عزت اور توقیر مسلم الثبوت ہے۔ سید عبداللہ کے نزدیک قائد اعظم کے پاکستان کو قائد اعظم کے نصب العین کے طور پر دیکھنا ہو گا اور اس کو اس مقام تک پہنچانا ہر پاکستانی پر فرض ہے جس کا عزم بابائے قوم نے کیا تھا۔ ان کے ذکر اور ان کے نظریات کے بغیر پاکستان کی تعبیر اور تعمیر تو درکنار اس کی عام سی تعریف بھی ممکن نہیں ہے۔ سید عبداللہ اپنے سارے نثری سرمائے میں بالاستعیاب قائد اعظم کے افکار اور نظریات سے استفادہ کرتے ہیں اور ان سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے

ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تحریک نفاذ اردو'' کو قائد اعظم کے نام سے معنون کیا ہے جو اپنے عظیم قائد کے لیے ان کی محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ اپنی کتاب 'پاکستان۔ تعبیر و تعمیر' میں بھی وہ اپنے قائد کی توصیف کرتے ہیں اور قائد اعظم کے خیالات اور تصورات کی شرح کرتے ہیں۔ سید صاحب کے نثری سرمائے میں قائد اعظم کے اقوال کی نہ صرف تشریح ملتی ہے بلکہ وہ ان کے فرامین اور تقاریر سے جابجا استدلال بھی کرتے ہیں۔ اپنی نثر میں سید عبد اللہ قائد اعظم کے متعلق بد گمانیاں پھیلانے والوں کو بھی اپنے دلائل سے مسکت جواب دیتے ہیں۔

سید عبد اللہ کے ہاں نظریہ قومیت بھی خاصی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے جس میں وہ اسلامی نظریہ قومیت کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ مشاہیر اسلام اور بالخصوص علامہ اقبال کی فکر اور قائد اعظم کی تقاریر اور فرامین سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ قومیت کے حوالے سے مغربی مفکرین کے خیالات و تصورات کو بھی جانچتے ہیں اور پھر اسلامی فکری اور نظری مباحث کی روشنی میں اپنا نظریہ قومیت پیش کرتے ہیں۔

سید عبد اللہ کے ہاں پائے جانے والے پاکستانی عناصر میں ایک اصطلاح ''پاکستانیت ''ملتی ہے۔ وہ اس اصطلاح سے مراد یہ لیتے ہیں کہ پاکستان سے وابستہ ہر نظریہ ،ہر چیز ،ہر حوالہ خواہ اس کا تعلق سماج، معاشرت، معیشت، عمرانیات، اقتصادیات، تہوار، اقدار و روایات، رسوم رواجات، اور موسیقی، رقص اور ادب غرض وہ سب کچھ جو ایک زندگی کی رنگا رنگی اور ہمہ ہمی میں آتا ہے یا آسکتا ہے پاکستانیت ہے گویا وہ تمام عوامل، پہلو اور زاویے جن سے پاکستان کی ساکھ اور پہچان وابستہ ہے ان کا نام پاکستانیت ہے۔ سید عبد اللہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستانی قوم اپنی الگ شناخت کے لیے پاکستانیت کو فروغ دے۔ وہ پاکستان کے صوبوں میں علاقائی زبانوں ان کے ادب، علاقائی ثقافتوں، لوک ادب کے باہمی تعلق اور رشتے کو پاکستان اور پاکستانی ادب سے جوڑنے اور ایک مستحکم قومیت کے خدوخال کو اجاگر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ تجویز ملتی ہے کہ پاکستان کے دانشوروں اور متکلمین کو چاہیے کہ پاکستان کی قومیت کی روایتی تعریف اور حدود پر غور کریں اور عہد جدید کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید ضرورتوں کے مطابق اپنی قومیت کی تعریف کریں اور قومیت کے نئے اصول وضوابط تشکیل دیں تا کہ پاکستانی قوم اور قومیت کی شناخت دیگر ملکی قومیتوں سے جداگانہ پہچان پا سکے۔ سید عبد اللہ اس باب میں ان نیم حکیم اور بد اندیش و کم فہم لوگوں سے بھی ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہیں جو بظاہر حب وطن کے داعی ہیں لیکن در حقیقت پاکستان کی شناخت اور اتحاد اور شعار اسلامی کے بغض لیے ہوئے ہیں اور جو اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے مقامی قومیتوں اور علاقائی عصبیتوں سے مدد لیتے ہیں۔ سید صاحب اس بات پر یہ اصرار کرتے ہیں کے علاقائی ثقافتوں اور اقدار و رواجات کو پاکستان کی اجتماعی شناخت میں ایک مقام دیا جائے۔ مقامی قومیتوں کو اپنی مقامی

ثقافتی قدروں، لوک ورثہ، لوک ادب اور دیگر مقامی تمدنی روایات کے ساتھ پاکستانی قومیت کے مجموعی دھارے میں شامل کر لیا جائے۔ یوں پاکستان کو اس پاکستانیت اور مضبوط اجتماعی قومیت کے ثمرات حاصل ہوں گے اور پاکستان کی ساکھ اور پاکستان کی شناخت کا دنیا میں ایک تعارف بن سکے گا اور دنیا بھر میں پاکستانیت کی ترویج ہو پائے گی۔

پاکستانی عناصر کے حوالے سے ان کا اپنا نظریہ بازیافت بھی ہے جس میں وہ اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندوستان پر اسلامیان کا حق ہے کہ وہ حکمرانی کریں جیسے کہ صدیوں کی بھی ہے لیکن اس حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اسلحہ اور فوج کی ضرورت نہیں بلکہ اسلامی کردار اور تبلیغ اسلام کی ضرورت ہے۔ وہ متحدہ اسلامی ہند کا خواب دیکھتے ہیں جو ان کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی ایک صورت ہے اس حوالے سے وہ صوفیا اور اولیا کے مشن کو بڑھانے پر اصرار کرتے ہیں۔

پاکستانی عناصر میں ان کا نظریہ آزادی بھی خاصا فعال اور عملی ہے وہ پاکستان کی اور اس سے وابستہ امیدوں کو حاصل کرنے کے لیے وطن عزیز کو اسلامی تجربہ گاہ اور ناقابل تسخیر قلعہ بنانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی آزادی کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے وہ چار اجزا پر اصرار کرتے ہیں:

الف۔ دو قومی نظریہ　　ب۔ پاکستانیت یا اسلامی قومیت　　ج۔ پاکستانی ثقافت

د۔ اردو زبان

ان کا یہ نظریہ آزادی مسلمانان پاکستان کو ان کے حقوق و فرائض سے آگاہ کر کے استحکام پاکستان کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ یہ نظریہ مضبوط پاکستان کی کنجی ہے۔

سید عبداللہ کے ہاں پاکستانی عناصر کے مباحث میں کچھ اصطلاحات بھی پڑھنے کو ملتی ہیں جن کی مدد سے سید صاحب اپنے مباحث کو آگے بڑھاتے ہیں اور اپنے نظام فکر کی مبادیات سے تعارف بھی کراتے ہیں۔ پاکستانی عناصر کے باب میں چند اصطلاحات یہ خاص معنویت رکھتی ہیں مثلاً نظام اصولیات، ، علاقائیت، صوبائیت، پاکستان گیریت، تمدنی تنظیمات، منسوخ معاشرت، ہم شہری، پاکستانیت، زمینی نظریہ اور پاکستانی کلچر وغیرہ خاص ہیں۔ اصطلاح سازی کے اس عمل میں بھی ان کی سنجیدہ فکری نمایاں ہے۔

سید عبداللہ کی نثر میں پائے جانے والے پاکستانی عناصر ان کے جذبہ حب الوطنی کے عکاس ہیں اور ان کے اس تفکر کا نتیجہ بھی ہیں جو اس مملکت خداداد کے لیے ان کی دلسوزی کا غماز ہے۔ سید صاحب اس ملک کو ایک ملک ہی نہیں جانتے بلکہ ان کے نزدیک پاکستان ایک قومیت کی یادگار ہے۔ جو قوتیں اس قوم کو مغربی طرز جمہوریت میں ہمیشہ کے لیے اقلیت بنانے کی سازشیں کر رہی تھیں۔ ان کی ساری کی ساری منصوبہ بندیاں دھری کی دھری رہ گئی۔ پاکستان ایک ملک ہی نہیں بلکہ

ایک فعال اور تسلیم شدہ تاریخی حقیقت کا تسلسل ہے جس کا اظہار اقبال، قائد اعظم اور دیگر مفکرین ہند نے بھی کیا ہے کہ پاکستان اسی دن معرض وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان کا پہلا ہندو مشرف بہ اسلام ہوا تھا لہذا سید عبد اللہ اسی دو قومی نظریے اور اس نظریے سے پیدا ہونے والی قومیت اور اس کی ثقافت اور تہذیب اور اس قوم سے وابستہ شعائر اور ہزار سالہ حکمرانی کے اثرات و ثمرات کے پیش نظر اس پاکستان کو ایک عظیم ریاست و حکومت کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس ملک میں مدنی ریاست کا آئین اور اسلامی ریاست پر اصرار کرتے ہیں اور اہل حکم میں خلفائے راشدین کے اوصاف اور رعایا میں اسی عہد کے دلیر اور کلمہ حق کہنے والوں کو دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں پاکستان کا ہر شعبہ مدینۃ المنورہ کی یاد تازہ کرے تو اصل پاکستان معرض وجود میں آئے گا۔ قیام پاکستان اپنے مشن کے مکمل ہونے کا پتا نہیں دے رہا یہ اصل مشن اور اصل کام کے آغاز کا مقام ہے جہاں پاکستان کے لوگ اسلامی طرز معاشرت، اسلامی قومیت، اسلامی آئین اور اسلامی حیات کو یقینی بنائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا کلچر، پاکستان کی معاشرت، پاکستان کی معیشت، پاکستان کا ہر شعبہ زندگی اور پاکستان کی پہچان یعنی پاکستانیت کے لیے عوام، ادارے، حکومت اور دانشور، شعرا اور ادبا، اساتذہ، صحافی برادری، وکلا، علما اور اولیا سب مل کر کام کریں اور دو قومی نظریے کو دل سے قبول کریں اور پاکستان اور اسلام کو باہم مترادف جانیں تب اس مملکت کے مسائل اور پریشانیاں دور ہوں گی نیز علاقائیت کو عزت دے کر اصل طاقت کے دھارے میں شامل کریں اور صوبوں میں باہمی مفاہمت اور تفہیم کے لیے کام کیا جائے مقامی ثقافتوں اور لوک ادب اور موسیقی کو بھی قومی سطح پر پہنچنے اور نشوونما پانے کی جگہ دی جائے۔

سید عبد اللہ ایک سچے مسلمان اور مخلص محب وطن اور ایک معاشرتی مصلح کار تھے۔ ان کا معاملات زندگی اور معمولات حیات کو دیکھنے کا انداز بالیدہ، اسلام کے بارے میں علم اور اسلوب فکر سنجیدہ اور پاکستان کی بہبود اور بقا کا شعور بالغ تھا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے سبب اہل فکر و نظر ان کو ان کے معاصرین میں بلند مقام پر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اسلام اور پاکستان کی مساوات کو نہایت معروضیت سے دیکھا اور ان دونوں کی تعبیر اور تعمیر کے بارے میں سوچ بچار کیا اور اپنے نظام فکر کی بنیاد قرآن، حدیث و سنت اور اسلامی فلسفہ پر استوار کی۔ پاکستانیت کو اجاگر کرنے کے حوالے سے اپنا مطمح نظر اپنے نثری سرمائے میں پیش کیا۔ وہ اسلام اور پاکستان سے جڑی ہر بات کو اپنے ایمان کا حصہ جانتے ہیں۔ ان کی نثر میں اسلامی عناصر اور پاکستانی عناصر کو الگ الگ زیر بحث نہیں آئے بلکہ وہ ان دونوں عناصر کو ایک ہی سکے کے دو رخ جانتے ہیں۔ سید عبد اللہ ایک اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان کو دیکھتے ہیں اور اس مملکت خداداد کو مدینہ کی ریاست کے تتبع میں کام کرنے کے لیے تجاویز دیتے ہیں۔

سید عبد اللہ کی نثر میں موجود اسلامی اور پاکستانی عناصر ان کی نثر کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔ ان کا نثری سرمایہ اپنے عہد کے مسائل اور انداز فکر کا نمائندہ ہونے کے ساتھ آنے والے تخلیق کاروں کے لیے رہنما بھی ہے اور نئی نسل کو پاکستان اور اسلام کے باہم رشتے کی تفہیم بھی کراتا ہے اور یہی نثری سرمایہ پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہے۔ سید عبد اللہ کے تصورات اور نظریات نے آنے والی نسل کے محبان وطن، سرفروشان پاکستان، علمبرداران اسلام کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شعرا، ادیبوں، انجنیئروں، ڈاکٹروں، اساتذہ کرام، وکلا، صحافیوں، موسیقاروں، مصوروں، مجسمہ سازوں، صنعتکاروں، دست کاروں اور ہر شعبے کے فن کاروں کے لیے ایک مسلک اور ایک عقیدہ دیا ہے اور وہ یہ کہ اسلام اور پاکستان ایک سکے کے دو رخ ہیں اور اسلام کے بنا پاکستان ایک نامکمل اور ادھوری ریاست اور ناکام ریاست کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سید عبد اللہ کی نثر میں پائے جانے والے یہ اسلامی اور پاکستانی عناصر باہم ایک معنوی اور نامیاتی ترکیب میں ملتے ہیں اور ایک عنصر دوسرے عنصر کے لیے دلیل بنتا ہے لہذا ان دونوں عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھنا کار عبث ہو گا، ہاں البتہ ان عناصر کا تحقیقی اور ناقدانہ مطالعہ، پاکستان اور اسلام کی باہمی قربت اور لزومیت کو ظاہر کرتا ہے اور بہت سے اساسی اور لازمی نظریات اور تصورات کو سامنے لاتا ہے جن کو عموماً آزادی کے بعد پاکستانی قوم نے درخور اعتنا نہیں جانا اور جس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ آج تک ایک حقیقی مفہوم میں قوم نہیں بن پائی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سید عبد اللہ نے اپنے جملہ نظریات اور خاص طور پر اسلامی اور پاکستانی عناصر پر مشتمل نظریات پیش کرتے ہوئے ایسے نثری اسلوب کا انتخاب کیا جو نہایت رواں دواں، سلیس اور قطعی ہے۔ وہ اپنے مذکورہ نظریات میں سے کسی بھی حوالے سے کسی بھی ابہام کا شکار نہیں۔ وہ اپنے نظریات میں نہ صرف خود ایک واضح ذہن رکھتے ہیں بلکہ قاری تک بھی اپنی بات کو انتہائی غیر مبہم اور قطعی انداز میں پہنچانے پر دسترس رکھتے ہیں۔ آنے والا وقت سید عبد اللہ کی ان خدمات عالیہ کو نہ صرف خراج تحسین پیش کرے گا بلکہ انھوں نے اپنی قوم کے ضمیر اور اجتماعی شعور کی ساخت کے لیے جو بے غرض کام کیا ہے وہ ہمیشہ معتبر گا۔ پاکستان کی شناخت اور تشخص کے حوالے سے جب بھی کوئی بات کہیں بھی کی جائے گی سید عبد اللہ کا نام اور کام عزت اور احترام سے یاد رکھا جائے گا۔

تحقیقی نتائج

۱۔ سید عبداللہ ایک اسلام فکر رکھنے والے سماجی مفکر ہیں جن کے نثر میں اسلامی عناصر پائے جاتے ہیں۔

۲۔ سید عبداللہ ایک سچے اور با عمل محب وطن تھے جن کی نثر میں پاکستانی عناصر موجود ہیں۔

۳۔ سید عبداللہ کے ہاں پائے جانے والے اسلامی اور پاکستانی عناصر ایک خاص ترکیب اور نامیاتی صورت میں موجود ہیں، ان دونوں عناصر کی مدد سے پاکستانی تشخص اور مثالی اور فلاحی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

سفارشات / تجاویز

الف۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے سماجی افکار و نظریات پر مختلف پہلوؤں سے تحقیق و تنقیدی کام یونیورسٹی سطح پر کرایا جانا چاہیے۔

ب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نثری سرمائے سے قومی منشور مرتب کیا جاسکتا ہے۔اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ ان کے افکار و نظریات کی تشریح وترویج کے لیے کام کرایا جائے۔

ج۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے مخفی کوہستانی، زبیر ہزاروی، عارف عرفان اوراحمد کبیر کے نام سے مضامین لکھتے تھے،اس حوالے تحقیقی اور تدوینی نوعیت کا کام کرایا جانا چاہیے۔

د۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے اقبالیاتی کام پر حواشی و تعلیقات کا کام ایم فل اور بی ایس کے درجے پر کام کرانا چاہیے۔ہ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے سماجی افکار و نظریات پر مختلف پہلوؤں سے تحقیق و تنقیدی کام یونیورسٹی سطح پر کرایا جانا چاہیے۔

و۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے نثری سرمائے سے قومی منشور مرتب کیا جاسکتا ہے۔اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ ان کے افکار و نظریات کی تشریح وترویج کے لیے کام کرایا جائے۔

ز۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے مخفی کوہستانی، زبیر ہزاروی، عارف عرفان اوراحمد کبیر کے نام سے مضامین لکھتے تھے،اس حوالے تحقیقی اور تدوینی نوعیت کا کام کرایا جانا چاہیے۔

ح۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے اقبالیاتی کام پر حواشی و تعلیقات کا کام ایم فل اور بی ایس کے درجے پر کام کرانا چاہیے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

	کتاب کا نام	ناشر	سال اشاعت
سید عبداللہ	ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۴۶ء
	بحث و نظر	مکتبہ اردو لاہور	۱۹۵۶ء
	نقد میر	آئینہ ادب لاہور	۱۹۵۸ء
	اردو ادب	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۶۷ء
	شعرائے اردو کے تذکرے	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۶۸ء
	مباحث	کتب خانہ نذیریہ لاہور	۱۹۶۸ء
	پاکستان ۔ تعبیر و تعمیر	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۷۷ء
	شیخ اکبر اور اقبال	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۷۹ء
	مطالعہ اقبال کے چند رخ	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۴ء
	ادب و فن	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۸۷ء
	مسائل اقبال	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور	۱۹۸۷ء
	اشارات تنقید	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۳ء
	سر سید احمد خان اور ان کے رفقا	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۲ء
	وجہی سے عبد الحق تک	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۲ء
	ولی سے عبد الحق تک	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۲ء
	اعجاز اقبال	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۴ء

	کلچر کا مسئلہ	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۲ء
	مقامات اقبال	ادارہ علم و ادب لکھنو	س۔ن
	سخنور۔نئے پرانے	اردو اکیڈمی لاہور	۲۰۱۵ء
ممتاز منگلوری، ڈاکٹر	تعلیمی خطبات	مجلس ارادتمندان سید لاہور	۱۹۶۶ء
	ڈاکٹر سید عبد اللہ کی اردو خدمات	مجلس ارادتمندان سید لاہور	۲۰۰۷ء
	طیف اقبال	لاہور اکیڈمی لاہور	۲۰۰۹ء
	طیف غزل	لاہور اکیڈمی لاہور	۲۰۰۹ء

ثانوی ماخذ

	کتاب	ناشر	سال اشاعت
آغا اشرف	اقبال اور پاکستان	نذیر سنز پبلشرز لاہور	۱۹۸۸ء
ابوالاعجاز صدیقی	کشاف تنقیدی اصطلاحات	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۵ء
ابوالاعلیٰ مودودی، سید	تنقیحات	اسلامک پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۸ء
	خلافت وملوکیت	ادارہ ترجمان القران لاہور	۱۹۹۸ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	آج کا اردو ادب	فیروز سنز لمٹیڈ کراچی	۱۹۷۰ء
	ادب ولسانیات	اردو سندھ اکیڈمی	۱۹۸۸ء
	تہذیب و تاریخ	غضنفر اکیڈمی پاکستان	۱۹۹۳ء
ابوالخیر اسدی، علامہ	مقام نبوت کی عجمی تعبیر	دارالتذکیر لاہور	س۔ن
احتشام حسین	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	دارالنور لاہور	۲۰۰۵ء
احمد رضا خان بریلوی	احکام شریعت	احمد رضا بریلوی کتب خانہ کراچی	۲۰۰۹ء
اختر ہاشمی، ڈاکٹر	تخلیقی آنکھ	اظہار اینڈ سنز لاہور	۲۰۱۱ء
ارشاد شاکر اعوان، ڈاکٹر	دو قومی نظریہ	مجلس ترقی اردو لاہور	۱۹۹۳ء
ارم سلیم	اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۱ء
اشفاق محمد خان، ڈاکٹر	مذہب، مسلمان اور سیکولرازم	نگارشات لاہور	۱۹۹۶ء
افتخار احمد صدیقی	عروج اقبال	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۷ء
اعجاز راہی	روداد سیمینار، اصول تحقیق	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۸ء
الطاف حسین حالی	مقدمہ شعر وشاعری	عشرت پبلشنگ ہاوس لاہور	۱۹۷۰ء

امجد علی شاکر، پروفیسر　اردو ادب (تاریخ و تنقید)　عزیز پبلشرز لاہور　۲۰۰۱ء

انعام الحق، ڈاکٹر　نظریہ پاکستان اور قران　نظریہ پاکستان کونسل اسلام آباد　۲۰۱۲ء

انور جمال　ادبی اصطلاحات　نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد　۱۹۹۸ء

انور سدید　اردو ادب کی تحریکیں　انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی　۲۰۰۷ء

بر سبیل تنقید　مقبول اکیڈمی لاہور　۱۹۹۰ء

ایم۔ اے صوفی　قائد کی قیادت　ٹائمز پبلی کیشنز لاہور　۲۰۰۰ء

ایم۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر　اردو میں اصول تحقیق　مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد　۱۹۸۶ء

ایم۔ نذیر احمد تشنہ　فلسفہ اور تصوف　مکتبہ عالیہ لاہور　۲۰۱۳ء

اے۔ وحید، ڈاکٹر　کاروان ادب　فیروز سنز کارپوریشن لاہور　۱۹۷۳ء

بشیر احمد سوز، پروفیسر　مشاہیر ادبیات ہزارہ　ہزارہ چیئر، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ　۲۰۱۱ء

ہزارہ میں اردو زبان و ادب کی تاریخ　مرکز تحقیق واشاعت ایبٹ آباد　۲۰۱۰ء

بشیر احمد ڈار　تاریخ تصوف　ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور　۲۰۱۷ء

بشیر محمود اختر　قومی زبان اخبارات کے آئینے میں　مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد　۱۹۸۶ء

بہادر یار جنگ　منشور پاکستان　بہادر یار جنگ اکادمی کراچی　۱۹۸۰ء

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی　منشورات　سٹی بک پوائنٹ کراچی　۲۰۰۴ء

تحسین فراق، ڈاکٹر　ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ　اورئینٹل کالج لاہور　۲۰۰۵ء

تنویر احمد علوی، ڈاکٹر　اصول تحقیق و ترتیبِ متن　سنگت پبلشرز لاہور　۲۰۱۰ء

جابر علی سید، پروفیسر　اقبال کا فنی ارتقا　بزم اقبال لاہور　۱۹۷۸ء

جاوید اقبال، ڈاکٹر　افکار اقبال　اقبال اکادمی لاہور　۱۹۹۴ء

جعفر احمد، ڈاکٹر　سید سبط حسن۔ ادب اور روشن خیالی　مکتبہ دانیال کراچی　۲۰۱۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر　ادبی تحقیق　مجلس ترقی ادب لاہور　۱۹۹۴ء

	ارسطو سے ایلیٹ	نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد	۱۹۹۳ء
	ایلیٹ کے مضامین	نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد	۱۹۹۰ء
	تاریخ ادب اردو (چار)	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۰۸ء
	پاکستانی کلچر	محمود برادرز پرنٹرز راولپنڈی	۲۰۰۸ء
	قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل	مقتدرہ قومی زبان پاکستان	۱۹۸۹ء
	معاصر ادب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۱ء
	نئی تنقید	رائل بک کمپنی کراچی	۱۹۸۵ء
جیلانی کامران	قومیت کی تشکیل اور اردو زبان	مقتدرہ قومی زبان پاکستان	۱۹۹۶ء
حسنین کاظمی	منزل پاکستان	سعد پبلی کیشنز لاہور	س۔ن
حسین احمد مدنی، سید	پاکستان کیا ہے؟	ترقی اردو بورڈ دہلی	۱۹۶۷ء
حمید احمد خان، پروفیسر	تعلیم و تہذیب	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۰۶ء
خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر	فکرِ اقبال	اقبال اکیڈمی لاہور	۱۹۸۰ء
خلیق انجم	متنی تنقید	سنگت پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۴ء
خورشید احمد، پروفیسر	اسلامی تحریک در پیش چیلنج	انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد	۱۹۹۵ء
	اسلامی نظریہ حیات	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی	۲۰۰۶ء
	ترقیاتی پالیسی کی اسلامی تشکیل	انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد	۱۹۹۶ء
	پاکستان اور اسلامی نظریہ	منشورات لاہور	۲۰۱۰ء
خورشید احمد ندیم	اسلام اور پاکستان	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۱ء
داود رہبر، ڈاکٹر	کلچر کے روحانی عناصر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۴ء
رشید حسن خان	اردو کیسے لکھیں	رابعہ بک ڈپو لاہور	س۔ن
رفیع اللہ شہاب، پروفیسر	جدوجہد قیام پاکستان	مقبول اکیڈمی لاہور	س۔ن
رفیق خاور	اردو تھیسارس	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۹۴ء

روبینہ شاہین	اردو تنقید کا اسلوبیاتی دبستان	اظہار اینڈ سنز لاہور	۲۰۱۲ء
روبینہ شاہین، ڈاکٹر	ڈاکٹر سید عبد اللہ: شخصیت اور فن	اکادمی ادبیات پاکستان	۲۰۰۷ء
ریاست علی ندوی، مولانا	اسلامی نظام تعلیم	الفیصل ناشران لاہور	۲۰۰۳ء
سجاد باقر رضوی	تہذیب و تخلیق	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۷ء
سراج منیر	ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۸۶ء
سعید الرحمان علوی، مولانا	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مکتبہ جمال لاہور	۲۰۰۳ء
سلیم اختر، ڈاکٹر	ادب اور کلچر	مکتبہ عالیہ لاہور	س۔ن
	اقبال شناسی کے زاویے	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۵ء
	تنقیدی اصطلاحات	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۱ء
	میرا من سے میرا جی تک (مقدمات)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۱ء
سنبل نگار، ڈاکٹر	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاوس	۱۹۹۵ء
	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاوس	۱۹۹۵ء
شان الحق حقی	نقد و نگارش	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۵ء
شازیہ آفتاب	اردو میں اصلاح املا کی کوششیں	ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان	۲۰۱۲ء
شبلی نعمان، مولانا	شعر العجم	انجمن حمایت اسلام لاہور	س،ن
شبیر بخاری، سید	میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم	آئینہ ادب لاہور	۱۹۸۶ء
شریف المجاہد	علامہ اقبال	اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور	۱۹۸۶ء
شمیم حنفی	تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۶ء
شورش کاشمیری	فیضان اقبال	مطبوعات چٹان لاہور	۱۹۶۸ء
شوکت علی شاہ، سید	ترتیب و تزئین	الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور	۲۰۰۴ء
صادق زاہد، پروفیسر	تاثرات و تجزیات (مجموعہ مضامین)	الحمد پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۱ء

	ڈاکٹر سید عبداللہ بحیثیت محقق ونقاد	سحر پبلشرز لاہور	س۔ن
	عظیم صوفیائے کرام (فارسی شاعری)	دارالشعور لاہور	۲۰۱۰ء
	مقدمہ قیام پاکستان تاریخ کی عدالت میں	ندا پبلی کیشنز لاہور	۲۰۰۳ء
صفدر حسن صدیقی	پاکستان کی تعمیر نو	نگارشات لاہور	۱۹۹۲ء
صفدر محمود، ڈاکٹر	اقبال، جناح اور پاکستان	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۴ء
	پاکستان میری محبت	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۷ء
ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر	دو پاکستان	ادارہ علم و فن پشاور	س۔ن
عارفہ فرید	پاکستانی کلچر کی روایات	رائل بک کمپنی کراچی	۱۹۹۳ء
عالم دین نقشبندی، قاضی	مکتوبات امام ربانی	دارالاشاعت کراچی	۲۰۰۶ء
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	ادب اور ادبی قدریں	ادارہ ادب و تنقید لاہور	۱۹۸۳ء
	اردو تنقید کا ارتقا	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۱ء
عبدالحمید خان عباسی	اصول تحقیق	نیشنل بک فاونڈیشن پاکستان	۲۰۰۹ء
عبدالرزاق قریشی	مبادیاتِ تحقیق	ادبی پبلشرز ممبئی	۱۹۷۶ء
عبدالرشید، میاں	پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر	ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور	۱۹۸۹ء
عبدالستار خان نیازی، مولانا	پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا	مجاہد ملت فاونڈیشن قصور	۲۰۱۱ء
عبدالکریم خالد	نئے پرانے مضامین	اظہار اینڈ سنز لاہور	۱۹۹۸ء
عبدالماجد دریابادی، مولانا	تاریخ تصوف	بک کارنر جہلم	۲۰۱۶ء
عبدالمجید سالک	ذکر اقبال	اقبال اکادمی لاہور	۱۹۹۳ء
عبدالمغنی، ڈاکٹر	اقبال کا فن	اقبال اکادمی پاکستان لاہور	۱۹۹۰ء
عبدالوحید خان	تاثرات و تصورات	گوشہ ادب لاہور	۱۹۶۰ء
عتیق انور صدیقی	تاریخ و ثقافت و فنون لطیفہ	نیشنل میوزیم دہلی	۱۹۹۳ء
عزیز احمد	برصغیر میں اسلامی جدیدیت	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	س۔ن

	بر صغیر میں اسلامی کلچر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۱۴ء
	تحقیقی اور تنقیدی مقالات	ادارہ تحقیق و ادب لاہور	س۔ن
عطش درانی، ڈاکٹر	اردو تحقیق	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۰۳ء
	اردو جدید تقاضے، نئی جہتیں	مقتدرہ قومی زبان پاکستان	۲۰۰۶ء
	اسلامی تہذیب و ثقافت	شاخ زریں لاہور	۱۹۸۲ء
	اسلامی فکر و ثقافت	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۸۰ء
	اصطلاح مباحث	مقتدرہ قومی زبان	۱۹۹۸ء
	اصول ادبی تحقیق (تکنیکی امور)	نذیر سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور	۲۰۱۱ء
	پاکستان ایک نظریہ ایک تحریک	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۹۶ء
	پاکستانی اردو: مزید مباحث	مقتدرہ قومی زبان پاکستان	۲۰۰۲ء
عنایت بخاری	اتحاد امت اور مضبوط پاکستان	نور فاونڈیشن، ایبٹ آباد	۱۹۹۹ء
غلام علی الانا	زبان و ثقافت	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۱۹۸۷ء
فتح محمد ملک	انداز نظر	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۹ء
	پاکستان کا روشن مستقبل	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۶ء
فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش	فیروز سنز لاہور	۱۹۸۳ء
	ہماری قومی ثقافت	ادارہ یادگار غالب کراچی	۱۹۷۶ء
کامل قریشی، ڈاکٹر	اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	اردو اکادمی دھلی	۱۹۸۷ء
کے۔ ایم۔ اعظم	پاکستان کی اساس اور جدید تقاضے	علم و عرفان پبلشرز لاہور	س۔ن
گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۱ء
	اقبال کا فن	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۰ء
گلشن اقبال	فروغ اردو میں اقبال کی خدمات	فکشن ہاوس کراچی	۲۰۱۲ء

گوپی چند نارنگ	اقبال کا فن	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۰ء
گیان چند، ڈاکٹر	تحقیق کا فن	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۱۲ء
محمد اسحاق، حکیم	نظریہ کسب و انفاق	شرکت پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۸۱ء
محمد اکرام، شیخ	آبِ کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۰۹ء
	پاکستان کا ثقافتی ورثہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۰۱ء
	رود کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۰۹ء
	موج کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۰۹ء
محمد اصغر خان، ایئر مارشل	پاکستان کا مستقبل	فیروز سنز لاہور	۱۹۶۹ء
محمد اقبال، شیخ	اسلامی نظام حیات	علمی کتب خانہ لاہور	۱۹۸۶ء
محمد جاوید قادری، فقیر	تذکرہ مجدد الف ثانی	مشتاق بک کارنر لاہور	۲۰۰۹ء
محمد جعفر شاہ پھلواری، مولانا	اجتہادی مسائل	ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان	۱۹۵۹ء
	اسلام اور موسیقی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۲۰۱۴ء
محمد حسن عسکری	کلیات	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۴ء
محمد حسین آزاد	مقالات محمد حسین آزاد	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۱۰ء
محمد حفظ الرحمان سیوہاری	اسلام کا اقتصادی نظام	مکتبہ رحمانیہ لاہور	س۔ن
محمد خان اشرف	اصطلاحات۔ تدوین متن	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۲۰۱۱ء
محمد شعیب آفریدی	خطبات اقبال	ادارہ فکر جدید	۲۰۱۴ء
محمد صدیق قریشی	کشاف اصطلاحات سیاسیات	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۱۹۸۵ء
محمد طاہر القادری، پروفیسر	اسلامی فلسفہ زندگی	مرکز ادارہ منہاج القران لاہور	۱۹۸۴ء
محمد عبد الحیی، ڈاکٹر	اسوہ رسول اکرم	چوہدری بک ڈپو جہلم	۲۰۰۰ء
محمد عبد اللہ قریشی	تذکار اقبال	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۸ء
محمد فرمان، پروفیسر	اقبال اور تصوف	بزم اقبال لاہور	۱۹۸۵ء
محمد مظفر ملک	اقبال اور ثقافت	قائد اعظم اکادمی کراچی	۱۹۷۵ء

محمد منیر احمد، ڈاکٹر	وفیات اہل قلم	اکادمی ادبیات پاکستان	۲۰۱۰ء
محمد میاں صدیقی	فرہنگ اصطلاحات قرآن	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۰۳ء
	بہترین تریسٹھ سال	نظریہ پاکستان کونسل اسلام آبا	۲۰۱۵ء
مشار درودلوی، ڈاکٹر	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	نامی پریس لکھنو	۱۹۸۶ء
مظفر مہدی ہاشمی	پاکستان کی نظریاتی اساس	کاروان ادب لاہور	۱۹۹۵ء
مفتاح الدین ظفر	تاریخ پاکستان	عزیز پبلشرز لاہور	۱۹۸۲ء
منظور احمد	اقبال شناسی	ادارہ ثقافت اسلامیہ	۲۰۱۳ء
منظور الحق صدیقی، پروفیسر	مولانا مودودی، چند یادیں، چند آثار	البدر پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
ممتاز حسین، پروفیسر	نقد حرف	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۸۵ء
ممتاز علی، سید، مولینٰا	اشاریہ مضامین قرآن	الفیصل ناشران لاہور	۲۰۰۶ء
مولوی میر احمد	تاریخ سرحد	مکتبہ جمال لاہور	۲۰۱۲ء
نصیر احمد ناصر	اسلامی ثقافت	فیروز سنز لاہور	س۔ن
نذیر احمد خان، چوہدری	افکار ملی	فیروز سنز لاہور	۱۹۷۸ء
نذیر نیازی، سید	مکتوبات اقبال	اقبال اکیڈمی لاہور	۱۹۵۶ء
نعیم صدیقی	محسن انسانیت	الفیصل ناشران لاہور	۲۰۱۰ء
نفیس اقبال، ڈاکٹر	تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ	پاکستان رائٹرز کواپریٹو لاہور	۲۰۱۲ء
نیاز احمد سنگھیڑہ، چوہدری	پاکستان میں قوم سازی کا عمل	بک ہوم لاہور	۲۰۰۸ء
واجد رضوی، سید	نظریہ پاکستان	مقبول اکیڈمی لاہور	۲۰۱۲ء
وحید قریشی، ڈاکٹر	اردو نثر کے میلانات	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۸۷ء
وزیر آغا، ڈاکٹر	نئے مکالمات، مرتبین، شاہد شیدائی، عابد خورشید جمہور پبلی کیشن لاہور		۲۰۱۰ء
	کلچر کے خدوخال	مجلس ترقی ادب لاہور	۲۰۰۹ء
وحید عشرت	پاکستانی ثقافت کی تشکیل	پاکستان فلسفہ اکادمی لاہور	۱۹۷۶ء
وقار احمد رضوی، سید ڈاکٹر	تاریخِ نقد	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	۲۰۰۴ء

ہارون الرشید، ڈاکٹر	اقبال کے گوہر شہوار	مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور	۲۰۱۳ء
یحییٰ امجد، ڈاکٹر	فن اور فیصلے	کتابیات حمید لاہور	۱۹۹۶ء
	تاریخ پاکستان	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۸۹ء
یاسر جواد	ثقافت اور سامراج	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	۲۰۰۹ء
یعقوب شاہ، سید	چند معاشی مسائل اور اسلام	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۶۷ء
یٰسین مظہر صدیقی	عہد نبوی کا نظام حکومت	الفیصل ناشران لاہور	۲۰۰۹ء
یوسف سلیم چشتی	شرح زبور عجم	عشرت پبلشنگ ہاوس لاہور	۱۹۳۵ء

رسائل

ادب و ثقافت، ششماہی، مرکز برائے اردو زبان ادب و ثقافت حیدر آباد، ستمبر ۲۰۱۳ء

اخبار اردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۸ء

اخبار اردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، مئی ۲۰۰۹ء

اوریئنٹل کالج میگزین، سید عبد اللہ نمبر، ۱۹۸۷ء

شعر و سخن، سہ ماہی، مانسہرہ، ستمبر ۲۰۱۸ء

فنون، سہ ماہی، لاہور، اپریل تا جون ۱۹۸۹ء

قومی زبان، ماہنامہ، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۹ء

لغات

وارث سرہندی	علمی اُردو لغت	علمی کتاب خانہ لاہور	۱۹۹۰ء
مولوی سید احمد دہلوی	فرہنگِ آصفیہ	ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۹۰ء
مولوی نور الحسن نیر	نور اللغات	نیشنل بک فاونڈیشن راولپنڈی	۱۹۸۹ء

غیر مطبوعہ مقالات

تسنیم اختر	سید عبداللہ احوال و آثار پی۔ایچ۔ڈی	مملوکہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور	۱۹۹۵ء
زاہدہ صادق	سید عبداللہ بحیثیت محقق و نقاد	مملوکہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد	۱۹۹۵ء
فاخرہ ظہور	ہزارہ کی ادبی تنظیمیں	مملوکہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد	۱۹۹۵ء

مصاحبے

احسان الحق،ڈاکٹر،رہائش گاہ غازی کوٹ،مانسہرہ،بتاریخ ۷ اکتوبر،۲۰۱۷ء

ارشاد شاکر اعوان،ڈاکٹر،بفہ مانسہرہ،بتاریخ ۲۲ دسمبر ۲۰۱۷ء

افضل حق قرشی،مدیر،بذریعہ فون،مدیر صحیفہ، مجلس ترقی ادب لاہور،،بتاریخ ۲۷ جولائی ۲۰۱۷ء

سعید عبداللہ، مفتی،رہائش گاہ،ڈب نمبر ۱ مانسہرہ،۷،جولائی ۲۰۱۸ء

عطیہ سید،انٹرویو،بذریعہ فون،لاہور،۲۱ فروری ۲۰۱۷ء

قاضی سلطان،ڈاکٹر،شعبہ پاک سٹڈیز،ایبٹ آباد یونیورسٹی ایبٹ آباد،۲۳ دسمبر،۲۰۱۷ء

قاضی عتیق الرحمان،انٹرویو،پرنسپل،سر سید ماڈل پبلک سکول ہری پور،بتاریخ ۵ مئی ۲۰۱۷ء

English Books

Chaudhry Nazir Ahmed Khan,Thoughts on Pakistan and Panism, Feroz sons Lahore, 1987

Keith Clard ،Pakistan: Apolitical Study London Press ،1968

Mathew Arnold, Culture and anarchy,Cambridge Univesity press London 1984

Owen Bennet Jones, Pakistan (Eyes of Storm),welfare University press London,1999

Oxford Dictionary of Political Terms, Oxford Press London 2001.

Saeed ud Din Ahmed Dar,Idealogy of Pakistan, National Institute Of Historical and

Culture Research centre of excellence ,Quaid e Azam Univesity Islam Abad 2000

Sultan Mahmood,Democracy,Islam and Pakistan, Asian Journal Of social sciences

and Humanities,Volume 5(2) May 2016